تصوف اور اہل تصوف

مولانا سید احمد عروج قادری

[illegible]

مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی

تصوف اور اہلِ تصوف

مولانا سید احمد عروج قادریؒ

مرتب

ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی

مرکزی مکتبہ اسلامی - دہلی ۶

مطبوعات اشاعتِ اسلام ٹرسٹ نمبر ۹۳۶

نام کتاب: تصوّف اور اہل تصوف
مصنف: مولانا سید احمد عروج قادریؒ
مرتب: ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی
ناشر: مرکزی مکتبہ اسلامی ۳۵۲۳، چتلی قبر دہلی ۶
صفحات: ۳۷۶
اشاعت:

طبع اول :- ۱۹۹۰ء ۱۰۰۰
طبع دوم :- ستمبر ۱۹۹۴ء ۱۰۰۰

قیمت : ۴۵/- روپے

مطبوعہ: دعوت آفسٹ پرنٹرز، دہلی

فہرست مضامین

باب سوم: مکاتیب صوفیاء ۱۲۵

باب چہارم : غیر اسلامی تصوف ۱۸۱

باب پنجم : تصوف کی کتابوں پر تنقید وتبصرہ ۲۷۹

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تعارف

ادارۂ تحقیق وتصنیف اسلامی علی گڑھ کے تحت مولانا سید احمد عروج قادری رحمہ اللہ کے مضامین کی ترتیب کا جو کام جاری تھا، خدا کا شکر ہے وہ بڑی حد تک مکمل ہو چکا ہے۔ یہ کام ہمارے نوجوان دوست ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی نے انجام دیا ہے۔ مولانا مرحوم کے فتاویٰ کی پہلی جلد ماہنامہ زندگی نو کے خاص نمبر کے طور پر شائع ہوئی تھی۔ دوسری جلد کی اشاعت کی کوشش ہو رہی ہے۔

اس وقت تصوف سے متعلق مولانا مرحوم کے مضامین کا مجموعہ پیش نظر ہے۔ مولانا کا تعلق صوفیاء کے ایک خانوادہ سے تھا اور وہ خاندان ہی کے ایک بزرگ سے بیعت بھی تھے اس لئے وہ اس کوچہ کے نشیب وفراز سے اچھی طرح واقف تھے۔ تصوف پر مولانا مرحوم کی دو کتابیں ان کی حیات ہی میں شائع ہو چکی تھیں۔ ان میں 'اسلامی تصوف' کو بڑی مقبولیت حاصل ہوئی اور اس کے متعدد اڈیشن اب تک نکل چکے ہیں۔ دوسری کتاب کا عنوان ہے 'تصوف کی تین اہم کتابیں' اس میں حضرت سید علی ہجویریؒ کی کشف المحجوب، حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے ملفوظات کے مجموعہ فوائد الفواد اور حضرت مجدد الف ثانی کے شہرۂ آفاق مکتوبات یعنی مکتوبات ربانی کا تعارف اور ان پر نقد وتبصرہ ہے۔ ان دونوں کتابوں کے مطالعہ سے معلوم

ہوتا ہے کہ وہ تصوف کے غالی عقیدت مندوں میں تھے اور نہ اس کے خلاف ان کے اندر کوئی تعصب پایا جاتا تھا۔ انہوں نے آنکھ بند کر کے نہ تو اس کی حمایت کی ہے اور نہ مخالفت۔ ان کی کوشش تھی کہ تصوف کو کتاب و سنت کی روشنی میں پرکھا جائے اور اس کا جو حصہ صحیح ہے اسے صحیح کہا جائے اور جو حصہ غلط ہے اسے غلط کہا جائے۔ وہ اسلامی اور غیر اسلامی تصوف کے فرق کو اچھی طرح سمجھتے تھے۔

ان دو کتابوں کے علاوہ بھی مولانا مرحوم نے تصوف سے متعلق مختلف اوقات میں مختلف مناسبتوں سے بہت کچھ لکھا ہے۔ یہ تحریریں ماہنامہ زندگی اور بعض دوسرے رسائل میں شائع ہوتی رہی ہیں۔ مولانا نے اپنے ایک مقالہ میں اولیاء اللہ کا تفصیلی تعارف کرایا ہے۔ ان کے بارے میں پائے جانے والے غلط تصورات کی تردید کی ہے۔ چند اکابر صوفیاء کے حالات بھی انہوں نے لکھے ہیں۔ صوفیاء کرام کے مکاتیب سے بھی انہیں دلچسپی رہی ہے چنانچہ بعض نامور صوفیاء کے مکاتیب کو انہوں نے اپنے مطالعہ کا موضوع بنایا ہے اور ان سے بہت سی مفید باتیں نکالی ہیں۔ ایک طویل مقالہ میں غیر اسلامی تصوف پر بحث ہے۔ بعض اوقات لوگوں نے اپنے مزعومہ خیالات کی تائید میں تصوف اور صوفیاء کو پیش کیا ہے۔ مولانا نے اپنی تحریروں میں اس کا بھی جائزہ لیا ہے۔ موجودہ دور میں تصوف سے متعلق لکھی جانے والی کتابوں پر نقد و تبصرہ بھی وہ مسلسل کرتے رہے ہیں۔ ان کے ہاں اس موضوع پر اور بھی مواد ملتا ہے۔

برادرم ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی نے ان سب تحریروں کو اس طرح مرتب کیا ہے کہ وہ ایک مربوط کتاب کی شکل اختیار کر گئی ہیں۔ ان میں سے دو ایک تحریریں کتابچوں کی شکل میں الگ سے شائع ہو چکی ہیں۔ اس مجموعہ کو جامع اور مکمل بنانے کے لئے انہیں بھی اس مجموعہ میں شامل کر لیا گیا ہے۔ اس کی ترتیب میں اس عاجز کے مشورے شامل رہے ہیں۔

جو حضرات تعصب اور تحزب سے بلند ہو کر تصوف کے حسن و قبح اور اس کے مضبوط اور کمزور پہلوؤں کو جاننا چاہیں گے، انشاء اللہ وہ اس مجموعہ کو بہت مفید پائیں گے۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے حسن قبول کی دولت سے سرفراز فرمائے۔

مرحوم کو اس کے اجر و ثواب سے نوازے، مرتب کے علم و عمل میں برکت دے اور اس ناکارہ کی تھوڑی سی محنت کا زیادہ سے زیادہ صلہ عطا فرمائے اور اس کی کوتاہیوں سے درگزر فرمائے۔

جلال الدین

۱۶ر اگست سنہ ۱۹۹۰ء

باب اوّل

تصوّف — ایک مطالعہ

صحبت و بیعت

صحبت و بیعت

صحبت کی اثر انگیزی سے کون انکار کر سکتا ہے؟ یہ ایک حقیقت ہے کہ :-

صحبتِ صالح ترا صالح کند صحبتِ طالح ترا طالح کند

اگر کسی کو اللہ کے صالح بندوں کی صحبت نصیب ہو جائے تو یہ اس کی بڑی سعادت ہے۔ صحبت انسان پر غیر محسوس طریقے سے اثر کرتی رہتی ہے اور کچھ دنوں کے بعد جب وہ اپنا جائزہ لیتا ہے تو محسوس کرتا ہے کہ اس کے خیالات و تصورات اور اس کے اعمال و افعال میں تبدیلیاں پیدا ہو گئی ہیں۔ اگر صحبت صالح ہو تو یہ تبدیلیاں بھی اچھی ہوتی ہیں، اور اگر صحبت بُری ہو تو تبدیلیاں بھی بری ہوتی ہیں۔ یہ ایک ایسا مجرب اور مشاہد مسئلہ ہے کہ اس سے کسی عاقل کو انکار نہیں۔ استاد اپنے شاگرد کو تعلیم دیتا ہے، جو وہ نہیں جانتا تھا اسے بتاتا ہے اور ایک طویل مدت تک استاد اور شاگرد ایک دوسرے سے ملتے رہتے ہیں۔ کیا شاگرد پر استاد کی صرف تعلیم اثر انداز ہوتی ہے؟ نہیں، بلکہ اس کی نشست و برخواست، اس کی گفتگو کا طریقہ، اس کا لباس، اس کی حرکات و سکنات، اس کے رہنے سہنے کا ڈھنگ، اس کے اعمال و افعال اور اس کے عادات و اخلاق، یہ ساری چیزیں اس پر اثر انداز ہوتی ہیں اور یہ کہنا صحیح ہے کہ تعلیم سے زیادہ اثر انداز ہوتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ صالحین کی صحبت اختیار کرنے اور اشرار کی صحبت ترک کرنے کی تاکیدی ہدایتیں کتاب و سنت میں موجود ہیں، اور یہی وجہ ہے کہ بزرگوں نے بھی اس پر بہت زور دیا ہے۔ صحابہؓ و تابعین کے عہد میں ایک شخص کسی استاد یا چند اساتذہ کی صحبت و خدمت میں رہ کر اپنے ظاہر اور اپنے باطن دونوں ہی

کو سنوار لیتا تھا۔ ایک طرف اسے کتاب و سنت کا علم حاصل ہوتا اور دوسری طرف وہ احسان و یقین کے بلند سے بلند درجے تک پہنچ جاتا۔ اسے اپنے باطن کو سنوارنے اور درجۂ احسان حاصل کرنے کے لیے کسی خاص استاد و شیخ کے پاس جانے کی ضرورت نہ پڑتی، جو صرف اس کام کے لیے مخصوص ہو۔ لیکن آگے بڑھ کر جب حبِّ جاہ و دنیا داری اساتذۂ کتاب و سنت کے اندر بھی گھس آئی اور کتاب و سنت کا وہ حصہ جس سے انسان درجۂ احسان حاصل کرتا تھا صرف زبانی اور کتابی رہ گیا تو کچھ لوگوں نے اس کی طرف خاص توجہ کی اور ان اساتذہ سے ممتاز ہو گئے، جن کے سینے اس دولت سے خالی تھے۔ اب کتاب و سنت کا یہی حصہ تصوف کے نام سے موسوم ہوا اور اس کے اساتذہ صوفیہ کے لقب سے ملقب ہوئے۔

پھر جب زمانہ اور آگے بڑھا تو احسان و یقین کی راہ، طریقت کہی جانے لگی اور اب شریعت و طریقت دو متوازی خطوط پر ساتھ ساتھ چلنے لگیں۔ جو شخص درجۂ احسان حاصل کرنا چاہتا وہ صوفیہ کی خدمت میں حاضر ہوتا اور اس کے لیے ان کی صحبت ضروری قرار پاتی۔ صوفیہ علیہ کے طبقۂ اولیٰ کی جو تاریخ ہمارے سامنے ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ اس وقت تک بس یہی طریقہ جاری تھا کہ ایک انسان جب ادھر توجہ کرتا تو کسی ایک یا چند شیوخ کی خدمتوں میں حاضری دیتا اور ان کی صحبتوں میں حاضر رہ کر اسے حاصل کرتا۔ یہی وجہ ہے کہ طبقۂ اولیٰ کے کتنے ہی شیوخ ایسے ہیں جن کے متعلق متعین طور سے نہیں کہا جا سکتا کہ انھوں نے کس کی صحبت سے فائدہ اٹھایا تھا اور نہ متعین طور پر انھیں کسی خاص شیخ کی طرف منسوب کیا جاتا ہے۔ طبقۂ ثانیہ میں ہم یہ دیکھتے ہیں کہ بعض شیوخ کا بعض شیوخ کی طرف انتساب ہو رہا ہے۔ صحبت کے سلسلے میں یہ چند اجمالی اشارے تھے۔ بیعت طریقت کا سلسلہ کب سے جاری ہوا، متعین طور پر کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ ہم دور تک اس کا وجود نہیں پاتے ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے متعدد صحابہؓ سے چند مواقع پر جو بیعتیں لی تھیں وہ اس بحث سے غیر متعلق ہیں۔ اصطلاحِ تصوف کی بیعتِ طریقت سے ان کا کوئی واسطہ نہیں ہے۔

اس تفصیل سے یہ معلوم ہوا کہ علماء و فقہا اور صوفیہ و مشائخ کی تقسیم اس لیے پیدا

ہوئی تھی کہ عام طور سے لوگوں نے شریعت کے علم کو ذریعہ معاش بنالیا تھا اور تعلیم سے ان کی غرض یہ ہوتی تھی کہ حکومت کے کسی محکمے میں جگہ پالیں۔ فقہ کو عام طور سے لوگوں نے وہ حیثیت دے دی تھی جو آج لا کی ہے۔ اس وقت کا مدرسۂ فقہ آج کا لا کالج بن گیا تھا لیکن اس وقت بھی جب یہ سب کچھ ہو رہا تھا ایسے فقہا موجود تھے جن کے دل حب جاہ اور دنیا داری سے پاک تھے۔ وہ صحیح معنی میں علمائے حق تھے، ان کے مدرسہ کا طالب العلم اس کا محتاج نہ تھا کہ درجۂ احسان حاصل کرنے کے لیے کسی دوسری طرف جائے یا اس کے لیے کوئی علیحدہ مخصوص تعلیم حاصل کرے۔ عہد تابعین کی طرح وہ اسی ایک مدرسہ اور کتاب و سنت کی اسی ایک تعلیم سے اپنا ظاہر و باطن دونوں سنوار کر نکلتا تھا۔ تصوف اس کے لیے کوئی علیحدہ فن نہ تھا، جسے الگ سے حاصل کرنے کی سعی کرتا۔ طریقت اس کے لیے کوئی الگ راہ نہ تھی جس پر چلنے کے لیے اسے نئے زاد راہ اور کسی نئے راہ نما کی ضرورت پڑتی۔ کتاب و سنت میں تدبر و تفکر، خلوص نیت اور استاذ کی رہنمائی اس کے لیے کافی تھی۔ اس لیے اصل سوال یہی ہے کہ کیا ایک انسان کے لیے بہر حال یہ ضروری ہے کہ وہ طریقت کا علم حاصل کرنے اور درجۂ احسان پر فائز ہونے کی خاطر کسی صوفی شیخ کی خدمت میں حاضر ہو اور اس سے بیعت طریقت کر کے اسے حاصل کرے؟ تاریخ اسلامی اور عقل انسانی دونوں ہی کا جواب نفی میں ہے۔ اس کا لزوم و وجوب کسی دلیل سے ثابت نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ جب صوفیہ کے گروہ میں بھی وہی خرابیاں نمودار ہوئیں جن کو مٹانے کے لیے یہ الگ گروہ بنا تھا تو خود صوفیہ کے نزدیک مشائخ وقت کی خدمت و صحبت میں حاضری کی قید باقی نہ رہی اور اس اصل کی طرف لوٹنے کا مشورہ دیا جانے لگا، جو سب کے نزدیک مسلم ہے یعنی طریق صحابہ و تابعین رضوان اللہ علیہم اجمعین۔ علامہ شعرانیؒ نے اپنی کتاب "الانوار القدسیہ فی بیان آداب العبودیۃ" میں طریقۂ عبودیت کی تشریح کی ہے۔ اس کتاب کے مقدمہ میں لکھتے ہیں:

وھذہ طریقۃ الصحابۃ والتابعین	یہ (عبودیت) صحابہ و تابعین کا طریقہ ہے
وھی طریقۃ سھلۃ نافعۃ لعامۃ	اور یہ طریقہ آسان اور تمام مسلمانوں کے لیے مفید و

المسلمین .... واعلم ان ھذہ الطریقۃ لا یحتاج سالکھا الی مراجعۃ شیخ فی الغالب۔ ص۱۵ مطبوعہ مصر۔

نفع بخش ہے اور جان لو کہ اس طریقہ کا سالک اکثر حالات میں کسی شیخ کی طرف رجوع کرنے کا محتاج نہیں ہے۔

صحابہ و تابعین کا طریقہ عبودیت وہی ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ تھا۔ ابن قیم اس کی تشریح کرتے ہوئے ایک جگہ لکھتے ہیں۔

وتمام العبودیۃ ان یوافق الرسول صلی اللہ علیہ وسلم فی مقصودہ وقصدہ وطریقہ فمقصودہ اللہ وحدہ وقصدہ تنفیذ اوامرہ فی نفسہ وفی خلقہ وطریقہ اتباع ما اوحی الیہ فصحبہ الصحابۃ رضی اللہ عنہم علی ذلک حتی لحقوا بہ ثم جاء التابعون باحسان فمضوا علی اثارھم ثم تفرقت الطرق بالناس فخیار الناس من وافقہ فی المقصود و الطریق (مدارج السالکین۔ ص۱۳۰ ج ۳)

اور کمال عبودیت یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی موافقت کرے آپ کے مقصود میں بھی، قصد میں بھی اور طریقہ میں بھی۔ آپ کا مقصود حضرت اللہ تھا اور آپ کا قصد اللہ کے احکام کو اپنے اوپر اور اس کی مخلوق پر نافذ کرنا تھا اور آپ کا طریقہ وحیِ الٰہی کا اتباع تھا۔ آپ کے صحابہ نے اسی چیز میں آپ کا ساتھ دیا، یہاں تک کہ وہ آپ سے جا ملے پھر ان صحابہ کے تابعین آئے اور صحابہ ہی کے نقشِ قدم پر چل کر گزر گئے، اس کے بعد لوگوں نے الگ الگ راستے اختیار کر لیے۔ تو اب بہترین گروہ وہ ہوگا جو مقصود اور طریقہ دونوں ہی میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی موافقت کرے۔

ابن قیمؒ نے اس مختصر عبارت میں اسلامی تصوف کی پوری حقیقت بیان کر دی ہے۔ ہمیں اس دنیا میں اب رسول خدا اور صحابہ و تابعین کی جسمانی صحبت تو نصیب نہیں ہو سکتی لیکن ان کی روحانی صحبت ضرور نصیب ہو سکتی ہے اور ان کی روحانی صحبت ہی ہماری اصل پونجی ہے۔ امام شعرانیؒ نے لواقح الانوار کے مقدمہ میں لکھا ہے:

"اے برادر تمھیں معلوم ہو کہ جس شخص نے اس کتاب کا اعتقاد کے ساتھ مطالعہ کیا یا اس میں لکھی ہوئی باتوں کو سنا تو گویا وہ ان تمام اولیاء سے ملا جن

کا ذکر اس میں ہے اور یہ اس لیے کہ کسی شیخ کا بُعدِ جسمانی اس محبت و صحبت میں خرابی نہیں پیدا کرتا۔ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، صحابہ، تابعین اور ائمہ، مجتہدین سے محبت کرتے ہیں حالانکہ نہ ہم نے انھیں دیکھا اور نہ ہم ان کے زمانے میں تھے پھر ہم نے ان کے افعال سے نفع حاصل کیا اور اس کا اتباع کیا (اس پر کسی دلیل کی ضرورت نہیں) یہ امر مشاہد ہے اور یہ اس لیے کہ معتقدات کی صورت جب ظاہر اور حاصل ہو جاتی ہے تو اشخاص کی صورتوں کے مشاہدے کی احتیاج نہیں رہتی۔"

سیرتِ رسولؐ ہی ہمارے پاس وہ قدِ آدم آئینہ ہے کہ جب ہم اس کے سامنے کھڑے ہو جاتے ہیں تو سر سے پاؤں تک ہمارا ظاہر و باطن ہماری نگاہوں کے سامنے آجاتا ہے۔ یہ آئینہ ہمارے تمام حسن و قبح، خلوص و نفاق، خوبی و عیب اور نیکی و بدی کو ایسی سچائی کے ساتھ ہمارے سامنے رکھ دیتا ہے کہ اس میں کوئی شبہ باقی نہیں رہتا اور پھر یہ آئینہ صرف ہمارا ایکسرے ہی نہیں کرتا بلکہ بیماریوں کے علاج اور شفائے امراض کے نسخے بھی عطا کرتا ہے۔ اللہ نے اپنے آخری رسولؐ کی پاک زندگی کو قیامت تک کے لیے اسوۂ حسنہ بنایا ہے۔ اب ہر زندہ اور گزر جانے والی شخصیت کو جانچنے کا یہی معیار ہے۔ اور بڑے سے بڑے شیخِ وقت کی صالحیت کو پرکھنے کی یہی کسوٹی ہے۔ کچھ لوگ بڑی معصومیت سے فرماتے ہیں کہ حدیث کی کتابوں اور سیرتِ رسولؐ کے ذخیروں میں تو صرف حروف و نقوش ہیں، اس لیے جب تک کسی زندہ شخصیت کی صحبت اختیار نہ کی جائے درجۂ احسان حاصل نہیں ہو سکتا۔ عرض ہے کہ اس زندہ شخصیت کو جانچنے کے لیے آپ کے پاس معیار کیا ہے؟ ان حروف و نقوش کے سوا آپ کے پاس اور کچھ بھی ہے جس سے جانچ کر آپ یہ فیصلہ کر سکیں کہ واقعی وہ شخصیت متبعِ سنت ہے یا نہیں؟ تو پھر کے معاملہ تو انہی حروف و نقوش تک آکر ختم ہوتا ہے جو حدیث کی کتابوں، قرآن کی آیتوں اور سیرتِ رسولؐ کے ذخیروں میں ثبت ہیں۔ صحبت کی اثر انگیزیوں سے انکار نہیں لیکن وصول الی اللہ کے لیے کسی شیخِ وقت کی صحبت و بیعت کا لزوم و وجوب محلِ نظر ہے۔ خلوص

اور ایمان داری کے ساتھ کتاب و سنت اور سیرتِ صحابہؓ کی صحبت ہی ہر خرابی سے پاک اور اصل شے ہے۔ اسی حقیقت کو اپنے وقت کے مسلمہ شیخ ابوبکر طمستانیؒ متوفی ۳۴۰ھ نے ان الفاظ میں ادا فرمایا ہے:

الطریق واضح والکتاب والسنۃ قائم بین اظہرنا وفضل الصحابۃ معلوم بسبقھم الی الہجرۃ ولصحبتھم فمن صحب منا الکتاب والسنۃ وتغرب عن نفسہ والخلق وھاجر بقلبہ الی اللہ فھو الصادق المصیب۔ (رسالہ قشیریہ)	راستہ واضح ہے اور کتاب و سنت ہمارے درمیان قائم ہیں اور صحابہ کی فضیلت معلوم ہے، ہجرت اور صحبتِ رسولؐ کی وجہ سے، تو اب ہم میں جو شخص کتاب و سنت کے ساتھ صحبت اختیار کرے اپنے نفس اور مخلوق کو خوش کرنے سے الگ ہو جائے اور خلوصِ دل سے اللہ کی طرف ہجرت کرے تو وہی سچا ہے اور صحیح راستے پر پہنچا ہوا ہے۔

اسی حقیقت کی طرف دیارِ عرب کے شیخ کبیر احمد بن ابراہیم الواسطیؒ دعوت دیتے تھے ان کے متعلق شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ نے لکھا ہے کہ وہ دیارِ عرب کے مشائخ کبار میں تھے اور اپنے زمانے کے مقتدا اور طریق اتباعِ سنت کی ترویج میں اپنے وقت کے بے نظیر شخص تھے۔ محدث دہلوی نے اپنے مکاتیب میں ان کے ایک رسالہ "الفقر المحمدی" کا ترجمہ درج کیا ہے، اپنے اس رسالہ میں حضرت واسطی نے بڑی قوت کے ساتھ تحریر فرمایا ہے:

"اگر سچی درویشی اور اصلی فقیری کی طلب ہے جس کی جڑ مضبوط اور شاخیں بلند ہوں تو لازم ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی فقیری اور درویشی کو اختیار کرو اور انھیں کی پیروی کرو کہ صاف اور پاکیزہ پانی وہیں ملتا ہے جہاں سے چشمہ پھوٹتا ہے اور بعد کو آنے والوں کی درویشی کو اختیار نہ کرو کہ پانی سرچشمہ سے دور جاکر گدلا ہو جاتا ہے اور اس کا اصلی رنگ باقی نہیں رہتا۔ اس طریق محمدیؐ پر اگر قائم رہے تو امید ہے کہ اگلوں سے جا ملوگے جو پیغمبر خداؐ کے اصحاب میں سے تھے اور قیامت کے روز پیغمبرؐ اور یارانِ پیغمبرؐ

کے ساتھ تمھارا حشر ہوگا۔ یہ وہ وقت ہوگا کہ دوسرے اپنے اپنے شیوخ اور مرشدوں کے جھنڈوں کے نیچے ہوں گے، لیکن تمھارے اوپر اس وقت تمھارے شیخ یعنی حضور رسول خداؐ کے جھنڈے کا سایہ ہوگا۔"

اس وقت کے لوگوں نے شیخ واسطیؒ کے بارے میں کیا کہا ہوگا، یہ تو معلوم نہیں، لیکن ٹھیک یہی بات کہنے والوں اور اسی پر عمل کرنے والوں کو آج مخالف تصوف اور "بے روح" سمجھا اور کہا جا رہا ہے۔

ان تفصیلات سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ درجۂ احسان کے حصول کے لیے کسی شیخِ وقت کی مروجہ بیعت و صحبت خود صوفیہ کے ایک گروہ کے نزدیک بھی ضروری نہیں ہے اور یہ درجۂ احسان کتاب وسنت میں تدبّر و تفکّر اور ان کے مندرجات پر خلوص کے ساتھ عمل کرکے حاصل کرسکتا ہے اور یہ صرف احتمال ہی نہیں ہے بلکہ سینکڑوں علماء، فقہاء، محدثین اور ائمۂ دین اپنے اپنے وقت میں احسان کے اعلیٰ درجہ پر فائز ہوئے، حالانکہ انھوں نے نہ کسی شیخ طریقت کی اصطلاحی صحبت اختیار کی تھی اور نہ کسی سے بیعت کا شرف حاصل کیا تھا۔

اپریل۔ مئی ۱۹۵۶ء

تقلید

عہد صحابہؓ و تابعینؒ میں امام واحد کی تقلید شخصی کا وجود نہ تھا۔ بعد کو لوگوں نے سہولتِ کار اور دیگر مصالح کے پیشِ نظر کسی ایک کی تقلید شروع کی، جیسا کہ شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ نے شرح سفر السعادۃ کے مقدمہ میں تحریر فرمایا ہے۔ پھر ائمہ اربعہ کے فقہ و اجتہاد کو قبولیت عام کا درجہ حاصل ہوا اور ان کے علاوہ دوسرے ائمہ و مجتہدین کے مذاہب فقہ کی کتابوں میں رہ گئے۔ ان کے مقلدین کی جماعتیں باقی نہ رہیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ متاخرین نے تقلید کو ائمہ اربعہ کے درمیان میں محصور کر دیا اور اب کسی کو اجازت نہ رہی کہ ان چار اماموں کے علاوہ کسی پانچویں امام کی تقلید کرے لیکن ابتدائے عہد میں تقلیدِ شخصی کے باوجود اس میں تعصب کا دروازہ نہ کھلا تھا اور نہ ائمہ اربعہ کے مقلدین کے درمیان عناد اور مخاصمت پیدا ہوئی تھی لیکن جیسے جیسے زمانہ گزرتا گیا تقلید میں جمود اور تعصب بھی بڑھتا گیا۔ ہم یہاں صرف یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ صوفیۂ کرام نے اس سلسلے میں کیا لکھا ہے اور کیا تعلیم دی ہے۔ قشیری علیہ الرحمہ اپنے رسالہ میں لکھتے ہیں:

> "اور جب مرید اپنے اور اللہ کے درمیان عہد مضبوط کرے تو ضروری ہے کہ شریعت کا اتنا علم حاصل کرے جس سے اپنا فرض ادا کر سکے۔ اب یہ تحصیل علم یا تو تحقیق سے ہو یا ائمہ سے سوال کر کے، اور اگر کسی مسئلے میں فقہاء کے فتاوے مختلف ملیں تو وہ فتویٰ اختیار کرے جس میں احتیاط کا پہلو زیادہ ہو۔"

یہ تعلیم ٹھیک اس نقشے کے مطابق ہے جو صحابہؓ و تابعینؒ کے عہد میں تھا۔ اس وقت عامۃ المسلمین تقلید و عدم تقلید کے لحاظ سے ٹولیوں اور گروہوں میں تقسیم نہیں ہوئے تھے۔ امام عبدالوہاب شعرانی رحمۃ اللہ علیہ نے مذاہب مجتہدین کی مساوات ثابت کرتے ہوئے لکھا ہے:

لا ینبغی لاحدان یامرنا　　　کسی شخص کو یہ زیب نہیں دیتا کہ ہمیں

بالتقیید بقول مجتهد من
المجتهدین لانفکاکنا عن التقلید
بغیر رسول الله صلی الله علیه وسلم
لانه ما من امر او قول فی الشریعة
الا نشهد استمداده من بحر الشریعة
والبحر من ای الجوانب اتیته واحد
فمن امرنا بالتقیید فقد ظلمنا۔
(ارشاد الطالبین)

ائمہ مجتہدین میں سے کسی مجتہد کے قول کے ساتھ
مقید ہو جانے کا حکم دے۔ اس لیے کہ ہم
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا کسی کی
تقلید نہیں کرتے، کیوں کہ شرع سے متعلق
ہر امر یا قول بحر شریعت ہی سے سیراب ہے
اور سمندر کے پاس تم جدھر سے بھی آؤ وہ
ایک ہی ہے۔ اس سے جو شخص ہمیں ایک کے
ساتھ مقید کرتا ہے وہ ہم پر ظلم کرتا ہے۔

علامہ شعرانیؒ نے اسی بات کو اپنی متعدد کتابوں میں لکھا ہے۔ وہ اس بات کو جائز نہیں سمجھتے تھے کہ کسی کو ایک امام کی تقلید کرنے پر مجبور کیا جائے اور تقلید شخصی کو واجب قرار دیا جائے۔ اپنی اسی کتاب ارشاد الطالبین میں ایک جگہ اور لکھتے ہیں:

ولم یوجب الله تعالٰی
علی احد التزام مذهب من
مذاهب المجتهدین بخصوصه
لعدم عصمته من این جاءنا
الوجوب والائمة کلهم تبرؤا من
الامر باتباعهم وقالوا اذا بلغکم
حدیث فاعملوا به واضربوا
بکلامنا الحائط رضی الله عنهم
اجمعین تامل ذلك فانه نفیس۔
(صفحہ ٣٦)

اللہ تعالیٰ نے کسی شخص پر خصوصیت کے
ساتھ کسی ایک ہی مجتہد کے مذہبِ فقہ کے التزام کو
واجب نہیں قرار دیا ہے کیونکہ وہ معصوم نہیں
یہ تقلید کا وجوب آیا کہاں سے؟ حالانکہ تمام
ائمہ نے اپنے اتباع کا حکم دینے سے برأت
کی ہے اور انھوں نے کہا ہے کہ جب تمھارے
پاس حدیث پہنچ جائے تو اس پر عمل کرو۔
اور ہمارے کلام کو دیوار پر مار دو۔ اللہ تعالیٰ
ان سے راضی ہو۔ اس بات پر غور کرو، کیونکہ
یہ بڑی عمدہ بات ہے۔

کوئی بڑا سے بڑا غیر مقلد بھی کیا اس سے زیادہ کچھ کہتا ہے۔ علامہ شعرانیؒ اپنی جس بات کو نفیس کہہ رہے ہیں وہ کتنے ہی صاحبانِ فتویٰ و ارشاد کی پیشانیوں پر بل ڈال دے گی۔ وہ

اپنی کتاب الانوار القدسیہ میں لکھتے ہیں :

"اور امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سے مروی ہے کہ انھوں نے اپنے تلامذہ سے فرمایا : "تم پر حرام ہے کہ میرے کلام پر فتویٰ دو، بایں حال کہ تم میری دلیل سے ناواقف ہو" اس سے معلوم ہوا کہ ایسے معاملے میں اپنے امام کا متعصب خود اپنے امام کا مخالف ہے اور اس امام پر اس کا کوئی الزام نہیں۔ ص ۱۶"

علامہ شعرانیؒ کے متعلق اطمینان ہے کہ ہندوستان کے وہ لوگ جو عدم تقلید کی بو سونگھ کر بھی ضال و مضل کا فتویٰ صادر کیا کرتے ہیں انھیں کچھ نہ کہیں گے، ہاں یہ ممکن ہے کہ ان عبارتوں کا نقل کرنا جرم قرار دیا جائے۔ امام شعرانیؒ اپنی اسی کتاب میں ایک جگہ تحریر فرماتے ہیں :

"اور جان لو کہ تمام مجتہدین کے مذاہب اہل حق کے نزدیک ایک ہی مذہب کے حکم میں ہیں۔ اہل حق اپنی وسعتِ نظر کی وجہ سے ان میں فرق نہیں کرتے۔ اس لیے کہ وہ اس چشمے کو دیکھتے ہیں جس سے مجتہدین نے پانی حاصل کیا ہے۔ وہ چشمہ ایک ہی ہے اور ایک ہی شریعت سے پھوٹا ہے۔ لہٰذا وہ کل کے کل اس دائرے میں داخل ہیں۔" (الانوار القدسیہ)

مذاہب مجتہدین کو مذہبِ واحد کہنا اس جہت سے درست ہے کہ سب کا سب مستدل شریعتِ محمدیؐ ہی ہے علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والتسلیم، اس لیے کسی کو یہ کہنے کا حق نہیں ہے کہ حق اسی مجتہد کے قول میں محصور ہے جس کی وہ پیروی کر رہا ہے۔ علماء و مجتہدین کے اقوال کی جو اصل حیثیت ہے اس کی تفصیل بھی امام شعرانی نے بڑی عمدہ کی ہے۔ لکھتے ہیں :

"علماء کے تمام اقوال تین حال سے خالی نہیں ہیں۔ یا (۱) وہ صریح سنت کے موافق ہیں تو یہاں احسان سنت کا ہے اور مجتہد نے گویا اس کی حکایت کی ہے، یا (۲) وہ صریح سنت کے مخالف ہیں ایسے حال میں وہ اقوال ترک کر دیے جائیں گے اور سنت پر عمل کیا جائے گا اور یا (۳) وہ اقوال ایسے ہیں کہ سنت سے نہ ان کی موافقت ظاہر ہے نہ مخالفت، ایسے موقع پر سب سے اچھی بات توقف ہے، ان اقوال پر عمل کرنا اور نہ کرنا دونوں برابر ہے۔ ہاں اگر وہ اقوال ایسے ہیں

جو دین کے معاملہ میں احتیاط کی طرف مائل ہیں جیسے چرس اور بھنگ اور ان تمام مخدرات کے استعمال کو منع کرنا جو نشہ آور نہیں ہیں تو ان پر عمل کرنا راجح تر ہے۔" (الانوار صد ۳۱)

اگر محض اجتہادی اقوال میں اس بات کا خیال رکھا جاتا جو علامہ شعرانیؒ نے لکھی ہے تو بہت سے جھگڑے ختم ہو جاتے اور ایک دوسرے کی تفسیق و تضلیل تک تو ہرگز نوبت نہ پہنچتی۔ علامہ شعرانیؒ کی یہ بات مجتہدین کرام کے خود اپنے اقوال کے مطابق ہے، جیسا کہ پہلے گزر چکا۔ مقلدین جامدین کی ایک ایسی بات کا جواب بھی علامہ شعرانی نے دیا ہے جو آج بھی وبا کی طرح عام ہے اور اُسے بڑے بڑے صاحبان دستار لاجواب ہونے کے وقت "خدنگ آخریں" کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ شعرانی لکھتے ہیں:

وقول بعض المقلدین لو لا ان لرائی امامی دلیلا ما قال بہ جمود و تصور و تعصب مع ان نفس امامہ قد تبرا من العمل بالرای ونھی غیرہ عن اتباعہ فقد کان ابو حنیفہ رحمہ اللہ یقول عمن افتاہ ھذا رای ابی حنیفہ وھو احسن ما قدرنا علیہ فمن جاءنا باحسن منہ فھو الاولٰی والصواب۔

(جلاء العینین بحوالہ الدر المنثور)

اور بعض مقلدین کا یہ کہنا کہ اگر میرے امام کی رائے کی کوئی دلیل نہ ہوتی تو وہ یہ کہتے ہی نہیں، جمود، قصور و تعصب ہے، باوجود اس کے کہ خود اس کے اپنے امام نے رائے پر عمل کرنے سے برأت کی ہے اور دوسرے کو اس کے اتباع سے روکا ہے۔ ابو حنیفہؒ اس شخص سے جس کو وہ فتویٰ دیتے تھے یہ کہتے تھے کہ یہ ابو حنیفہ کی رائے ہے اور یہ سب سے بہتر رائے ہے جس پر ہم قادر ہو سکے۔ اب اگر کوئی اس سے بھی بہتر رائے پیش کر دے تو وہی اولیٰ اور وہی صحیح ہے۔

"میرے امام کے پاس دلیل نہ ہوتی تو وہ یہ نہ کہتے"، "فلاں بزرگ کے پاس دلیل نہ ہوتی تو وہ یہ نہ کرتے"۔ اس طرح کی باتیں اپنا مدعا ثابت کرنے کے لیے وہ آخری دلیل سمجھی جاتی ہیں جس کا جواب کوئی شخص دے نہیں سکتا لیکن علامہ شعرانیؒ کی طرح شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ

نے بھی اس طرح کے قول کو جہل قرار دیا ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے وصیت نامہ کی پہلی وصیت یہ ہے:

"فروعی مسائل میں ان علماء و محدثین کی اتباع کرو جو فقہ و حدیث کے جامع ہوں۔ تفریعات فقہیہ کو ہمیشہ کتاب و سنت کے مطابق کرتے رہنا چاہیئے جو مسائل تفریعی کتاب و سنت کے موافق ہوں، قبول کیے جائیں، جو خلاف ہوں انھیں بالکل ترک کر دیا جائے۔ امت محمدیؐ کے واسطے اجتہادی مسائل کو کتاب اللہ اور کتاب الرسول سے منطبق کر کے پیش کرنا ضروری ہے، کسی حال میں اس سے مفر نہیں۔ ایسے خشک دماغ فقہا کی بات کبھی نہ سننی چاہیئے جو کسی ایک عالم کی تقلید کو اپنی دستاویز سمجھ لے اور سنتِ رسولؐ کو ترک کر دے۔ اس قسم کے خشک دماغ فقہا کی طرف کبھی بھی التفات نہ کرنا چاہیئے، بلکہ ان سے دور رہنے کو تقربِ خداوندی سمجھے۔" (ولی اللہ" شائع کردہ مکتبہ جامع قرول باغ ۱۳۴۹ھ)

علمائے حق اور مشائخِ صدق کی کتابوں میں تقلید جامد کے خلاف کافی مواد موجود ہے، یہاں سب کا استقصاء مقصود نہیں۔ آخر میں شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ کی ایک نصیحت درج کی جاتی ہے جو انھوں نے اپنے ایک شاگرد (مرید) کو کی تھی۔

"اگر تم میں کتاب و سنت سے استنباط اور ان کے اشارات کو سمجھنے کی قوت اللہ نے دی ہے تو کوئی مانع نہیں ہے بلکہ واجب ہے کہ تم اس میں سعی کرو کہ یہ نسبت تمھیں حاصل ہو جائے اور اس بات کو کسی خاص جماعت کے ساتھ مخصوص نہ رکھو۔ صرف مقلد ہونا اور دوسروں کے چہروں کی طرف دیکھنا کہ وہ کیا کہتے ہیں اور ان کے اختلافات کے درمیان سرگرداں ہونا اور فیض الٰہی کا دروازہ اپنے دل پر بند کرنا اور اللہ تعالیٰ نے جو علم تمھارے حصہ میں رکھا ہے اس سے محروم رہنا اور علم کو مخصوص جماعت میں محصور کرنا اور صریح حق کے ظاہر ہونے کے بعد جو دین کے موافق ہو کسی کی مخالفت میں زبان نہ کھولنا یہ ساری باتیں فضول ہیں اور وصولِ حق سے مانع۔" (تذکرہ شیخ عبدالحق بحوالہ نکات الحق)

ان مختصر جملوں میں شیخ عبدالحق نے وہ سب کچھ کہہ دیا ہے جو علامہ شعرانی نے پھیلا کر کہا ہے ان عبارتوں کو پیش کرنے سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ تقلیدِ جامد کی حمایت کرنے والے علمار کی کمی ہے اور نہ یہ سمجھنا چاہیے کہ تقلید شخصی کو واجب اور اپنے امام کی عقیدت میں افراط و غلو سے کام لینے والے نہیں ہیں۔ نہیں، بلکہ اگر اس سلسلے کی عبارتیں جمع کی جائیں تو ان کی ضخامت اور زیادہ ہوگی۔ اس سلسلے میں بعض ایسے اساطینِ علم و فضل بھی پیش پیش ہیں جو تقویٰ و طہارت اور دین کی محبت میں اپنے وقت کے امام تھے۔

اس جمود تقلید اور اس غالیانہ عقیدت نے کیا فائدہ پہنچایا؟ اس کا تو علم نہیں ہے، لیکن اس کا یہ اثر ہم ضرور دیکھ رہے ہیں کہ اس طرح کی تحریروں نے علمار و مشائخ کے اقوال کی تنقید کو بھی جرم بنا دیا ہے۔ بہرحال ہر شخص کو اختیار ہے کہ وہ جس روش کو چاہے اپنے لیے پسند کرے، اگر وہ حق کی حمایت میں تنقید کرتا ہے تو کوئی اس کا اجر چھین نہیں سکتا اور اگر عناد و مخاصمت یا جذبۂ نفسانی کے ماتحت خواہ مخواہ تنقید کرتا ہے تو اس کا درد بھی اسی کے سر ہے۔

الحق احق ان یتبع وما توفیقی الا باللہ العلی العظیم۔

اپریل، مئی ۱۹۵۶ء

اولیاء اللہ[1]

لفظ ولی وولایت کی لغوی تحقیق

عربی زبان میں ولیٰ یلیٰ کے معنی ہیں کسی شے کا کسی دوسری شے سے قریب ہونا۔ مثلاً جب بولتے ہیں "ہذا یلی ہذا" تو اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ یہ شے اس شے کے قریب ہے۔ اسی سے ولایت ہے جس کی اصل، محبت اور قرب ہے۔ ولایت کی ضد عداوت ہے جو بغض ونفرت اور دوری پر دلالت کرتا ہے۔ لفظ ولی اسم فاعل ہے۔ اس کے معنی ہیں قریب اور دوست۔ اولیاء، ولی کی جمع ہے۔ عربی کے لغت قاموس میں ہے:

"وَلْیٌ" کے معنی قرب اور نزدیکی کے ہیں۔ پے درپے بارش بھی اسی کے معنی میں داخل ہے۔ وَلِیٌّ اسی مصدر کا اسم ہے۔ ولی کے معنی محب، دوست اور مددگار کے بھی ہیں۔ تَوَلَّاہُ کے معنی یہ ہیں کہ اس کو اپنا دوست بنالیا۔ دارہ وَلِیٌّ دارِی کے معنی ہیں۔ اس کا گھر میرے گھر کے قریب ہے[2]

---

[1] مولانا مرحوم کا یہ مقالہ سب سے پہلے ماہنامہ زندگی' جلد ۷ شمارہ ۲ اگست ۱۹۵۲ء میں شائع ہوا تھا۔ بعد میں انھوں نے اس پر نظر ثانی کی اور چند اہم مباحث بڑھائے اور وہ کتابچہ کی شکل میں شائع ہوتا رہا۔ اس کے پیش لفظ میں مولانا نے لکھا ہے۔ "اولیاء اللہ کے بارے میں یہ خیالات پھیلا دیئے گئے ہیں۔ ان کی وجہ سے مسلمانوں کے عقائد اور اعمال دونوں متاثر ہوئے ہیں۔ ضرورت تھی کہ قرآن کریم اور صحیح احادیث سے اولیاء اللہ کی تعریف معلوم کی جائے اور ان کے بارے میں وہ خیالات رکھے جائیں جو کتاب وسنت سے ثابت ہوں۔ یہ کتابچہ اسی ضرورت کے پیش نظر شائع کیا جارہا ہے"

افادیت کے پیش نظر اسے اس مجموعہ میں بھی شامل کیا جارہا ہے۔ (مرتب)

[2] الولی: القرب والدنو والمطر بعد المطر والولی الاسم منہ والمحب والصدیق والنصیر وتولاہ اتخذہ ولیا ودارہ ولی داری قریبۃ منھا (قاموس)

مصباح منیر میں ہے:

ابن الاعرابی نے کہا: "ولی کے معنی محبت کرنے والے، اطاعت گزار کے ہیں۔ موالات، معادات کی ضد ہے، اور ولی، عدو کی ضد ہے۔ اَللّٰہُ وَلِیُّ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا کے معنی بیان کرتے ہوئے ابواسحٰق نے کہا: اللہ مومنوں کا ولی ہے ان کی طرف سے مخاصمت کرنے میں، انھیں ہدایت دینے میں اور ان کے لیے دلیل قائم کرنے میں۔ اس لیے کہ اللہ، ایمان کی زیادتی کے ساتھ ہدایت میں بھی اضافہ کرتا جاتا ہے۔ جیسا کہ خود ہی فرمایا ہے: جو لوگ ہدایت کی راہ اختیار کرتے ہیں اللہ ان کی ہدایت میں اضافہ کر دیتا ہے نیز وہ ان کا ولی ہے۔ ان کے دشمنوں کے مقابلے میں ان کی مدد کرنے میں اور ان کے مخالفوں کے دین پر ان کے دین کو غالب کرنے میں[1]

ولی کی یہ لغوی تحقیق جیسا کہ ترجمہ سے ظاہر ہے، قرآن کی آیتوں سے مدلل ہے۔ ولایت کے معنی نصرت اور محبت، دونوں ہی آتے ہیں۔ کتاب مُغرب میں ہے:

ولایت اور وَلایت کے معنی نصرت اور محبت ہیں۔[2]

قرآن کریم میں لفظ ولی کے چند استعمالات

لغتِ عرب اور قرآن و احادیث کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ لفظ ولی حسبِ ذیل معانی میں استعمال کیا جاتا ہے:

---

[1] قال ابن الاعرابی: "الولی التابع المحب والموالاة ضد المعاداة ــــ قوله عزوجل "اَللّٰہُ وَلِیُّ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا" قال ابواسحاق: ولیهم فی حجاجهم وهدایتهم واقامة البرهان لهم لانه یزیدهم بایمانهم هدایة کما قال عزوجل: "والذین اهتدوا زادهم هدًی" وولیهم ایضًا فی نصرهم علی عدوهم واظهار دینهم علی دین مخالفیهم۔ (مصباح منیر)

[2] الولایة بالکسر والفتح النصرة والمحبة (مُغرب)

(۱) قریبی (۲) دوست (۳) نگراں (۴) کارگزار (۵) کارساز (۶) مددگار (۷) تابع و مطیع (۸) ساتھی (۹) وارث۔

ان تمام معانی پر غور کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ محبت و قُرب لفظ ولی کا اساسی معنی و مفہوم ہے اور اسی کی مناسبت سے دوسرے معانی بھی پیدا ہوتے ہیں۔ قرآن کریم میں لفظ ولی تقریباً ان تمام معانی میں استعمال ہوا ہے۔ چند آیتیں ذیل میں درج کی جاتی ہیں:

(۱) فَاِنْ كَانَ الَّذِىْ عَلَيْهِ الْحَقُّ سَفِيْهًا اَوْ ضَعِيْفًا اَوْ لَا يَسْتَطِيْعُ اَنْ يُّمِلَّ هُوَ فَلْيُمْلِلْ وَلِيُّهٗ بِالْعَدْلِ (البقرہ: ۲۸۲)

پھر اگر وہ شخص جس پر قرض ہے بے عقل ہو یا ضعیف یا خود نہیں لکھا سکتا تو لکھا دے اس کا ولی (شرعی وارث یا کوئی کارگزار) انصاف کے ساتھ۔

(۲) اَفَتَتَّخِذُوْنَهٗ وَذُرِّيَّتَهٗ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِىْ وَهُمْ لَكُمْ عَدُوٌّ (الکہف: ۵۰)

کیا تم شیطان اور اس کی ذریت کو میرے سوا اپنا دوست بناتے ہو، حالانکہ وہ سب تمہارے دشمن ہیں۔

(۳) وَمَا لَهُمْ اَلَّا يُعَذِّبَهُمُ اللّٰهُ وَهُمْ يَصُدُّوْنَ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَمَا كَانُوْٓا اَوْلِيَآءَهٗ ۭ اِنْ اَوْلِيَآؤُهٗٓ اِلَّا الْمُتَّقُوْنَ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝ (الانفال: ۳۴)

اور ان میں کیا بات ہے کہ اللہ ان پر عذاب نہ کرے اور وہ تو روکتے ہیں مسجد حرام سے اور وہ اس کے متولی نہیں، اس کے متولی تو وہی ہیں جو پرہیزگار ہیں۔ لیکن ان میں سے اکثر کو اس کی خبر نہیں۔

(۴) وَقُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِىْ لَمْ يَتَّخِذْ وَلَدًا وَّلَمْ يَكُنْ لَّهٗ شَرِيْكٌ فِى الْمُلْكِ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ وَلِىٌّ مِّنَ الذُّلِّ وَكَبِّرْهُ تَكْبِيْرًا ۝ (بنی اسرائیل: ۱۱۱)

اور کہو، سب تعریفیں اللہ کو ہیں جو نہیں رکھتا اولاد اور نہ کوئی اس کا ساجھی ہی سلطنت میں اور نہ اس کا کوئی کارساز و مددگار، کمزوری و عاجزی کی وجہ سے اور اس کو بڑا جان کر اس کی بڑائی کرتے رہو۔

(۵) يٰٓاَبَتِ اِنِّىْٓ اَخَافُ اَنْ يَّمَسَّكَ

اے باپ! میں ڈرتا ہوں، کہیں آلگے تجھ

عَذَابٌ مِّنَ الرَّحۡمٰنِ فَتَكُوۡنَ لِلشَّيۡطٰنِ وَلِيًّا ۝ (مریم: ۴۵)	کو ایک آفت رحمٰن کی طرف سے پھر تو ہو جائے شیطان کا ساتھی۔
(۶) اِنِّيۡ خِفۡتُ الۡمَوَالِيَ مِنۡ وَّرَآءِيۡ وَكَانَتِ امۡرَاَتِيۡ عَاقِرًا فَهَبۡ لِيۡ مِنۡ لَّدُنۡكَ وَلِيًّا ۝ يَّرِثُنِيۡ وَيَرِثُ مِنۡ اٰلِ يَعۡقُوۡبَ وَاجۡعَلۡهُ رَبِّ رَضِيًّا ۝ (مریم: ۶)	اور میں ڈرتا ہوں بھائی بندوں سے اپنے پیچھے اور میری بیوی بانجھ ہے سو تو بخش مجھ کو اپنے پاس سے ایک ولی جو میری اور اولاد یعقوب کی میراث کا مالک ہو اور بنا اے رب اس کو پسندیدہ۔

اس آیت میں صاف طور پر ولی کا لفظ وارث کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔

ـــــ ان الگ الگ معانی کے لیے ولی اور اولیاء کا لفظ قرآن میں کم استعمال ہوا ہے۔ یہ لفظ ایک جامع اصطلاح کی حیثیت سے زیادہ استعمال ہوا ہے اور چار صورتوں میں ہوا ہے۔

۱۔ اللہ تعالیٰ اپنے مومن بندوں کا ولی ہے۔

۲۔ اللہ کے مومن بندے اس کے اولیاء ہیں۔

۳۔ شیطان کافروں اور مشرکوں کا ولی ہے۔

۴۔ کافر اور مشرک شیطان کے اولیاء ہیں۔

اللہ تعالیٰ جب اپنے آپ کو مومنوں کا ولی کہتا ہے تو اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ وہ ان کا دوست ہے۔ اس کی رحمت ان سے قریب ہے۔ وہی ان کا کارساز و مددگار وہی ان کا رفیقِ اعلیٰ اور اسی کی با اختیار نگرانی ان کی محافظ ہے اور وہی ان کا مرجع و ملجا ہے۔ وہ جب مومنوں کو اولیاء اللہ قرار دیتا ہے تو اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ مومن بندے اس کی محبت کے متوالے۔ اس کی رحمت و نظرِ عنایت کے آرزومند، اس کی نصرت و کارسازی پر بھروسہ کرنے والے، اس کے اشاروں پر چلنے والے، اس کی رفاقت کے جویاں اور اس کی مرضیات میں اپنی مرضیات گم کر دینے والے ہیں۔

شیطان کافروں کا ولی ہے اور کافر اس کے اولیاء ہیں۔ اس کا مفہوم یہ ہے کہ

شیطان اللہ کے بندوں کو بہکا کر اپنا بندہ بناتا ہے۔ ان کو خدا سے کاٹ کر اپنے ساتھ جوڑ لیتا ہے اور پھر یہ نافرمان و باغی بندے اسی کو اپنا دوست اور حاکم سمجھتے اور اس کی اطاعت میں لگے رہتے ہیں۔

دنیا دو گروہوں کی معرکہ آرائیوں کا میدان ہے

اولیاء اللہ اور اولیاء الشیطان، ان دو گروہوں کے ذکر سے قرآن بھرا ہوا ہے اور یہ دنیا انھیں دو گروہوں کی معرکہ آرائیوں کا میدان ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے سامنے یہ آزمائش رکھی ہے کہ وہ جس گروہ کو پسند کریں اس میں داخل ہو جائیں۔ اس سلسلے کی چند آیتیں درج ذیل ہیں:

(۱) اَللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ (البقرہ: ۲۵۷)

اللہ ایمان والوں کا ولی ہے۔ انھیں اندھیروں سے روشنی میں نکال لاتا ہے۔

(۲) اِنَّهُمْ لَنْ يُّغْنُوْا عَنْكَ مِنَ اللّٰهِ شَيْـًٔا وَاِنَّ الظّٰلِمِيْنَ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ وَاللّٰهُ وَلِيُّ الْمُتَّقِيْنَ ٥ (الجاثیہ: ۱۹)

اللہ کے سامنے وہ ہرگز تیرے کام نہ آئیں گے اور ظالم ایک دوسرے کے ولی ہیں اور اللہ متقیوں کا ولی ہے۔

(۳) اِنْ زَعَمْتُمْ اَنَّكُمْ اَوْلِيَآءُ لِلّٰهِ مِنْ دُوْنِ النَّاسِ فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ٥ (الجمعہ: ۶)

اگر تمھارا گمان ہے کہ تمام دوسرے لوگوں کے مقابلہ میں تم اللہ کے اولیاء ہو تو موت کی تمنا کرو اگر تم اپنے دعوے میں سچے ہو۔

(۴) وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا اَوْلِيٰٓـُٔهُمُ الطَّاغُوْتُ يُخْرِجُوْنَهُمْ مِّنَ النُّوْرِ اِلَى الظُّلُمٰتِ ٥ (البقرہ: ۲۵۷)

جن لوگوں نے کفر کا رویہ اختیار کیا ہے ان کے اولیاء طاغوت ہیں، انھیں روشنی سے اندھیروں میں نکال لے جاتے ہیں۔

(۵) اِنَّ اَوْلَى النَّاسِ بِاِبْرٰهِيْمَ لَلَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ وَهٰذَا النَّبِيُّ وَالَّذِيْنَ

ابراہیم سے نسبت رکھنے کا سب سے زیادہ حق اگر کسی کو پہنچتا ہے تو ان

آمَنُوا وَاللّٰهُ وَلِيُّ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝ (آلِ عمران: ۶۸)

لوگوں کو جنھوں نے اس کی پیروی کی اور اب یہ نبی اور اس کے ماننے والے، اور اللہ مومنوں کا ولی ہے۔

(۶) اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ الطَّاغُوْتِ فَقَاتِلُوْٓا اَوْلِيَآءَ الشَّيْطٰنِ اِنَّ كَيْدَ الشَّيْطٰنِ كَانَ ضَعِيْفًا ۝

مسلمان اللہ کی راہ میں لڑتے ہیں اور کافر طاغوت کی راہ میں لڑتے ہیں۔ پس شیطان کے اولیاء سے لڑو اور یقین جانو کہ شیطان کی چالیں حقیقت میں نہایت کمزور ہیں۔

اِنَّا جَعَلْنَا الشَّيٰطِيْنَ اَوْلِيَآءَ لِلَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۝ (الاعراف: ۲۷)

ہم نے شیاطین کو ان لوگوں کا دوست بنا دیا ہے جو ایمان نہیں لاتے۔

ان آیات میں ولی اور اولیاء کے الفاظ ایک جامع اصطلاح کی طرح استعمال ہوئے ہیں۔ دو گروہ ایک دوسرے کے مقابل ہیں۔ ایک طرف اللہ کے اولیاء ہیں اور دوسری طرف شیطان کے اولیاء۔

سورۂ یونس کی چند آیتیں

اَلَآ اِنَّ اَوْلِيَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَكَانُوْا يَتَّقُوْنَ ۝ لَهُمُ الْبُشْرٰى فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ ۭ لَا تَبْدِيْلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ ۭ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۝ (یونس: ۶۲ تا ۶۴)

سنو، اللہ کے اولیاء کے لیے کسی خوف اور اور رنج کا موقع نہیں، یہ وہ لوگ ہیں جو ایمان لائے اور تقویٰ کا رویہ اختیار کیا، دنیا اور آخرت دونوں زندگیوں میں ان کے لیے بشارت ہی بشارت ہے۔ اللہ کی باتیں بدل نہیں سکتیں، یہی بڑی کامیابی ہے۔

یہ آیتیں اس لحاظ سے بھی اہم ہیں کہ ان سے اولیائے امت رحمہم اللہ کی ولایت خاصہ کے لیے استدلال کیا جاتا ہے۔ چنانچہ رسالہ قشیریہ میں باب الولایۃ کے تحت یہی آیتیں پیش کی گئی ہیں۔ ان آیتوں میں اولیاء اللہ کی تعریف و تعیین بھی کی گئی ہے اور ان کے دنیوی و اخروی اجر

کا ذکر بھی کر دیا گیا ہے اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَکَانُوْا یَتَّقُوْنَ ٥ اولیاء اللہ کی تعریف و تعیین ہے اور اس میں دو جز ہیں ایمان اور تقویٰ ۔ ایمان کے بغیر کوئی اللہ کا ولی کسی درجے میں بھی نہیں ہو سکتا اور تقویٰ کے بغیر کسی کو ولایت خاصّہ حاصل نہیں ہو سکتی ۔ اللہ کا تقرب اور اس کے نزدیک عزت کا مقام حاصل کرنے کا ذریعہ تقویٰ ہے ۔ اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ (تم میں جو سب سے زیادہ متقی ہے وہی اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ عزت والا ہے) حاصل یہ نکلا کہ مومنین متقین ہی اللہ تعالیٰ کے اولیائے خاص ہیں ۔ ٹھیک یہی بات رسالہ قشیریہ کے محشی علامہ عروسی نے لکھی ہے ۔

ومِلاک الولایۃ ھو	ولایت کا دارو مدار تقویٰ پر ہے ۔
التقویٰ المذکورۃ فالاولیاء	لہذا مومنین متقین ہی اولیاء
ھم المؤمنون المتقون [1]	ہیں ۔

یہ بات انھوں نے سورہ یونس کی آیت کے تحت لکھی ہے ۔ شرح عقائد نسفی میں ولی کی یہ تعریف کی گئی ہے :

"ولی وہ ہے جو بحد امکان اللہ تعالیٰ اور اس کی صفات کا عارف ہو ۔ طاعتوں پر مواظبت و مداومت کر رہا ہو ، معاصی سے بچ رہا ہو اور لذات و شہوات میں منہمک نہ ہو ۔" [2]

کرامات کا ظہور ولایت کی شرط نہیں ہے

اوپر جو عبارتیں گزریں انہیں سے یہ معلوم ہو گیا کہ کرامات اور اسی طرح کی دوسری چیزیں ولایت کی شرط نہیں ہیں لیکن عوام کو عجیب و غریب چیزیں دکھا کر بہت سے انسان نما شیطان دھوکہ دیتے رہتے ہیں ۔ اس لیے

---

[1] نتائج الافکار القدسیہ ج ۳ ص ۲۰۹

[2] والولی ھو العارف باللہ وصفاتہ حسب ما امکن المواظب علی الطاعات المجتنب عن المعاصی المعرض عن الانہماک فی اللذات والشہوات (شرح عقائد نسفی)

حق پرست صوفیہ نے اپنی کتابوں میں صراحت کی ہے کہ کرامتیں، ولایت کے لیے ضروری نہیں ہیں۔ اصل شئے تقویٰ اور کتاب وسنت کی پیروی ہے۔ میں یہاں صرف دو صراحتیں نقل کرتا ہوں۔ شیخ الاسلام زکریا انصاری رسالہ قشیریہ کی شرح میں لکھتے ہیں:

لہٰذا معلوم ہوا کہ صحیح دلائل سے ثابت شدہ اعمال پر استقامت کے سوا اور کوئی چیز ولی میں نہیں دیکھی جائے گی اور خارق عادات چیزوں کا ظہور و صدور ولایت کی شرط نہیں ہے بلکہ کبھی ایسا شخص دھوکے میں مبتلا ہوتا ہے اور اپنے آپ کو ولی اللہ سمجھ کر یا لوگوں کو سمجھا کر) خدا پر افترا کرتا ہے اور اس بات کے لیے یہ دلیل کافی ہے کہ آخر زمانہ میں دجّال کا خروج ہوگا جس کے ساتھ جنت اور جہنم ہوگی اور وہ مُردوں کو زندہ کرے گا اور زندوں کو مار ڈالے گا حالانکہ وہ خدا کا دشمن ہوگا۔[1]

اس سے زیادہ صراحت کے ساتھ علامہ شعرانی تحریر فرماتے ہیں:

'کرامات کا ظاہر ہونا ولایت کی شرط نہیں ہے۔ ولی ہونے کی شرط صرف اللہ کے احکام کی تعمیل اور اس کے نواہی سے اجتناب ہے، اس کا معاملہ کتاب وسنت کے دلائل سے مضبوط ہونا چاہیے۔ جو شخص ایسا ہوگا اس کی ولایت پر قرآن شاہد ہے اگرچہ کوئی ایک شخص بھی اس کا معتقد نہ ہو اور نہ اس کے پاس مریدوں کی جماعت ہو'[2]

علامہ عبدالوہاب شعرانی رحمۃ اللہ علیہ نے چودھویں صدی ہجری کے مشہور مستند

---

[1] شرح رسالہ قشیریہ جلد ۳

[2] وظهور الكرامات ليست بشرط فى الولاية انما يشترط امتثال اوامر الله تعالى واجتناب نواهيه فيكون امره مضبوطا على الكتاب والسنة فمن كان كذالك فالقران شاهد بولايته وان لم يعتقد فيه احد ولا كان له اتباع ومريدون (الانوار القدسية فى بيان آداب العبودية)

اور اعلیٰ درجہ کے صوفی و عالم ہیں، ولی کے متعلق کتنی صاف اور سچی بات لکھی ہے۔

علامہ ثناء اللہ پانی پتیؒ نے سورۂ یونس کی مذکورہ بالا آیتوں کی تفسیر کرتے ہوئے لکھا ہے:

"اولیاء کی علامت خرق عادت اور غیب کا علم نہیں ہے جیسا کہ عوام نے گمان کر رکھا ہے۔ اس لیے کہ یہ چیزیں (کرامات اور نظروں سے اوجھل چیزوں کا علم) بہت سے اولیاء میں نہیں پائی جاتیں اور دوسروں میں بہ سبیل استدراج پائی جاتی ہیں اور بعض اولیاء میں نادر طور پر ان چیزوں کے پائے جانے سے یہ لازم نہیں آتا کہ یہ چیزیں ان کی ولایت کی علامت ہوں۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے جب کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا" (اے نبی) کہہ دو کہ میں تمھاری ہی طرح ایک انسان ہوں البتہ مجھ پر اللہ کی وحی نازل ہوتی ہے۔" دوسری جگہ ارشاد ہوا "کہہ دو، اگر مجھے غیب کا علم ہوتا تو میں بہت سے فائدے اپنے لیے حاصل کر لیتا اور مجھے کبھی کوئی نقصان نہ پہنچتا۔" تیسری جگہ فرمایا گیا ہے" (اے محمدؐ) ان سے کہو کہ نشانیاں تو اللہ کے پاس ہیں۔" اور صوفیہ علیہم الرحمہ نے کہا ہے کہ کرامت کو چھپانا ضروری ہے اور اس کی وجہ سے کسی کو کسی دوسرے پر کوئی فضیلت حاصل نہیں۔"[1]

متقی کون لوگ ہیں؟

جب یہ معلوم ہو گیا کہ پرہیزگار مومن ہی اولیاء اللہ ہیں تو اب یہ جاننا چاہیے کہ تقویٰ کیا ہے اور متقی مومنوں کی صفات کیا ہیں؟ یہ ایک مستقل موضوع ہے۔ اس پر تفصیل سے یہاں لکھنا مقصود نہیں اجمالاً اتنا لکھنا کافی ہے کہ قرآن نے جس تقویٰ کا مطالبہ کیا ہے اور جو دعوتِ انبیاء کا مدار ہے، اس کی حقیقت یہ ہے کہ انسان اپنی زندگی کو خدا کے مقرر کیے ہوئے حدود کے اندر رکھے اور ہمیشہ اس بات سے ڈرتا رہے کہ اگر اس نے اللہ کی قائم کی ہوئی کسی حد کو توڑا،

---

[1] تفسیر مظہری ج ۵ ص ۴۱

یا اس کی مقرر کی ہوئی کسی سرحد کو پھاند اتو اس کو خدا کی سزا سے بچانے والا کوئی نہیں الا یہ کہ خود اللہ تعالیٰ ہی رحم کرے۔

مومنین متقین کی صفات قرآن مجید میں تفصیل سے موجود ہیں۔ یہاں چند آیتیں پیش کی جاتی ہیں۔ متقی کون لوگ ہیں؟ اس کے لیے سب سے پہلی آیت سورۃ البقرہ رکوع ۲۲ میں دیکھنی چاہیے۔ اس کا ترجمہ یہ ہے:

"نیکی یہ نہیں کہ تم اپنے چہرے مشرق کی طرف یا مغرب کی طرف کر لو بلکہ نیکی یہ ہے کہ آدمی اللہ کو اور یوم آخر اور ملائکہ کو اور اللہ کی نازل کی ہوئی کتاب اور اس کے پیغمبروں کو دل سے مانے اور اللہ کی محبت میں اپنا مال رشتہ داروں اور یتیموں پر، مسکینوں پر، مدد کے لیے ہاتھ پھیلانے والوں پر اور غلاموں کی رہائی پر خرچ کرے۔ نماز قائم کرے اور زکوٰۃ دے اور نیک وہ لوگ ہیں کہ جب عہد کریں تو اسے وفا کریں اور تنگی و مصیبت کے وقت میں اور حق و باطل کی جنگ میں صبر کریں۔ یہ ہیں راست باز لوگ اور یہی لوگ متقی ہیں۔" (البقرہ: ۱۷۷)

اس آیت نے پرہیزگاروں کو ناپرہیزگاروں سے بالکل الگ کر دیا ہے اور تقویٰ کی حقیقت پر دن کی روشنی پھیلا دی ہے۔ سب سے پہلے اس نے اس غلط فہمی کو دور کیا جو تقویٰ کے متعلق اہل کتاب میں پیدا ہو گئی تھی۔ انھوں نے مذہب کی چند آسان رسموں کی پابندی اور چند خود ساختہ مظاہر دین داری کو اصل تقویٰ سمجھ رکھا تھا۔ قرآن نے مثال کے طور پر کہا کہ نیکی اور اعلیٰ درجہ کی نیکی یہ نہیں ہے کہ تم مشرق یا مغرب کی طرف منھ کر کے نماز پڑھ لو اور اپنے آپ کو متقی سمجھنے لگو، بلکہ اصل نیکی یہ ہے اور حقیقت میں متقی یہ لوگ ہیں۔ اس آیت میں پہلے ان بنیادی عقائد پر یقین و اذعان کو نیکی قرار دیا گیا ہے جن کے بغیر کسی کو تقویٰ کی ہوا بھی نہیں لگ سکتی اور پھر مثال کے طور پر چند بنیادی اعمال و صفات کا ذکر کیا گیا ہے۔ اللہ کے بتائے ہوئے مصارف میں انفاقِ مال، اقامتِ صلوٰۃ، ایتاءِ زکوٰۃ، ایفائے عہد، مشکلات اور حق و باطل کی جنگ میں صبر۔ یہ ہیں وہ بنیادی

اعمال وصفات جن کے بغیر راست بازی اور تقویٰ کا خیال بھی لغو ہے۔ حق وباطل کی جنگ میں صبر کی حقیقت یہ ہے کہ حق کو قائم رکھنے، حق کی حمایت کرنے اور حق کو قائم و نافذ کرنے میں انسان ہر مصیبت برداشت کرے اور ہر چوٹ کھائے مگر اپنے مقصد اور نصب العین میں سستی اور بزدلی نہ دکھائے۔ اگر یہ صفت اس میں نہیں ہے تو وہ راست باز اور متقی نہیں ہے چاہے اپنے آپ کو یہودیوں کی طرح متقیوں کا امام ہی کیوں نہ سمجھتا رہے۔

پھر سورۂ زمر میں فرمایا:

"اور جو سچی بات لایا اور جس نے اس کی تصدیق کی وہی لوگ متقی ہیں۔ ان کے لیے وہ سب کچھ ہے جو وہ چاہیں اپنے رب کے پاس، یہ بدلہ ہے محسنین کا۔" (الزمر: ۳۳، ۳۴)

اس آیت نے یہ بھی بتایا کہ سچا مومن ہی متقی اور محسن ہے۔ دعویٰ اسلام میں سچائی اور ایمان میں پختگی، تقویٰ کی روح اور اس کا جوہر ہے۔ ان دو مقامات میں قرآن نے صراحت کے ساتھ بتایا ہے کہ یہی لوگ متقی ہیں۔ اب چند ایسی آیتیں درج کی جاتی ہیں جن میں پرہیزگاروں کی کچھ مزید صفتوں کا ذکر ہے:

"یہ (متقین) وہ لوگ ہیں جو کہتے ہیں کہ مالک! ہم ایمان لائے۔ پس ہماری خطاؤں سے درگزر فرما اور ہمیں آتش دوزخ سے بچالے۔ یہ لوگ صبر کرنے والے ہیں۔ راست باز، فرماں بردار اور خدا کے راستے میں خرچ کرنے والے ہیں اور رات کی آخری گھڑیوں میں اللہ سے مغفرت کی دعائیں مانگا کرتے ہیں۔" (آل عمران: ۱۵ تا ۱۷)

اللہ پر پختہ ایمان، قول وعمل میں سچائی، مصائب ومشکلات میں صبر، اللہ کی فرماں برداری اور اپنے مال میں فیاضی، ان تمام صفات کے باوجود ان کے تواضع وانکسار اور ان کے عجز ونیاز کا حال یہ ہے کہ رات کے پچھلے پہر، طاعت وفرماں برداری میں کوتاہی کی معافی مانگا کرتے ہیں۔ یہ ہے اصل تقویٰ اور یہ ہیں متقی —— یہ نہیں ہے کہ ان کی زندگی کا دستور یہ ہو کہ پورا دن تو صرف ہو طاغوت کی فرماں برداری میں اور شب کی آخری

گھڑیوں میں آنسو بہانے بیٹھ جائیں اور سمجھ لیں کہ ہم نے خدا کو بھی خوش کر لیا۔ تہجد اور استغفار سحری کو ولایت خاصہ کے حصول میں خاص دخل ہے، لیکن یہ اسی وقت، جب زندگی اس مقصد کو حاصل کرنے میں صرف ہو رہی ہو جو اللہ نے اپنے مسلم بندوں کے لیے متعین کیا ہے۔ سورۂ اعراف میں فرمایا :-

"خدا نے فرمایا: میرے عذاب کا حال یہ ہے کہ جسے چاہتا ہوں دیتا ہوں اور رحمت کا حال یہ ہے کہ ہر چیز پر چھائی ہوئی ہے۔ پس میں ان لوگوں کے لیے رحمت لکھ دوں گا جو تقویٰ کی روش اختیار کریں گے۔ اور زکوٰۃ دیں گے اور میری آیات پر ایمان لائیں گے، جو الرسول کی پیروی کریں گے، جو نبی امی ہوگا اور اس کے ظہور کی خبر اپنے یہاں توریت اور انجیل میں لکھی پائیں گے، وہ انھیں نیکی کا حکم دے گا، برائی سے روکے گا، پسندیدہ چیزیں حلال کرے گا گندی چیزیں حرام ٹھہرائے گا۔ اس بوجھ سے نجات دلائے گا جس کے تلے دبے ہوں گے، ان پھندوں سے نکالے گا جن میں گرفتار ہوں گے تو جو لوگ اس پر ایمان لائے اس کی تقویت کا باعث ہوئے (دشمنانِ حق کے مقابلہ میں) اس کی مدد کی اور اس روشنی کے پیچھے ہوئے جو اس کے ساتھ بھیجی گئی ہے، سو وہی کامیابی پانے والے ہیں۔" (الاعراف: ۱۵۶، ۱۵۷)

ان آیتوں میں ایمان اور تقویٰ کو ان لوگوں کے اندر محصور کر دیا گیا ہے جو اللہ کے آخری نبیِ امی صلی اللہ علیہ وسلم کا اتباع کرنے والے ہیں۔ اللہ کی رحمت اور فلاح ان ہی لوگوں کے حصے میں ہے جو آپ پر ایمان لائیں۔ آپ کی تقویت کا باعث ہوں۔ آپ کی مدد کریں اور قرآن کو اپنی زندگی کا دستور العمل بنائیں۔ نزولِ قرآن اور آخری نبی کی بعثت کے بعد ایمان اور تقویٰ کا وجود ممکن ہی نہیں جب تک یہ باتیں نہ پائی جائیں اور جس میں یہ باتیں پائی جائیں اللہ کی ولایت خاصہ اس کے حصے میں ہے، چاہے اس کے اندر وہ مظاہرِ تقویٰ نہ پائے جاتے ہوں، جن کو بہت بعد کے لوگوں نے مظاہرِ تقویٰ قرار دے لیا ہے۔ نبیِ امی صلی اللہ علیہ وسلم نے انسانوں کو ان پھندوں سے نجات دلائی جنھیں انھوں نے خود اپنے گردن لیا

تھا۔ اب اگر پھر وہ ان پھندوں کو اپنے گرد جکڑ رہے ہیں تو یہ ان کی اپنی خطا ہے اور اگر وہ انھیں پھندوں کو تقویٰ اور ولایت سمجھ رہے ہیں تو یہ خود ان کا اپنا قصورِ فہم ہے۔

یہودیوں نے جو بوجھ اپنے سروں پر لاد لیا تھا اور پھندے اپنے گرد کس لیے تھے وہ کیا تھے، مولانا ابوالکلام تحریر فرماتے ہیں:

"یہ بوجھ کیا تھا اور پھندے کون سے تھے جن سے قرآن نے رہائی دلائی؟ قرآن نے دوسرے مقامات میں اسے واضح کر دیا ہے۔ مذہبی احکام کی بے جا سختیاں، مذہبی زندگی کی ناقابلِ عمل پابندیاں، ناقابلِ فہم عقیدوں کا بوجھ، وہم پرستیوں کا انبار، عالموں اور فقیہوں کی تقلید کی بیڑیاں، پیشواؤں کے تعبد کی زنجیریں۔ یہ بوجھل رکاوٹیں تھیں جنھوں نے یہودیوں اور عیسائیوں کے دل و دماغ مقید کر دیے تھے۔ پیغمبرِ اسلام کی دعوت نے ان سب سے نجات دلائی، اس نے سچائی کی ایسی سہل اور آسان راہ دکھا دی جس میں عقل کے لیے کوئی بوجھ نہیں، عمل کے لیے کوئی سختی نہیں، حَنِیْفِیَّۃُ السَّمحۃُ لَیْلُھَا کَنَھَارِھَا۔

افسوس! جن پھندوں سے قرآن نے اہل کتاب کو نجات دلائی تھی مسلمانوں نے وہی پھندے پھر اپنے گلوں میں ڈال لیے۔" (ترجمان القرآن ج ۲)

متقین کی صفات اور تقویٰ کے بیان سے قرآن بھرا ہوا ہے۔ یہ چند آیتیں نمونے کے طور پر درج کی گئیں اس نوع کی دوسری آیتیں بھی آپ کو قرآن میں ملیں گی۔ کتاب و سنت میں "اولیاء اللہ" کی نہ کوئی خاص ہیئت بیان کی گئی ہے اور نہ ان کا کوئی خاص لباس مقرر کیا گیا ہے، نہ ان کے اندر ما فوق البشر کسی طاقت کی نشان دہی کی گئی ہے اور نہ اولیاء اللہ کو کسی خاص طبقہ کے لیے مخصوص کیا گیا ہے۔ کتاب و سنت میں اولیاء اللہ خدا اور رسولؐ سے محبت کرنے والے سیدھے سادے خدا پرست اور پرہیزگار مسلمانوں کو کہا گیا ہے۔

بخاری شریف کی ایک حدیثِ قدسی [1]

رسالہ قشیریہ میں اولیاء اللہ کی ولایت خاصہ کے لیے دوسری دلیل کے طور پر ایک حدیث قدسی پیش کی گئی ہے۔ یہ حدیث حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے بھی روایت کی ہے اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے بھی۔ امام قشیری نے حضرت عائشہؓ کی روایت کے الفاظ نقل کیے ہیں۔ شیخ الاسلام زکریا انصاری نے حضرت ابوہریرہؓ کی روایت کے الفاظ بھی اپنی شرح میں نقل کر دیے ہیں۔ امام نوویؒ نے ریاض الصالحین میں حضرت ابوہریرہؓ کی روایت نقل کی ہے۔ ہم یہاں حضرت ابوہریرہؓ کی حدیث کے الفاظ نقل کرتے ہیں۔ یہ حدیث بخاری شریف میں موجود ہے۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت	عن ابی ھریرۃ قال قال
ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ	رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم
تعالیٰ فرماتا ہے: جس شخص نے میرے کسی	ان اللہ قال من عادیٰ لی
ولی سے دشمنی کی تو میں نے اس کے خلاف	ولیا فقد اٰذنتہٗ بالحرب
اعلانِ جنگ کر دیا، میرا بندہ جن چیزوں سے	وما تقرب الی عبدی
میرا تقرب حاصل کرتا ہے ان میں مجھے سب	احب الی مما افترضت
سے زیادہ محبوب وہ چیزیں ہیں جو میں نے	علیہ ولا یزال عبدی
اس پر فرض کر دی ہیں اور میرا بندہ مسلسل	یتقرب الی بالنوافل حتی
نوافل کے ذریعہ میرا تقرب حاصل کرتا رہتا ہے	احبتہ فاذا احبتہ
یہاں تک کہ وہ میرا محبوب ہو جاتا ہے اور جب	کنت سمعہٗ الذی
وہ میرا محبوب ہو جاتا تو میں اس کا کان ہو	یسمع بہٖ وبصرہٗ
جاتا ہوں جن سے وہ سنتا ہے، اس کی آنکھ	الذی یبصر بہٖ

---

[1] حدیث قدسی اس حدیث کو کہتے ہیں جس میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے صراحۃً اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کر کے کوئی بات ارشاد فرمائی ہو۔

ويده التي يبطش بها ورجله التي يمشي بها وان سالني لاعطينه ولئن استعاذني لاعيذنه وما ترددت عن شئ انا فاعله ترددي عن نفس المومن يكره الموت وانا اكره مساءته [1]

ہو جاتا ہوں جن سے وہ دیکھتا ہے، اس کا ہاتھ ہو جاتا ہوں جس سے وہ پکڑتا ہے، اس کا پیر ہو جاتا ہوں جس سے وہ چلتا ہے اور اگر وہ مجھ سے کچھ مانگے گا تو میں ضرور اس کو دوں گا اور اگر وہ مجھ سے پناہ طلب کرے گا تو میں ضرور اس کو پناہ دوں گا۔ مجھے اپنے بندۂ مومن کی روح قبض کرنے میں جو تردد ہوتا ہے وہ کسی دوسری چیز میں نہیں ہوتا۔ کیوں کہ وہ موت کو ناپسند کرتا ہے اور اس کی ناگواری کو میں ناپسند کرتا ہوں۔"

اس حدیث کو صحیح طور سے سمجھنے کے لیے سب سے پہلے یہ دیکھنا چاہیے کہ امام بخاریؒ نے اس کو صحیح بخاری کی کتاب الرقاق میں درج کیا ہے اور کتاب الرّقاق میں ایسی حدیثیں درج کی جاتی ہیں جو دل کو نرم کرنے والی ہوں تاکہ غفلت دور ہو اور بندۂ مومن آخرت کی طرف متوجہ ہو جائے۔ امام بخاریؒ نے تو یہ کتاب لاعیش الآخرۃ ہی کے باب سے شروع کی ہے۔ پھر یہ کہ انھوں نے مذکورہ بالاحدیث کو "من جاھد نفسہ فی طاعۃ اللہ" (جو اللہ کی اطاعت میں اپنے نفس سے جہاد کرتا ہے) کے باب میں درج کیا ہے۔ اسی طرح امام نوویؒ نے اس کو ریاض الصالحین کے باب المجاہدہ میں اور امام بیہقی نے "کتاب الزہد فصل فی الاجتہاد فی الطاعۃ وملازمۃ العبودیۃ" میں درج کیا ہے۔ محدثین کا یہ عمل اس

---

[1] میں نے جس کتاب میں یہ روایت پڑھی کسی میں مفصل حوالہ نہیں ملا۔ سب نے مجملاً "بخاری" یا "رواہ البخاری" لکھ دیا ہے۔ اس لیے اس کو بخاری شریف میں تلاش کرنے میں خاصہ وقت صرف ہوا۔ امام بخاری نے یہ حدیث کتاب الرقاق باب من جاہد نفسہ فی طاعۃ اللہ میں درج کی ہے۔

(بخاری جلد ۲ مطبوعہ کانپور)

بات کا کھلا اشارہ ہے کہ یہ حدیث بندۂ مومن کو اپنے نفس سرکش سے لڑنے، اللہ کی اطاعت میں سرگرم ہونے اور اس پر جمے رہنے کی ترغیب دیتی ہے۔

حدیث کے مضامین

اس حدیث میں ایک طرف تو یہ واضح کیا گیا ہے کہ "اللہ کا ولی" کون ہے۔ اس کی تعریف کیا ہے اور وہ کسی صفت سے متصف ہوتا ہے، دوسری طرف اللہ نے اپنے دوستوں کو بشارتیں دی ہیں اور تیسری طرف اللہ کے دوستوں کی دشمنی پر سخت وعید سنائی گئی ہے۔ ایک عظیم الشان بشارت اور ایک سخت وعید اس حدیث کے پہلے ہی ٹکڑے میں ہے: "جس شخص نے میرے کسی ولی سے دشمنی کی میں نے اس کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔" اس جملے میں اللہ نے اپنے دوستوں کو یہ بشارت دی ہے کہ تمھیں کسی سے ڈرنے کی ضرورت نہیں، میں تمھارا نگراں، کارساز، محافظ اور مددگار ہوں اس لیے تمھیں کسی طاقت سے بھی ڈرنے اور ڈر کر اپنے آقائے ولی نعمت سے منھ موڑنے یا ہچکچانے کی کوئی وجہ نہیں۔ تمھیں مجھ پر بھروسہ کرتے ہوئے میرے احکام کی تعمیل کرنی چاہیے۔

اس ٹکڑے میں اولیاء اللہ کے دشمنوں کے لیے وعید یہ ہے کہ دیکھو، میرے دوستوں سے دشمنی دراصل مجھ سے دشمنی ہے اگر تم ان سے دشمنی کرتے ہو تو ان کی حمایت میں تمھارے خلاف میں اعلانِ جنگ کرتا ہوں، تمھیں ان سے نہیں بلکہ مجھ سے جنگ کرنی ہوگی۔ یہ بات دوستوں کے لیے عظیم بشارت اور دشمنوں کے لیے سخت وعید ہے۔

ایک سوال اور جواب

یہاں پہنچ کر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ "اولیاء اللہ" کون لوگ ہیں جن کو اتنا اونچا مقام عطا کر دیا گیا ہے؟ اس کا جواب حدیث کے دوسرے ٹکڑے میں موجود ہے۔ "اولیاء اللہ" وہ لوگ ہیں جو اللہ کے عائد کیے ہوئے صرف فرائض ہی نہیں بلکہ اپنی خوشی سے اللہ کی رضامندی کا اعلیٰ درجہ حاصل کرنے کے لیے نوافل بھی ادا کرتے ہیں اور مسلسل کرتے رہتے ہیں، اس کے صلے میں اللہ ان سے محبت کرنے لگتا ہے، وہ اللہ کے محبوب ہو جاتے ہیں اور ولایت خاصہ کا مقام بلند انھیں عطا کر دیا جاتا ہے۔

ہمہ جہتی فرائض

اس حدیث میں فرض کا جو لفظ استعمال کیا گیا ہے اس میں کوئی قید لگی ہوئی نہیں ہے۔ اس لیے اس سے مراد وہ تمام فرائض ہیں جو اللہ نے اپنے بندوں پر عائد کیے ہیں۔ اس سے مراد صرف "فرض عبادات" نہیں ہیں۔

سید مصطفےٰ عروسی حدیث کے اس ٹکڑے کی شرح میں لکھتے ہیں:

> "مما افترضت علیہ" (میں نے جو کچھ اس پر فرض کیا ہے) اس جملے کا اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ اللہ سے قرب کے متعدد اسباب ہیں اور ان میں سب سے زیادہ موکد ان طاعات اور اعمالِ خیر کی بجا آوری ہے جو اللہ نے اپنے مکلف بندوں پر فرض کیے ہیں۔[1]

بعض علماء نے تو اس میں محرمات سے اجتناب کو بھی داخل کیا ہے کیوں کہ ان سے پرہیز بھی فرض ہے۔ شیخ ابوالفضل بن عطا نے فرائض کو اولاً دو قسموں میں تقسیم کیا ہے۔ فرائض ظاہرہ، فرائض باطنہ۔ پھر فرائض ظاہرہ کو دو قسموں میں تقسیم کیا ہے۔ وہ چیزیں جن کو بروئے کار لانا فرض ہے۔ جیسے نماز، روزہ، زکوٰۃ اور دوسری عبادتیں، اور وہ چیزیں جن سے اجتناب کرنا فرض ہے۔ جیسے زنا، قتل اور دوسرے محرمات۔ اسی طرح انھوں نے فرائض باطنہ کو بھی دو قسموں میں بانٹا ہے۔ ایک وہ چیزیں جن کا حاصل کرنا اور ان سے متصف ہونا فرض ہے۔ جیسے اللہ کی معرفت، اس پر ایمان، اس سے خوف، اس سے توکل۔ دوسری وہ چیزیں جن سے بچنا اور اپنے نفس کو ان سے پاک کرنا فرض ہے۔ جیسے عدم معرفت، کفر اور خدا سے بے خوفی۔[2]

فرض کو چھوڑ کر نفل میں مشغولیت فریبِ نفس ہے

اس حدیث میں بھی نہ صرف یہ کہ فرض کو نفل پر مقدم رکھا گیا ہے بلکہ یہ کہا گیا ہے کہ بندہ جن ذرائع سے خدا کا تقرب حاصل کرتا ہے ان میں فرائض خدا کو سب سے زیادہ محبوب ہیں۔ اس لیے نوافل کا درجہ

---

[1] نتائج الافکار القدسیہ ج ۲ ص ۳۰۲

[2] فتح الباری ج ۱۱

فرائض کے بعد ہے۔ فرائض مدارِ نجات ہیں اور نوافل ایک طرف فرائض کی تکمیل کرتے ہیں اور دوسری طرف ان سے بندے کے درجاتِ قرب بلند ہوتے ہیں۔ اگر فرائض ترک کر دیے جائیں تو نوافل سے خدا کی خوشنودی حاصل ہونا تو درکنار، انسان اپنے آپ کو اس کے غضب سے بچا نہیں سکتا۔ سید مصطفےٰ عروسی لکھتے ہیں:

"قربِ الٰہی کے من جملہ اسباب میں سے، فرائض کے بعد نوافل کی ادائیگی بھی ہے اور یہ دونوں چیزیں مل کر بندے کو اللہ کی محبت کا مستحق بناتی ہیں[۱]"

ایسے لوگ دنیا میں شاید ہی موجود ہوں جو مثال کے طور پر پنج وقتہ فرض نمازوں کو چھوڑ کر نفل نمازوں میں مشغول ہوں یا رمضان کے فرض روزے ترک کر کے نفل روزے رکھتے ہوں لیکن ایسے لوگ بکثرت موجود ہیں جو اللہ کے عائد کیے ہوئے بہت سے فرائض ترک کر کے صرف صوم وصلوٰۃ کے فرائض و نوافل میں مشغولیت کو قربِ الٰہی کے لیے کافی سمجھتے ہیں اس غلط فہمی کو بھی علماء نے اپنی کتابوں میں دور کرنے کی کوشش کی ہے۔ فتح الباری میں بعض اکابر کی طرف منسوب کر کے ایک نہایت بلیغ اور قیمتی جملہ نقل کیا گیا ہے:

من شغلہ عن النفل	جس شخص کو فرض نے نفل سے روک
فھو معذور ومن	دیا وہ معذور ہے اور جس شخص کو نفل
شغلہ النفل عن الفرض	نے فرض سے روک دیا وہ مغرور ہے (یعنی
فھو مغرور۔	دھوکے میں مبتلا ہے)۔

اس جملے کا سادہ مفہوم یہ ہے کہ اگر کوئی شخص فرائض ادا کرنے میں اتنا مشغول رہا کہ نوافل ادا کرنے کا موقع اسے نہ مل سکا تو وہ خدا کے یہاں معذور سمجھا جائے گا۔ کیونکہ خود خدا ہی نے فرائض کو نوافل پر مقدم کیا ہے اور خود اس کو فرائض، نوافل سے زیادہ محبوب ہیں اور اگر کوئی شخص نوافل ادا کرنے میں اتنا مشغول رہا کہ اسے فرائض ادا کرنے کا موقع نہ مل سکا تو ایسا شخص فریب نفس میں مبتلا اور اغوائے شیطانی کا شکار ہے۔ اس

---

[۱] نتائج الافکار ج ۲ ص ۲۰۳

744424

لیے کہ اس نے نوافل کو وہ اہمیت دی جو اللہ تعالیٰ نے انھیں نہیں دی ہے۔ اس کو ایک مثال سے سمجھنا چاہیے۔ فرض کیجیے، زید بیمار ہے اور عمر کے سوا کوئی اس کی دیکھ بھال اور تیمارداری کرنے والا نہیں، اس کی حالت ایسی ہے کہ زیادہ دیر تک اس سے دور نہیں جا سکتا۔ عمر ایسی حالت میں نماز کے نوافل ادا نہیں کرتا بلکہ فرض و واجب کے بعد تمام وقت زید کی خدمت اور دیکھ بھال میں صرف کرتا ہے اس کو اتنی فرصت نہیں ملتی کہ نوافل پڑھ سکے۔ اس مثال میں عمر معذور سمجھا جائے گا۔ کیوں کہ بیمار کی خدمت اس حال میں اس پر فرض تھی۔ اس فرض کی مشغولیت نے اس کو نفل نمازیں ادا کرنے سے روک دیا۔ اس کے برعکس اگر عمر فرائض و واجبات کے بعد نوافل میں بھی مشغول ہو جائے اور مریض کی دیکھ بھال نہ کرے اس کی طرف سے غفلت برتے تو وہ مغرور سمجھا جائے گا۔ اس لیے کہ نفل نے اس کو فرض سے غافل کر دیا۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کو زمین پر اپنا خلیفہ بنایا ہے اور بہت سے فرائض اس پر عائد کیے ہیں۔ ان تمام فرائض کو ادا کرنا اس کی اولین ذمہ داری ہے۔

حدیث کا قابلِ غور ٹکڑا

فرائض و نوافل کا ذکر کرنے کے بعد کہا گیا ہے:

> یہاں تک کہ میں اس کا کان ہو جاتا ہوں جس سے وہ سنتا ہے، اس کی آنکھ ہو جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے۔ (اسی طرح ہاتھ اور پیر کا ذکر ہے۔)

اگر ان الفاظ کے حقیقی معنی مراد لیے جائیں تو اس کا مفہوم یہ ہو گا کہ "اولیاء اللہ" نعوذ باللہ خدا ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ مسلمانوں میں الحاد و بے دینی پھیلانے والے متصوفین نے ان الفاظ کو آڑ بنا کر اور کتاب و سنت کے دیگر تمام نصوص کو پسِ پشت ڈال کر انسان اور خدا کے متحد ہو جانے اور انسان میں خدا کے حلول کر آنے کی گمراہی پھیلانے کی کوشش کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ علمائے حق اور صوفیہ برحق نے اپنی کتابوں میں اس گمراہی کی تردید کی ہے۔ امام غزالیؒ نے احیاء علوم الدین میں لکھا ہے کہ اپنی حد سے تجاوز کرنے والوں نے حدیث کے اس ٹکڑے کو "حلول و اتحاد" کے لیے استعمال کیا ہے۔

عقل ونقل، دونوں اس پر گواہ ہیں کہ حدیث کے اس ٹکڑے میں جو الفاظ استعمال کیے گئے ہیں، ان کے حقیقی معنی مراد نہیں ہیں بلکہ یہ استعارے، کنائے اور تمثیل کی زبان ہے جو صرف اسی حدیث میں نہیں بلکہ دوسری حدیثوں میں بھی استعمال کی گئی ہے۔ دنیا کی تمام ترقی یافتہ قومیں یہ زبان استعمال کرتی ہیں اور خود قرآن میں بھی استعمال کی گئی ہے۔ مثال کے طور پر قرآن کی یہ آیت پڑھیے:

فَلَمْ تَقْتُلُوْهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ قَتَلَهُمْ وَمَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى (الانفال: ۱۷)	تم لوگوں نے ان کو قتل نہیں کیا بلکہ اللہ نے ان کو قتل کیا اور (اے محمدؐ) جس وقت تم کنکریاں پھینکی تھیں تو وہ تم نے نہیں پھینکی تھیں بلکہ اللہ نے پھینکی تھیں۔

یہ غزوۂ بدر کے واقعہ کا ذکر ہے۔ کیا کوئی عقل رکھنے والا آدمی اس آیت کو پڑھ کر سمجھ سکتا ہے کہ خدا سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرامؓ کے جسموں میں حلول کر گیا تھا؟ نہیں، بلکہ یہ استعارے، کنائے اور تمثیل کی زبان ہے اور اس کا مفہوم یہ ہے کہ جس وقت صحابہؓ نے مشرکین کو قتل کیا اور سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے مشرکین کے لشکر پر کنکریاں پھینکیں اس وقت ان سب کو اللہ تعالیٰ کی پوری تائید اور حمایت حاصل تھی اور یہ اسی کی نصرت وحمایت تھی جس نے انہیں جنگ میں کامیاب کیا۔

سورۂ فتح میں فرمایا گیا:

اِنَّ الَّذِيْنَ يُبَايِعُوْنَكَ اِنَّمَا يُبَايِعُوْنَ اللّٰهَ يَدُ اللّٰهِ فَوْقَ اَيْدِيْهِمْ (الفتح: ۱۰)	اے نبی جو لوگ تم سے بیعت کر رہے تھے وہ دراصل اللہ سے بیعت کر رہے تھے ان کے ہاتھ پر اللہ کا ہاتھ تھا۔

اس آیت میں بھی استعارے اور مجاز کی زبان استعمال کی گئی ہے۔ اسی طرح اس حدیث میں جو الفاظ استعمال کیے گئے ہیں ان کا مفہوم یہ ہے کہ جب اللہ کے صالح اور متقی بندے اس کے محبوب ہو جاتے ہیں تو انہیں اللہ کی پوری حمایت وتائید اور نصرت واعانت حاصل ہو جاتی ہے۔ اللہ انہیں اعمال صالح کی توفیق عطا فرماتا ہے اور

ان کا حال یہ ہو جاتا ہے کہ ان کی مرضیات کے تابع ہو جاتی ہیں۔ وہ وہی کچھ سنتے اور دیکھتے ہیں جو اللہ کی پسند ہو، وہ انھیں چیزوں کو ہاتھ لگاتے اور وہیں جاتے ہیں جس کی اجازت اللہ نے دی ہے۔ یہی مفہوم دوسری احادیث، قرآن کی آیات اور اسلامی مسلمات کے بھی مطابق ہے اور اس کا یہی مفہوم علمائے حق اور حق پرست صوفیہ نے بیان کیا ہے۔ رسالہ قشیریہ کے محشی علامہ سید مصطفےٰ عروسی نے لکھا ہے:

> حدیث کے ان الفاظ کا مطلب جیسا کہ اس کے شارح شیخ الاسلام زکریا انصاری نے اشارہ کیا ہے، یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے محبوب بندوں کو خیر کی توفیق دیتا اور ان کے ظاہری و باطنی جوارح و اعضا کی گناہ سے حفاظت کرتا ہے۔ اس مفہوم کے سوا حدیث کے اس ٹکڑے کا جو مفہوم بیان کیا جاتا ہے اس سے تمھیں دھوکا نہ کھانا چاہیے۔[1]

ان کی اس عبارت میں بھی یہ اشارہ موجود ہے کہ غلط قسم کے لوگ اس طرح کی حدیثوں کے غلط معنی و مفہوم بیان کر کے نادانوں کو دھوکہ دیتے ہیں۔ عیسائی اس گمراہی میں مبتلا ہو چکے ہیں کہ انھوں نے انجیل میں استعارہ و تمثیل کی زبان کو غلط طور پر سمجھا۔ یا جان بوجھ کر باپ اور بیٹا جیسے الفاظ کو اس کے حقیقی معنی میں لیا اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خدا کا بیٹا قرار دے بیٹھے اور ان میں کے بعض فرقوں نے جو "حلول و اتحاد" کے قائل تھے ان کو خدا بنا لیا۔ مسلمانوں میں بھی ایسے لوگ گھس آئے جنھوں نے اسلام کو اس کے اندر پہنچ کر ڈائنامیٹ کرنے کے لیے "حلول و اتحاد" کے احمقانہ نظریہ کو پھیلانا شروع کر دیا۔ گمراہ صوفیوں کا یہ فرقہ "اتحادیہ" کے نام سے مشہور ہوا۔ ان کا احمقانہ خیال یہ ہے کہ خدا اور بندے میں کوئی فرق نہیں ہے، یہ دونوں متحد ہیں۔ اس فرقے نے اس حدیث کو بھی اپنے باطل خیال کے لیے استعمال کیا ہے۔ حافظ ابن حجرؒ نے صراحت کے ساتھ لکھا ہے:

---

[1] کنت سمعہ" المعنی کما اشار الیہ الشرح علی حفظ جوارحہ الظاہرۃ والباطنۃ مع التوفیق للخیر فلا تعتبر بغیر ہذا مما یقال فی مثل ذالک (نتائج الافکار القدسیہ ج ۲ ص ۲۳)

کہ "فرقہ اتحادیہ" نے اس حدیث کے الفاظ کو اس کے حقیقی معنی میں لے کر یہ کہا ہے کہ خدا اور بندے میں کوئی فرق نہیں ہے جو خدا ہے وہ عین بندہ ہے اور جو بندہ ہے وہ عین خدا ہے۔ نعوذ باللہ من ذالک[۱]

حدیث کے اس ٹکڑے کا جو مفہوم علمائے حق نے بیان کیا ہے اس میں الفاظ، اندازِ بیان اور تعبیرات کا فرق ہے اور ہونا بھی چاہیے، لیکن نفس مفہوم کے لحاظ سے ان کی توضیحات میں فرق نہیں ہے اور نہ ہو سکتا تھا۔ حافظ ابن حجرؒ نے فتح الباری میں ان سب کو اکٹھا کر دیا ہے۔ اپنے وقت کے مشہور عالم و صوفی علامہ طوفیؒ نے کہا ہے:

"جن علماء کے قول پر اعتماد کیا جاتا ہے وہ سب اس پر متفق ہیں کہ حدیث کے یہ الفاظ بطور مجاز و کنایہ استعمال ہوئے ہیں اور ان کا مطلب یہ ہے کہ محبوب بندے کو اللہ کی ایسی تائید، نصرت اور اعانت حاصل ہوتی ہے جیسے انسان کے یہ اعضاء و جوارح ——— کان، آنکھ، ہاتھ پاؤں ——— اس کے معاون و مددگار ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بعض روایات میں فبی یسمع وبی یبصر وبی یبطش وبی یمشی کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ یعنی وہ میرے ذریعہ سنتا ہے اور دیکھتا ہے اور میرے ذریعہ کسی چیز کو گرفت میں لیتا ہے اور چلتا ہے[۲]

یہ الفاظ درحقیقت ارحم الراحمین اور اکرم الاکرمین خدا کی طرف سے اپنے صالح اور فرماں بردار بندوں کی قدردانی اور عزت افزائی کا ایسا اظہار ہے جس کو سن کر وہ اپنے مالک کے دامنِ رحمت کو اور مضبوطی سے تھام لیتے اور اس کی اطاعت میں پہلے سے زیادہ سرگرم ہو جاتے ہیں ——— اسی سے ملتا جلتا مفہوم مشہور شارح حدیث اور محدث

---

[۱] والاتحادیۃ زعموا علی حقیقۃ وقالوا الحق عین العبد تعالی اللہ عما یقول الظالمون علوا کبیرا۔ (فتح الباری ج ۱۱)

[۲] فتح الباری ج ۱۱

خطابیؒ نے بیان کیا ہے :

یہ الفاظ مثال ہیں اور ان کا مطلب یہ ہے کہ بندہ اپنے ان اعضاء سے جو اعمالِ خیر انجام دیتا ہے اس میں اللہ کی دی ہوئی توفیق شامل ہوتی ہے وہ اعمال کو اس کے لیے محبوب بناتا ہے اور اس کی انجام دہی میں اپنے بندے کو سہولت عطا فرماتا ہے[1]

ولی اللہ کی دعا اور سوال

اس کے بعد حدیث میں کہا گیا ہے :

"اگر وہ مجھ سے مانگے تو میں ضرور اس کو دوں گا اور اگر مجھ سے پناہ طلب کرے گا تو میں ضرور اسے پناہ دوں گا۔"

اس ٹکڑے نے "حلول واتحاد" کی احمقانہ بات کہنے والوں کی پوری تردید کر دی ہے اس نے بتایا کہ بندہ اس مقام بلند تک پہنچنے کے بعد بھی بندہ ہی رہتا ہے اس میں خدائی کا کوئی شائبہ بھی پیدا نہیں ہوتا۔ وہ اب بھی اپنی اصل فطرت کے مطابق محتاج اور کم زور رہتا ہے۔ وہ نہ دعا و سوال سے بے نیاز ہوتا ہے اور نہ اتنا زور آور ہو جاتا ہے کہ اسے اپنے دشمنوں کے مقابلے میں اللہ کی پناہ طلب کرنے کی ضرورت باقی نہ رہے بلکہ مومن جس قدر اللہ سے قریب ہو جاتا ہے اسی قدر اس کے تواضع اور انکسار میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ اسی لیے بخاری شریف کے بعض نسخوں میں یہ حدیث باب التواضع میں درج کی گئی ہے۔

حدیث کا آخری ٹکڑا

اس حدیث کے آخری ٹکڑے نے "اتحاد وحلول" کے احمقانہ نظریہ کی جڑ ہی کاٹ دی ہے۔

"مجھے اپنے بندۂ مومن کی روح قبض کرنے میں جو تردد ہوتا ہے، وہ دوسری کسی چیز میں نہیں ہوتا، کیوں کہ وہ موت کو ناپسند کرتا ہے اور میں اس کی ناگواری کو ناپسند کرتا ہوں۔"

یہ ٹکڑا خدا اور بندے کے دو مستقل علیحدہ وجود ہونے کی ناقابلِ انکار دلیل ہے۔ اس

---

[1] فتح الباری ج ۱۱

کا حاصل یہ ہے کہ بندہ اللہ سے بے حد قریب ہو جانے اور اس کا محبوب ہو جانے کے باوجود موت سے بچ نہیں سکتا۔ لازمی ہے کہ وہ موت کا مزہ چکھے، خواہ طبعی طور پر موت اسے کتنی ہی ناگوار کیوں نہ ہو۔ یہی بات اللہ تعالیٰ نے انتہائی مشفقانہ انداز میں ظاہر فرمائی ہے۔ اس میں "تردد" کا جو لفظ ہے اس کا بھی حقیقی معنی مراد نہیں ہے بلکہ یہ لفظ شفقت وعنایت کے اظہار کے لیے استعمال کیا گیا ہے۔ جس طرح "محبت" اور غضب کے الفاظ اللہ کے لیے استعمال کیے جاتے ہیں۔

الاستاذ مصطفیٰ عروسی لکھتے ہیں:

> "تردد" کے لفظ سے مراد اس بندۂ محبوب کے لیے اللہ کی عنایت ورعایت کا اظہار ہے۔ کیوں کہ عبادت کا ظاہری مفہوم اللہ تعالیٰ کے حق میں محال ہے۔[1]

ایک شبہ اور اس کا جواب

کوئی پوچھنے والا یہ پوچھ سکتا ہے کہ قرآن اور احادیث میں مجاز اور کنائے کے طور پر ایسے الفاظ استعمال ہی کیوں کیے گئے جن سے انسان دھوکہ کھا سکتا ہے؟ اس سوال کے کئی جواب ہیں۔

پہلا جواب یہ ہے کہ اگر قرآن اور احادیث میں اس طرح کے "متشابہات" نہ ہوتے تو انسان کی عقل وفہم کی آزمائش ادھوری رہ جاتی۔

دوسرا جواب یہ کہ اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات کی حقیقتیں انسانی عقل وفہم سے بہت بلند ہیں لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی ضروری تھا کہ انسان کو ان حقیقتوں کا اجمالی اور قابل فہم تصور دیا جاتا۔ اس لیے خود اس کی زبان اور اس کے الفاظ میں باتیں کہی گئی ہیں تاکہ انھیں سمجھ کر وہ اپنے خالق ومالک کی طرف دوڑ سکے۔ اس سے قریب ہو سکے۔ اور اس کی شفقت وعنایت کا مستحق بن سکے۔ اسی کے ساتھ ساتھ اس کی سزا، اس کے عذاب اور اس کی ناراضی سے دور بھاگ سکے۔ دنیا کی زندگی آزمائشی زندگی ہے۔ اگر یہیں تمام حقیقتیں واشگاف کر دی جاتیں تو پھر آزمائش کس چیز میں ہوتی۔

---

[1] نتائج الافکار القدسیہ ج ۲ ص ۲۰۳

اس سوال کا تیسرا جواب یہ ہے کہ دنیا کی تمام ترقی یافتہ زبانوں میں مجاز، استعارے کنائے اور تمثیل کا استعمال عام ہے۔ اگر ان سب کو خارج کر دیا جائے تو پھر گہرے معانی کا ادراک اور ان کا سمجھنا، سمجھانا محال ہو جائے۔ دوسری طرف زبان کی لطافت و بلاغت ختم ہو جائے۔ اس شبہے کا چوتھا جواب ہے کہ اس طرح کے مجاز سے، جس کا نمونہ یہ حدیث ہے، فی الواقع کوئی عاقل دھوکا نہیں کھاتا، بلکہ جان بوجھ کر لوگ اپنے غلط مقاصد حاصل کرنے کے لیے سادہ لوح لوگوں کو دھوکا دیتے ہیں۔

حاصلِ بحث

اس حدیث کی توضیح و تفصیل سے بھی معلوم ہوا کہ "اولیاء اللہ" ماورائے بشریت مخلوق نہیں ہیں بلکہ اللہ کے جو بندے اس کی معرفت رکھنے والے، اس کی ہمہ جہتی اطاعت میں سرگرم رہنے والے اور صالح اور متقی ہیں وہی "اولیاء اللہ" ہیں۔ علامہ ابن حجرؒ نے بھی اس حدیث کی شرح میں "ولی اللہ" کی یہی تعریف کی ہے۔

المراد بولی اللہ، العالم باللہ المواظب علی طاعتہ المخلص فی عبادتہ[1]	"ولی اللہ" سے مراد وہ شخص ہے جو اللہ کا علم رکھنے والا، اس کی اطاعت پر مداومت کرنے والا اور اس کی عبادت میں اخلاص برتنے والا ہو۔

اس حدیث کے بارے میں علامہ صوفی نے بڑی اچھی بات لکھی ہے، میں اسی پر اپنی تشریح ختم کرتا ہوں:

یہ حدیث سلوک الی اللہ کی ایک بڑی اصل اور دلیل ہے۔ اس میں اللہ کی معرفت و محبت تک پہنچنے کے طریقے بتائے گئے ہیں، یہ حدیث ان چیزوں پر مشتمل ہے جو حدیث جبرئیل میں موجود ہیں۔ یعنی ایمان، اسلام اور احسان۔ اور احسان میں سالکین الی اللہ کے بہت سے مقامات مندرج ہیں، جیسے زہد، اخلاص، مراقبہ اور دوسرے مقامات۔[2]

---

[1] فتح الباری ج ۱۱

[2] ایضاً

حدیث جبرئیل سے اشارہ اس حدیث کی طرف ہے جس میں کہا گیا ہے، حضرت جبرئیل انسانی شکل میں تشریف لائے تھے اور انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایمان، اسلام اور احسان کے بارے میں سوالات کر کے جوابات حاصل کیے تھے اور مقصد صحابہ کرام رضؓ کو تعلیم دینا تھا۔

اولیاء اللہ ہی حزب اللہ ہیں

قرآن کریم میں جن لوگوں کو اولیاء اللہ کہا گیا ہے انہیں کے لیے "حزب اللہ" کی اصطلاح بھی استعمال کی گئی ہے اور ان کے مقابلہ میں جن لوگوں کو اولیاء الشیطان کہا گیا ہے فَقَاتِلُوٓا اَوْلِيَآءَ الشَّيْطٰنِ[1] انہیں کے لیے حزب الشیطان کی اصطلاح استعمال کی گئی ہے۔ اُولٰٓئِكَ حِزْبُ الشَّيْطٰنِ[2]۔

جیسا کہ معلوم ہو چکا کہ سورہ یونس کی آیات ۶۲ یا ۶۴ میں اولیاء اللہ کی تعریف و تعیین بھی کی گئی ہے اور ان کا دنیوی و اخروی اجر بھی بیان کیا گیا ہے۔ ان کی صفات کو "ایمان" اور "تقویٰ" کے وسیع اور جامع الفاظ میں جمع کر دیا گیا ہے۔ ان لوگوں کے لیے "حزب اللہ" کی اصطلاح سورہ المائدہ اور المجادلہ میں استعمال کی گئی ہے۔

(سورہ المائدہ)

المائدہ میں کہا گیا ہے:

وَمَنْ يَّتَوَلَّ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فَاِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْغٰلِبُوْنَ ۝ (المائدہ: ۵۶)

اور جو شخص اللہ اور اس کے رسول اور مومنوں سے دوستی کرے گا (وہ خدا کی جماعت میں داخل ہوگا اور) خدا کی جماعت ہی غلبہ پانے والی ہے۔

سورۃ المجادلہ کی آخری آیت میں فرمایا گیا ہے:

"جو لوگ خدا پر اور روز قیامت پر ایمان رکھتے ہیں تم ان کو

---

[1] لہٰذا تم شیطان کے دوستوں سے لڑو ..... النساء: ۷۶

[2] یہی لوگ شیطان کا لشکر ہیں۔ المجادلۃ: ۱۹

خدا اور اس کے رسولؐ کے دشمنوں سے دوستی کرتے ہوئے نہ دیکھو گے خواہ وہ ان کے باپ یا بیٹے یا بھائی یا خاندان ہی کے لوگ ہوں۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کے دلوں میں خدا نے ایمان (پتھر پر لکیر کی طرح) تحریر کر دیا ہے اور فیض غیبی سے ان کی مدد کی ہے اور وہ ان کو بہشتوں میں جن کے نیچے نہریں بہ رہی ہیں، داخل کرے گا ہمیشہ ان میں رہیں گے، یہی گروہ خدا کا ہے۔ سن رکھو کہ خدا ہی کا لشکر مراد حاصل کرنے والا ہے۔" (المجادلہ: ۲۲)

یہ ہے اولیاء اللہ اور حزب اللہ کی وہ نمایاں صفت اور خصوصیت جس کے بغیر کسی کا مومن و مسلم ہونا بھی محلِ نظر ہے چہ جائیکہ اس کو ولایت خاصّہ کا درجہ حاصل ہو۔"

دعائے قنوتِ نازلہ کا ایک ٹکڑا یہ ہے: وَالَّذِیْنَ یُقَاتِلُوْنَ اَوْلِیَاءَکَ (اے اللہ ان دشمنانِ حق پر اپنی لعنت برسا جو تیرے دوستوں سے جنگ کرتے ہیں) اس ٹکڑے میں بھی "اولیاء" حزب اللہ ہی کے معنی میں استعمال کیا گیا ہے۔

اولیاء اللہ کے درجات

اب یہ بھی دیکھ لیں کہ درجات کے اعتبار سے اولیاء اللہ کی تقسیم کیا ہے؟ قرآن کریم میں اللہ و رسول کے فرمانبردار مومنوں کے لیے کئی تعبیریں اختیار کی گئی ہیں۔ اس گروہ کو مجرمین کے گروہ سے علیحدہ کرنے کے لیے اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ کا صیغہ استعمال کیا گیا ہے۔ اسی اجمال میں درجات کی ساری تفصیل بند ہے۔ اس میں ادنیٰ درجہ کے نیکوکار مسلمان بھی داخل ہیں اور اعلیٰ درجہ کے مومنین متقین بھی ——— اسی صیغہ کے لیے کہیں اولیاء اللہ کہیں حزب اللہ، اصحاب الجنّۃ کی تعبیریں بھی اختیار کی گئی ہیں۔ مومنین صالحین کی اصلاً دو قسمیں بیان کی گئی ہیں۔ مقربین اور ابرار۔ مقربین کی تعبیر کہیں السابقون الاوّلون اور کہیں سابقون بالخیرات سے بھی کی گئی ہے۔ اسی طرح ابرار کو اصحاب الیمین اور مقتصد کے الفاظ سے بھی یاد کیا گیا ہے۔ ان دو قسموں کی صفات اور آخرت میں ان کی جزا کا علم حاصل کرنے کے لیے، فاطر، واقعہ، دہر اور مطففین کی سورتیں پڑھنی چاہییں۔ اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ہی کی ایک اور تقسیم قرآن میں ملتی ہے۔ انبیاء

صدیقین، شہداء، صالحین کی، لیکن یہ چار قسمیں بھی انہیں دو قسموں میں داخل ہیں۔ اللہ کی کتاب نے مقربین وابرار کی صفات وخصوصیات کو پوری تفصیل سے بیان کیا ہے۔ اس لیے اولیاء اللہ کی صفات وخصوصیات اور ان کے مرتبہ ومقام کو جاننے کے لیے قرآن بالکل کافی ہے اور نہ صرف یہ کہ بالکل کافی ہے بلکہ وہی آخری سند بھی ہے اور وہی کامل معیار بھی ہے۔ جس کے پاس قرآن کی سند نہیں اور جو اس کے معیار پر کھرا نہیں وہ کچھ اور ہو تو ہو، اللہ کا ولی نہیں ہے۔

ولایت خاصہ کے لیے بے دلیل شرطیں

اب ہم یہ دیکھ لینا چاہتے ہیں کہ عام طور پر تصوف کی کتابوں میں اولیاء اللہ کے متعلق کیا لکھا گیا ہے اور ان کے متعلق عام وخواص (اِلّا ما شاء اللہ) کے ذہنوں میں کیا تصورات پائے جاتے ہیں ـــ رسالہ قشیریہ میں لکھا ہے:

• ولی کے دو معنی ہیں۔ ایک تو یہ کہ وہ معناً مفعول ہے اور یہ وہ شخص ہے جس کے معاملہ کی نگرانی اللہ تعالیٰ کرتا ہے۔ جیسا کہ اس نے خود کہا ہے۔ وَهُوَ يَتَوَلَّى الصَّالِحِينَ پس وہ اس شخص کو ایک لحظہ کے لیے بھی اس کے نفس کے سپرد نہیں کرتا بلکہ حق سبحانہٗ خود ہی اس کی نگرانی کرتا رہتا ہے اور ولی کا دوسرا معنی یہ ہے کہ وہ اسم فاعل کا مبالغہ ہے اور یہ وہ شخص ہے جو اللہ کی عبادت واطاعت پر قائم رہتا ہے۔ پس اس کی عبادت مسلسل جاری رہتی ہے۔ اس کے بغیر کہ درمیان میں اس سے معصیت کا صدور ہو اور ولی ہونے کے لیے دونوں وصف ضروری ہیں۔ ولی پر واجب ہے کہ اللہ کے حقوق تمام وکمال بغیر کسی کمی کے ادا کرتا رہے اور ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیشہ سختی و نرمی، آرام ومصیبت میں اس کی حفاظت کرتا رہے[1]

---

[1] الولی له معنیان احدهما فعیل بمعنی مفعول وهوالذی یتولی سبحانه امره قال اللہ تعالی وهو یتولی الصالحین فلا یکله الی نفسه لحظة بل یتولی الحق سبحانه رعایته والثانی فعیل ــــ

امام ابوالقاسم قشیری رحمۃ اللہ علیہ نے ولی کے لیے دو باتیں ضروری قرار دی ہیں :

۱۔ اللہ تعالیٰ ایک لحظہ کے لیے بھی اس کو اس کے نفس کے حوالہ نہ کرے بلکہ ہمیشہ اس کی حفاظت کرتا رہے۔

۲۔ اس کی عبادت و اطاعت اس درجہ مسلسل ہو کہ درمیان میں کسی معصیت کا ارتکاب نہ ہو۔

دوسری بات پہلی بات کا لازمی نتیجہ ہے۔ جب اللہ کسی کو ایک لحظہ کے لیے بھی اس کے نفس کے حوالہ نہ کرے تو معصیت کا ارتکاب ہو گا ہی کیسے۔

انھوں نے "ولی" کے لیے جو دو باتیں ضروری قرار دی ہیں انہیں پڑھ کر سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر نبی اور ولی میں فرق کیا رہا۔ بلکہ یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ کیا ولی کا درجہ نبی سے بھی اونچا ہوتا ہے؟ بہر حال، اس سوال سے قطع نظر کر کے دیکھیے کہ انھوں نے اتنی بڑی بات کے لیے دلیل کیا دی ہے؟ بطور دلیل انھوں نے قرآن کا جو ٹکڑا نقل کیا ہے وہ سورۃ الاعراف کی آیت ۱۹۶ کا ہے۔ وہ پوری آیت یہ ہے :

اِنَّ وَلِیَّ اللّٰہُ الَّذِیْ نَزَّلَ	میرا مددگار تو اللہ ہے جس نے کتاب
الْکِتٰبَ وَھُوَ یَتَوَلَّی	(برحق) نازل کی اور نیک لوگوں کا وہی مددگار
الصّٰلِحِیْنَ ۝	ہے۔

اس آیت سے پہلے آیت ۱۹۵ کا ترجمہ یہ ہے :

"کہہ دو کہ اپنے شریکوں کو بلالو اور میرے بارے میں جو تدبیریں کرنی ہوں کر لو اور مجھے کچھ بھی مہلت نہ دو۔ پھر دیکھو کہ وہ میرا کیا کر سکتے ہیں۔"

ــ مبالغۃ من الفاعل وھو الذی یتولی عبادۃ اللہ وطاعتہ فعبادتہ تجری علی التولی من غیران یتخللھا عصیان وکلا الوصفین واجب حتی یکون الولی ولیا یجب قیامہ بحقوق اللہ علی الاستقصاء والاستیفاء ودوام حفظ اللہ تعالیٰ ایاہ فی السراء والضراء۔ (رسالۃ قشیریہ)

اور اس کے بعد کی آیت ۱۹۷ کا ترجمہ یہ ہے :

"اور جن کو تم خدا کے سوا پکارتے ہو وہ نہ تمھاری ہی مدد کی طاقت رکھتے ہیں اور نہ خود اپنی ہی مدد کر سکتے ہیں۔"

اس سے صاف ظاہر ہے کہ آیت ۱۹۶ میں مشرکین کی دھمکی کا جواب دیا گیا ہے۔ ان کا خیال یہ تھا کہ جن بتوں کو وہ پوجتے ہیں ان میں بڑی طاقت ہے۔ وہ جس سے خوش ہو جائیں اس کی تقدیر بنا دیں اور جس سے ناراض ہو جائیں اس کو تباہ و برباد کر دیں۔ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دھمکی دیتے تھے کہ اگر تم نے ہمارے بتوں کے خلاف اپنی زبان بند نہ کی تو وہ تمھیں تباہ و برباد کر دیں گے۔ اس دھمکی کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولؐ کو حکم دیا کہ ان سے کہہ دو کہ تم اپنے تمام شرکاء کو بلالو اور میرے خلاف جو سازش بھی تمھیں کرنی ہو کر گزرو، مجھے ذرا بھی مہلت نہ دو اور پھر دیکھو کہ تمھارے بت اور دوسرے شرکاء میرا کیا بگاڑ سکتے ہیں۔ میرا حامی و ناصر تو وہ خدا ہے جس نے یہ کتابِ برحق نازل کی ہے اور جس کا پیغام سنانے ہی کی وجہ سے تم مجھے دھمکی دے رہے ہو اور وہ خدا صرف میرا نہیں بلکہ اپنے تمام صالح بندوں کا حامی و ناصر ہے۔ باقی رہے تمہارے بت تو وہ بے چارے خود اپنی مدد نہیں کر سکتے۔ تمھاری مدد کیا کریں گے۔

اب غور کرنا چاہیے کہ وَهُوَ يَتَوَلَّى الصَّالِحِينَ سے وہ مفہوم اخذ کرنا جو امام قشیریؒ نے اخذ کیا ہے کسی طرح بھی صحیح ہے؟ بات یہ کہی جا رہی ہے کہ کفار و مشرکین کی دھمکی کے مقابلے میں پیغمبروں اور صالح بندوں کا حامی و ناصر خدا ہے اور امام قشیریؒ کہتے ہیں کہ اللہ اپنے "ولی" کو ایک لحظہ کے لیے بھی اس کے نفس کے حوالہ نہیں کرتا اور وہ گناہوں سے بالکل معصوم و محفوظ ہو جاتا ہے۔ بلا شبہ یہ ایک بے ربط اور انمول بے جوڑ استدلال ہے جو انھوں نے کیا ہے۔ اس کے علاوہ قرآن میں تو وَهُوَ يَتَوَلَّى الصَّالِحِينَ کہا گیا ہے یہ اولیائے خاص کی بات کہاں سے آگئی؟ اگر وہ اس ٹکڑے سے یہ استدلال کرتے کہ اللہ کے تمام صالح بندے گناہوں سے معصوم و محفوظ ہوتے ہیں کیوں کہ اللہ ان کا نگراں ہوتا ہے تو کم سے کم تھوڑی سی لفظی مناسبت باقی رہتی۔ انھوں نے جو استدلال کیا ہے اس میں تو کوئی لفظی

مناسبت بھی موجود نہیں ہے۔

ولی کے بارے میں دوسری بات جو انھوں نے کہی ہے، اس کی تردید قرآن سے تو ہوتی ہی ہے، خود رسالہ قشیریہ کے شارح شیخ الاسلام زکریا انصاری نے ولی کے محفوظ ہونے کا جو مفہوم بیان کیا ہے وہ امام قشیریؒ کے خلاف ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"ولی کے محفوظ ہونے کی مراد یہ ہے کہ اگر کسی ولی سے گناہ اور خطا کا ارتکاب ہو جائے تو اللہ تعالیٰ اس کو معصیت پر اصرار کرنے اور اس میں بڑھتے چلے جانے سے محفوظ رکھتا ہے، اس طرح کہ اسے توبہ کی توفیق عطا فرما دیتا ہے، ورنہ گناہ اور خطا اس کی ولایت میں عیب و نقص پیدا نہیں کرتے۔" [1]

شیخ الاسلام نے جو کچھ کہا ہے اس کی تصدیق قرآن سے ہوتی ہے۔ یہ بحث پہلے گزر چکی ہے کہ اللہ کے اولیا، خاص مومنین متقین ہی ہیں لیکن تقویٰ کے لیے یہ لازمی شرط نہیں ہے کہ کبھی معصیت کا صدور نہ ہو۔ متقین کی صفات بیان کرتے ہوئے ایک جگہ فرمایا گیا ہے:

وَالَّذِينَ إِذَا فَعَلُوا فَاحِشَةً أَوْ ظَلَمُوا أَنفُسَهُمْ ذَكَرُوا اللَّهَ فَاسْتَغْفَرُوا لِذُنُوبِهِمْ وَمَن يَغْفِرُ الذُّنُوبَ إِلَّا اللَّهُ ۔ وَلَمْ يُصِرُّوا عَلَىٰ مَا فَعَلُوا وَهُمْ يَعْلَمُونَ ○ أُولَٰئِكَ جَزَاؤُهُم مَّغْفِرَةٌ مِّن رَّبِّهِمْ وَجَنَّاتٌ تَجْرِي

اور جن کا حال یہ ہے کہ اگر کبھی کوئی فحش کام ان سے سرزد ہو جاتا ہے یا کسی گناہ کا ارتکاب کر کے وہ اپنے اوپر ظلم کر بیٹھتے ہیں تو معاً انہیں اللہ یاد آجاتا ہے اور اس سے اپنے قصوروں کی معافی چاہتے ہیں۔ کیوں کہ اللہ کے سوا اور کون ہے جو گناہ معاف کر سکتا ہے اور دیدہ و دانستہ اپنے کیے پر اصرار نہیں کرتے، ایسے لوگوں کی جزا ان کے رب کے پاس یہ ہے کہ وہ ان کو معاف کر دے گا اور ایسے باغوں میں

---

[1] والمراد بکون الولی محفوظا ان یحفظه الله من تمادیه فی الزلل والخطاء ان وقع فیها بان یلهمه التوبة والا فهما لا یقدحان فی ولایته۔ (شرح رسالہ قشیریہ ج ۳ ص ۲۱۱)

مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْهَا وَنِعْمَ اَجْرُ الْعٰمِلِیْنَ ۝ (آل عمران: ۱۳۵-۱۳۶)

داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی اور وہاں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ کیا اچھا بدلہ ہے نیک عمل کرنے والوں کے لیے۔"

اللہ کے ولی اور غیر ولی میں یہ فرق نہیں ہے کہ ولی سے کبھی معصیت کا ارتکاب نہ ہو بلکہ یہ ہے کہ نادانی سے اگر کبھی ارتکاب ہو جائے تو اللہ کا ولی اپنی اس حرکت سے لرز اٹھتا ہے۔ اس کا دل کانپ جاتا ہے اور اس کی آنکھیں بہہ پڑتی ہیں اور پیشانی ندامت کے پسینے سے تر ہو جاتی ہے، وہ اللہ کی بارگاہ میں گڑگڑا کر اپنی خطا کی معافی چاہتا ہے اور اطاعت و فرماں برداری کی طرف پلٹ پڑتا ہے اور پھر توبہ و ندامت اس کے گناہ کے دھبے دھو ڈالتی ہے۔ وہ اللہ کی ولایت اور تقویٰ سے خارج نہیں ہوتا بلکہ توبہ و ندامت، عجز و نیاز اور تضرع و زاری کا خلوص کبھی اس کو اس درجہ سے بھی بلند کر دیتا ہے جہاں وہ اس سے پہلے تھا۔ صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین سے بڑھ کر اللہ کا ولی کون ہو سکتا ہے لیکن ارتکابِ معصیت کی مثالیں وہاں بھی ملتی ہیں۔ کیا اس سے ان کی ولایت خاصہ میں کوئی فرق واقع ہوا ہے؟ کتاب و سنت اور سیر صحابہؓ سے ہٹ کر اولیاء اللہ کے بارے میں جو خیالات قائم کر لیے گئے ہیں وہ صحیح نہیں ہیں۔ اولیاء اللہ کے بارے میں بہت سے عوام و خواص نے جو باتیں لازم قرار دے رکھی ہیں وہ یہ ہیں:

پہلا غلط خیال

اس سلسلے میں سب سے پہلا غلط خیال یہ پیدا ہوا کہ اولیاء اللہ کا ایک خاص طبقہ بنا لیا گیا اور "اولیاء اللہ" کی اصطلاح اسی طبقے کے لیے مخصوص کر دی گئی۔ اب اولیاء اللہ کا لفظ جب بولا جاتا ہے تو عام طور ذہن حضرت معروف کرخی، حضرت سری سقطی، حضرت جنید بغدادی، حضرت عبدالقادر جیلانی، حضرت خواجہ معین الدین چشتی رحمہم اللہ اور اسی طرح طبقہ صوفیہ کے دوسرے بزرگانِ دین کی طرف جاتا ہے اور انہیں کو "اولیاء اللہ" سمجھا جاتا ہے۔ باقی رہے وہ لوگ جو اس طبقے میں داخل نہیں ہیں وہ اپنی جگہ خواہ کتنے ہی متقی مومن ہوں اور چاہے کتنے ہی متبع سنت ہوں، انہیں اولیاء اللہ میں شمار نہیں کیا جاتا اور نہ عام طور پر کوئی شخص "اللہ کا ولی" سمجھتا ہے اور جہاں کوئی مجبوری پیش آئے تو کھینچ تان کر اس شخص کو اس طبقے میں

داخل کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اس کی ایک مثال یہ ہے کہ متاخرین صوفیہ نے تصوف کی جو کتابیں لکھی ہیں ان میں صوفیہ اور اولیار کے گروہ میں ائمہ اربعہ۔ امام ابوحنیفہ، امام مالک، امام شافعی، امام احمد رحمہم اللہ کو بھی داخل کیا ہے لیکن اب بھی یہ بات صرف چند کتابوں ہی تک ہے۔ عوام کے سامنے اولیار اللہ کا ذکر کیا جاتا ہے تو ان کا ذہن امام ابوحنیفہؒ اور امام شافعیؒ کی طرف کبھی نہیں جاتا۔

دوسرا غلط خیال دوسرا غلط خیال یہ قائم کرلیا گیا کہ "تقویٰ" کا حصول بجز ان طریقوں کے ممکن نہیں جو صوفیہ کرام نے تجویز کیے ہیں۔ حالاں کہ کتاب و سنت کے لحاظ سے یہ تخصیص صحیح نہیں ہے۔ سوال یہ ہے کہ یہ تخصیص کیوں پیدا ہوئی؟

جواب یہ ہے کہ یہ تخصیص اس لیے پیدا ہوئی کہ "اولیار اللہ" کی خصوصیات وصفات میں صرف وہ باتیں کافی نہیں رہیں جو قرآن میں بیان کی گئی ہیں بلکہ "ولی" کے لیے کشف، الہام ذوق اور وجد، بیعت وارشاد، زاویہ وخانقاہ اور اسی طرح کی دوسری خصوصیات بھی بڑھادی گئیں۔ چنانچہ اولیار کے لیے اہل کشف ومکاشفہ کی ایک اصطلاح وضع کرلی گئی۔ ان لوگوں کو "اہلِ وصال" اور دوسروں کو "اہل استدلال" قرار دیا گیا۔ اولیا اصحابِ مشاہدہ ومعاینہ اور دوسرے لوگ اصحابِ نقل واثر سمجھے گئے۔ امام ابوالقاسم قشیری مذہب صوفیہ اور طریقۂ صوفیہ کے علاوہ کسی دوسرے مذہب وطریقہ کی طرف صوفی کے انتساب کو غلط ثابت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> "دوسرے لوگ یا تو اصحاب نقل واثر (محدثین، علماء وفقہاء) ہیں یا اربابِ عقل وفکر (فلاسفہ ومتکلمین) لیکن اس گروہ (صوفیہ) کے شیوخ نقل واثر اور عقل وفکر سب سے بلند ہوچکے ہیں۔ لہٰذا جو شے دوسروں کے لیے غیب ہے وہ ان کے لیے ظہور ہے اور جو علم ومعرفت دوسروں کے لیے مقصود ہیں وہ حق سبحانہٗ کی طرف سے ان کے پاس موجود ہیں۔ پس یہ لوگ "اہلِ وصال" ہیں اور دوسرے لوگ "اہلِ استدلال" — یہ لوگ شاعر کے اس قول کے مصداق ہیں:

"میری رات تیرے چہرے کے نور سے روشن ہے
حالانکہ اس کی تاریکی دوسرے لوگوں میں جاری و
ساری ہے لہٰذا دوسرے لوگ تاریکیوں کے
اندر اور ہم دن کی روشنی میں ہیں۔" [1]

یہی بات علامہ شعرانیؒ نے الطبقات الکبریٰ کے مقدمہ میں زیادہ وضاحت سے لکھی ہے۔ وہ لکھتے ہیں :-

"میرے بھائی، تمھیں جاننا چاہیے کہ مقام علم کے لحاظ سے ہم لوگوں کے نزدیک کوئی انسان اس وقت تک کامل نہیں ہوتا جب تک اس کا علم براہ راست، بلا واسطہ اللہ سے ماخوذ نہ ہو اور مخلوق محدث سے اخذ و استفادہ اہل اللہ کے نزدیک معیوب و معلول ہے۔ میرے بھائی! اگر تم اہل اللہ میں سے کسی شخص سے سلوک طے کر لو تو وہ تمھیں بارگاہِ حق تک پہنچا دے گا۔ پھر تو تم تمام امور کا علم، بلا محنت و مشقت بطریقِ الہام حاصل کرنے لگو گے جیسا کہ خضر علیہ السلام نے حاصل کیا تھا۔ لہٰذا حقیقت یہ ہے کہ علم وہی ہے جو بطریق کشف و شہود ہو۔" [2]

یہ نہ دیکھیے کہ یہی علامہ شعرانیؒ پہلے کیا کہہ چکے ہیں اور اب کیا کہہ رہے ہیں۔ اس لیے کہ تضاد و تناقض کتبِ تصوف کے لوازم میں داخل ہیں۔ علامہ شعرانی ہی نے حضرت ابویزید بسطامی قدس سرہٗ کا یہ قول بھی نقل کیا ہے۔

"شیخ کامل ابویزید بسطامی رضی اللہ عنہ اپنے زمانے کے علماء سے

---

[1] والناس اما اصحاب النقل والاثر واما ارباب العقل والفکر وشیوخ هذه الطائفة ارتقوا عن هذه الجملة فالذی للناس غیب فهو لهم ظهور والذی للخلق من المعارف مقصود فلهم من الحق سبحانه موجود فهم من اهل الوصال والناس اهل الاستدلال وهم کما قال القائل :

لیلی بوجهك مشرق — وظلامه فی الناس ساری
فالناس فی سدف الظلام — ونحن فی ضوء النهار

[2] الطبقات الکبریٰ ج ۱ ص ۵

کہا کرتے تھے کہ تم نے علمائے ظاہر سے اپنا علم حاصل کیا ہے۔ یعنی مُردوں نے مُردوں سے علم حاصل کیا اور ہم نے اپنا علم اس زندۂ جاوید سے حاصل کیا ہے جس کے لیے موت نہیں ہے۔[1]"

معلوم نہیں، اس قول کا انتساب ان کی طرف صحیح بھی ہے یا نہیں؟ اگر صحیح ہے تو پھر اس قول کی چوٹ کہاں کہاں پڑتی ہے۔ اس کی تفصیل کیا کی جائے۔ بات الہام تک ختم نہیں ہوئی بلکہ اولیاء کے متعلق یہ بھی تصور کیا گیا کہ ان کی نظر سے لوحِ محفوظ بھی محفوظ نہیں، بلکہ وہ لوحِ محفوظ میں دیکھ کر فیصلے کرتے اور خبر دیتے ہیں۔ اس طرح کے واقعات جاننے کے لیے "نفحات الانس" پڑھنی چاہیے۔

اولیاء کے متعلق جب یہ سب کچھ مان لیا گیا تو اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلنا تھا کہ انہیں معصوم مانا جائے۔ انبیاء سے فرق پیدا کرنے کے لیے اولیاء کے لیے "محفوظ" کی اصطلاح وضع کی گئی، لیکن عملاً ان دونوں میں کوئی فرق باقی نہیں رہا۔ حضرت مولانا شاہ اسمٰعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ صراطِ مستقیم میں صدیقین کے مقامات و مراتب کی توضیح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"پس یقیناً اس کو انبیاء کے مثل محافظت سے، جس کا نام عصمت ہے، فائز کرتے ہیں۔"[2]

اس غلط خیال نے انسان کو ایک چکر میں پھنسا دیا ہے۔ جس شخص کو "ولی" تسلیم کیا جاتا ہے اس سے اگر کسی ایسی بات کا یا کسی ایسے کام کا صدور ہوا ہو جو شرعاً جائز نہیں ہے تو دو باتیں لازم آئیں گی "ولی" نہ رہے یا یہ کہ پھر وہ قول و فعل جائز تسلیم کیا جائے۔ عقیدت نے عموماً دوسرے پہلو کو اختیار کیا ہے اور ایسے اقوال و افعال کی تاویلات کا ایک انبار ہمارے سامنے ہے۔

---

[1] کان الشیخ الکامل ابو یزید البسطامی یقول لعلماء عصرہ اخذتم علمکم من علماء الرسوم میتاً عن میت واخذنا علمنا من الحی الذی لا یموت (الطبقات الکبریٰ ج ۱، ص ۵)

[2] پس الابدال را بہ محافظتے مثل محافظت انبیاء کہ مسمی بہ عصمت است، فائز کنند۔ (صراط مستقیم)

تیسرا غلط خیال

اولیاء کے متعلق اس غلوئے عقیدت نے تیسرا غلط خیال یہ قائم کیا کہ اولیائے کاملین صاحب تصرف ہوتے ہیں اور ان کا تصرف ان کی زندگی کے ساتھ ختم نہیں ہوتا بلکہ اپنی قبروں میں بھی وہ صاحبِ تصرف ہوتے ہیں۔ جس شکل میں چاہیں متشکل ہو جاتے ہیں اور کائنات میں حسب منشا تصرف کرتے ہیں۔ اللہ کی طرف سے انھیں اذنِ عام حاصل ہوتا ہے۔ راقم الحروف نے جب "صراطِ مستقیم" میں پڑھا تو متحیر رہ گیا:

"عنایت غیبیہ اس کو چن کر اپنا خاص چیلہ بنا لیتی ہے جس طرح با اقتدار بادشاہ اپنے بعض فرماں برداروں کو تمام رعایا سے ممتاز کر کے اپنے لیے چن لیتے ہیں اور اس کو "چیلۂ خاص" سے ملقب کرتے ہیں۔ پس جس طرح چیلۂ خاص کو اپنے آقا کے سامان میں تصرف کی اجازت ہوتی ہے یہاں تک کہ وہ اپنے آقا کی تمام سلطنت کو اپنی سلطنت کہہ دیتا ہے۔ اسی طرح یہ بلند مراتب و مناصب والے (یعنی اولیائے کاملین) مجاز مطلق ہوتے ہیں عالم مثال و شہادت میں تصرف کرنے کے لیے۔"[1]

اب تک یہ معلوم تھا کہ صوفیہ کے نزدیک "اولیاء اللہ" عالم شہادت (یہ دنیا جسے ہم دیکھ رہے ہیں) میں تصرف کرتے ہیں لیکن صراط مستقیم پڑھنے کے بعد معلوم ہوا کہ عالم مثال (وہ غیر مرئی عالم جو دنیا و آخرت کے درمیان ہے) بھی ان کے زیر اقتدار ہے۔ اس بات پر یقین کرنا کس قدر مشکل ہے کہ صاحبِ تقویۃ الایمان نے یہ بات لکھی ہوگی۔ جس میں انھوں نے "شرک فی التصرف" پر پوری ایک فصل لکھی ہے۔ قُلْ مَنْ بِيَدِهٖ مَلَكُوْتُ كُلِّ شَيْءٍ

---

[1] عنایت غیبیہ او را اصطفا کردہ بمثابۂ چیلۂ خاص کہ بادشاہانِ ذوی اقتدار بعضے مطیعین خود را از سائر رعایا تمیز دادہ بچیلۂ خاص ملقب می فرمایند، برگزیدہ می کنند پس چنانکہ چیلۂ خاص ماذوق مطلق در تصرف امتعہ و اقمشہ مولائے خود می باشد و تمام سلطنت او را بخود نسبت می نماید۔۔۔ ہم چنیں اصحاب ایں مراتب عالیہ و ارباب ایں مناصب رفیعہ ماذوق مطلق در تصرف عالم مثال و شہادت می باشند۔ (صراط مستقیم مرتبہ مولانا اسماعیل)

کے تحت لکھتے ہیں :

" اس آیت سے معلوم ہوا کہ پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت کافر بھی اس بات کے قائل تھے کہ کوئی اللہ کے برابر نہیں اور اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا، مگر اپنے بتوں کو اس کی جناب میں اپنا وکیل سمجھ کر اس کو مانتے تھے، اس سے کافر ہو گئے، سو اب بھی جو کوئی، کسی مخلوق کو دنیا میں متصرف ثابت کرے اور اپنا وکیل سمجھ کر اس کو مانے اس پر شرک ثابت ہو جاتا ہے خواہ اسے اللہ کے برابر نہ سمجھے اور اس کے مقابلہ کی طاقت اس کے لیے ثابت نہ کرے ۔"

جب آپ اس عبارت اور صراطِ مستقیم کی مذکورہ بالا عبارت کو پڑھیں گے تو اس تضاد کو دور کرنا آپ کے لیے دشوار ہو گا۔ اولیاء کے متعلق وہ بات تسلیم کرنا ہرگز صراط مستقیم نہیں ہے جسے صراطِ مستقیم میں درج کیا گیا ہے۔ کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے حضرت شہید جیسے اساطینِ علم و عمل بھی جب تصوف پر قلم اٹھاتے ہیں تو شاید ان پر محویت کا عالم طاری ہو جاتا ہے اور عالمِ صحو سے نکل کر دنیائے سُکر میں داخل ہو جاتے ہیں، حالانکہ ہونا یہ چاہیئے تھا کہ جب وہ تصوف پر قلم اٹھاتے تو عالمِ سُکر سے نکل کر عالمِ صحو میں آجاتے۔

چوتھا غلط خیال

اولیاء کی ان متصوفانہ خصوصیات کو تسلیم کرنے کا چوتھا خطرناک نتیجہ یہ نکلا کہ ولایت کو نبوّت سے افضل کہا جانے لگا اور واقعہ یہ ہے کہ ان خصوصیات کو اگر تسلیم کر لیا جائے تو لازمی نتیجہ یہی نکلے گا۔ آخر انبیاءؑ عالمِ مثال و شہادت میں متصرف کہاں ہیں اور ان کے سامنے لوحِ محفوظ کب رہی ہے؟ ابن عربی علیہ الرحمۃ کے کلام میں بھی اسی طرح کی چیزیں ملتی ہیں اور شاید انہیں کے کلام کو دیکھ کر ملحدوں اور بے دینوں نے علی الاعلان ولایت کو نبوّت سے افضل کہا ہے۔ مشائخِ حق نے اگرچہ ابنِ عربی کے کلام کی تاویلیں کی ہیں لیکن وہ ابہام کو دور کرنے پر قادر نہیں ہو سکے ہیں۔

حضرت مجددؒ نے ولایت کو نبوّت سے افضل کہنے والوں پر سخت الفاظ میں

تنقید کی ہے اور ان کی تردید کی ہے لیکن انھوں نے بھی نبی کی ولایت کو الگ اور اس کی نبوت کو الگ کیا ہے اور اسی طرح انھوں نے ولایتِ اولیار اور ولایتِ انبیار کی تقسیم بھی کی ہے اور یہ سب باتیں محض دعوے کے طور پر ہیں جن کی کوئی شرعی دلیل پیش نہیں کی گئی ہے۔ یہ ساری بحثیں صرف اس لیے پیدا ہوئی ہیں کہ اولیار کی صفات وخصوصیات اور ولایت کی حقیقت جاننے کے لیے کتاب اللہ کے نصوص کو کافی نہیں سمجھا گیا بلکہ اپنی بے دلیل رایوں اور کشوف، کو بھی اس میں دخل دینے کی اجازت دے دی گئی۔ حیرت ہوتی ہے کہ ایک طرف تو کشف کی صحت وسقم کو جانچنے کے لیے کتاب وسنت کو معیار بتایا جاتا ہے اور دوسری طرف اپنے کشوف کو اس معیار پر جانچنے کی زحمت برداشت نہیں کی جاتی اور بے محابا و بے تکان اپنے کشوف کو پھیلا کر اس جزم و یقین کے ساتھ بیان کیا جاتا ہے جیسے یہ کتاب وسنّت کی کسوٹی پر جانچی ہوئی حقیقتیں ہیں۔ اسی کا نتیجہ یہ ہے کہ بہت سے بزرگوں نے خود اپنے متعلق بعض ایسی خصوصیات کا اعلان کیا جو کسی نبی کو بھی حاصل نہیں۔ مثلاً صاحب "زبدۃ المقامات" خصائص مجدد الف ثانیؒ شمار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"من جملہ خصوصیات یہ ہیں کہ ایک مراقبے کے حلقے میں تھے اور منکسرانہ قصورِ اعمال کو سوچ رہے تھے کہ ایک ندا آئی: "میں نے تم کو بخش دیا اور ہر اس شخص کو بخش دیا جو میرے یہاں تم سے توسل کرے۔ چاہے یہ توسل بواسطہ ہو یا بلا واسطہ۔ اور مغفرت کا یہ سلسلہ قیامت تک کے لیے ہے۔" — اور مجھے اس کے اظہار کا حکم دیا ہے جیسا کہ آنحضرت قدس سرہٗ نے رسالہ "مبدأ و معاد" کے ایک فقرے میں یہ بات خود لکھی ہے۔[1]

---

[1] از آں جملہ آنست کہ روزے ایشاں در حلقۂ مراقبہ بودند و بہ انکسار دید قصورِ اعمال رفتہ کہ ندائے در رسید کہ غفرت لک ولمن توسل بک الیٰ بوسط او بغیر وسط الیٰ یوم القیامۃ و مرا باظہار آں امر فرمودہ اند چنانکہ آنحضرت قدس سرہٗ خود در فقرۂ از فقرات رسالہ مبدأ و معاد ایں معنی را رقم نمودہ اند۔ (زبدۃ المقامات)

اس طرح کی خصوصیت کا ذکر بعض دوسرے بزرگوں کے کلام میں بھی ملتا ہے۔ اگر وہ بزرگ اسی طرح کی غیبی نداؤں کو کتاب وسنت اور خصائصِ انبیار کی کسوٹی پر جانچ لیتے تو شاید کبھی ان کا اظہار نہ فرماتے۔

پانچواں غلط خیال

"عبادت" کا ایک محدود مفہوم دماغوں میں پیوست ہوگیا اس کی منطق اس طرح تیار ہوئی کہ اللہ نے جن وانس کو اپنی عبادت کے لیے پیدا کیا، اور عبادت نام ہے نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج، تلاوتِ قرآن، ذکر و تسبیح اور اوراد و وظائف کا، لہٰذا انسان بس انہیں چیزوں کا مکلف ہے۔ کچھ اور کرنا اس کے لیے ضروری نہیں ہے۔ یہ منطق اتنی بڑھی کہ ملک وملت، نظمِ مملکت اور سیاست وحکومت کے مسائل سے دل چسپی لینے اور ان سب کو صحیح رُخ پر لے جانے کی کوشش کرنے کو "دنیاداری" سمجھا جانے لگا اور ظاہر ہے کہ "اولیار اللہ" کو دنیاداری سے کیا تعلق ہو سکتا ہے؟

جن لوگوں نے ان مسائل کی طرف توجہ کی خواہ وہ کتنے ہی صالح اور متقی کیوں نہ ہوں، انہیں اولیار اللہ کی صف سے باہر نکال دیا گیا۔ الاّیہ کہ انھوں نے ساتھ ساتھ پیری مریدی بھی جاری رکھی ہو اور کسی سلسلے کے باضابطہ شیخ بھی ہوں۔ اس خیال نے جو نقصان پہنچایا اس پر کسی تبصرے کی ضرورت نہیں ہے۔

اب انصاف کے ساتھ مسائل پر غور کرنے والا ہر شخص یہ فیصلہ کر سکتا ہے کہ قرآن نے اولیاء اللہ کی جو صفات وخصوصیات پیش کی ہیں ان سے کتب تصوف کی پیش کردہ صفات وخصوصیات کا کیا تعلق ہے؟ کتب تصوف نے خیالی اور وہمی صفات وخصوصیات پیش کر کے کتاب وسنت سے انحراف کیا ہے یا نہیں؟

ایک طرف قرآن کے بیّنات ہیں اور دوسری طرف کتب تصوف کے یہ خیالات ہیں۔ جس کا جی چاہے اس کو قبول کرے اور جس کا جی چاہے اس کو اختیار کرے۔

خاتمۂ کلام

ہم نے اللہ کے فضل سے پورے یقین کے ساتھ قرآن کے بیّنات کو قبول کیا ہے۔ ہم "ولایت" کو کسی خاص طبقے کے ساتھ مخصوص نہیں سمجھتے۔ ہم جس طرح سیدنا الشیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کو اللہ کا ولی سمجھتے ہیں اسی طرح امام احمد بن تیمیہؒ

کو بھی اللہ کا ولی سمجھتے ہیں۔ ہمارے نزدیک اللہ کے تمام صالح اور متقی بندوں کو ولایت خاصہ حاصل ہے۔ خواہ وہ مسلمانوں کے کسی طبقہ اور کسی جماعت سے تعلق رکھتے ہوں۔ ہم ان کی انہیں خصوصیات وصفات کو تسلیم کرتے ہیں جو قرآن نے پیش کی ہیں۔ ہمارے نزدیک ان کا وہی مرتبہ ومقام ہے جو اس ذات نے مقرر کیا ہے جس کے وہ ولی ہیں۔ ہم ان سے عقیدت رکھتے ہیں، ان سے محبت کرتے ہیں لیکن ہماری عقیدت ومحبت بے لگام نہیں ہے۔

اَللّٰھُمَّ اَرِنَا الْحَقَّ حَقًّا وَّارْزُقْنَا اتِّبَاعَہٗ وَاَرِنَا الْبَاطِلَ بَاطِلًا وَّارْزُقْنَا اجْتِنَابَہٗ۔

عقیدت واحترام

جلب منفعت اور دفع مضرت یعنی نفع کی طلب اور نقصان کا دفعیہ ہر جاندار کا خاصّہ ہے۔ دنیا میں کوئی ایسا ذی حیات موجود نہیں جو اس خاصے سے خالی ہو۔ طفل شیر خوار یا پیر فرتوت، مور ضعیف ہو یا فیل قوی، جسے بھی اللہ نے خلعت وجود بخشا ہے اس کی فطرت میں یہ بات ڈال دی ہے کہ اپنے نفع کے لیے کوشاں ہو اور اپنے نقصان سے بھاگے۔ انسان جو اشرف المخلوقات ہے اس کے اندر یہ فطری خاصّہ بدرجۂ اتم موجود ہے۔ دنیا میں بہت سی چیزیں ایسی ہیں جو انسان کو فائدہ پہنچاتی ہیں اور بکثرت ایسی چیزیں بھی موجود ہیں جو اُسے نقصان سے دوچار کرتی ہیں۔ یہ فائدہ بخش چیزوں کے قریب جاتا ہے اور نقصان رساں چیزوں سے بھاگتا ہے۔ یہ بحث الگ ہے کہ فی الواقع کون سی چیز نفع بخش ہے اور کون سی شئے مضرت رساں اور یہ بھی ایک علیحدہ بحث ہے کہ انسان جان بوجھ کر بعض مضرت رساں چیزوں کو کیوں اختیار کرتا ہے، اتنا متعین ہے کہ ہر انسان اپنی سمجھ اور اپنی خواہش کے مطابق نفع حاصل کرنا اور نقصان سے بچنا چاہتا ہے۔

انسان چونکہ جسم اور روح سے مرکب ہے اس کے فائدے اور نقصانات بھی دو طرح کے ہیں، جسمانی اور روحانی، بہت سی چیزیں ایسی ہیں جو اس کے جسم کو فائدہ یا نقصان پہنچاتی ہیں اور بہتیری اشیا، وہ ہیں جو اس کی روح کو پاکیزہ یا گندہ بناتی ہیں۔

اسی فطری خاصّے سے متعلق انسان کے اندر دو جذبے اور پائے جاتے ہیں محبت اور نفرت۔ جس چیز کے بارے میں اسے یقین ہو جاتا ہے کہ وہ نفع بخش اور فائدہ رساں ہے اس کی محبت اس کے دل میں پیدا ہوتی ہے اور جس شے کے متعلق وہ محسوس کر لیتا ہے کہ وہ ضرر رساں اور نقصان دہ ہے، اس سے نفرت اس کے قلب میں جاگزیں ہوتی ہے۔ جذبۂ محبت سے،

عقیدت واحترام کا چشمہ پھوٹتا ہے اور جذبۂ نفرت سے بدعقیدگی وتذلیل کی شاخ سر نکالتی ہے۔ انسان کی پوری زندگی، جلب منفعت ودفع مضرت کے اسی فطری خاصّے اور محبت ونفرت کے انھیں فطری جذبات کی مرہون منت ہے اس لیے انسان سب سے زیادہ اس بات کا محتاج ہے کہ اسے حقیقی فائدہ ونقصان کا علم ہو اور محبت ونفرت کے حدود معلوم ہوں، اگر ایسا نہ ہو تو اس کی زندگی نہ کبھی سدھر سکتی ہے اور نہ کبھی سنور سکتی ہے۔

یہ بات خالقِ کائنات کی رحمت سے بعید تھی کہ وہ انسان کو اس کے حقیقی فائدہ ونقصان کی معرفت اور محبت ونفرت کے حدود کا علم عطا نہ کرتا اس لیے اس نے پوری وضاحت کے ساتھ ہمیں یہ علم ومعرفت، مرحمت فرمائی ہے اور اس سلسلے میں کوئی چیز مبہم اور گنجلک باقی نہیں رہی ہے۔

ایک اہم سوال

اپنے نفع ونقصان کے مسئلہ پر جب ہم غور کرتے ہیں تو ایک بڑا اہم سوال ہمارے سامنے یہ آتا ہے کہ اس کائنات میں سب سے بڑا نافع اور سب سے بڑا ضار (نقصان پہنچانے والا) کون ہے؟ نفع بخشی وضرر رسانی کی اصلی طاقت کس کے پاس ہے؟ وہ کون ہے کہ اگر نفع پہنچانا چاہے تو کوئی اسے روک نہیں سکتا اور نقصان دینا چاہے تو کوئی دوسری طاقت اس کی راہ میں حائل نہیں ہو سکتی۔ وہ کون ہے جو ہمارے تمام جسمانی وروحانی فوائد کی ضمانت لے سکتا ہے اور وہ کون ہے جو ہمیں تمام جسمانی وروحانی نقصانات سے بچا سکتا ہے؟ کس کا خزانہ ایسا ہے جو کبھی کم نہیں ہوتا، کس کی طاقت ایسی ہے جو کبھی شکست نہیں کھاتی، کس کا آستانہ ایسا ہے کہ اس پر سر رکھ دینے کے بعد کسی دوسرے آستانے کی ضرورت نہیں رہتی، کس کی رحمت ایسی ہے جو ہمیں دنیا وآخرت میں بامراد وکامیاب کر سکتی ہے اور کس کا غضب ایسا ہے جو ہمیں یہاں اور وہاں نامراد وناکام بنا سکتا ہے۔ غرض وہ کون سی ذات ایسی ہے کہ جس کا دامن تھام لیں تو سب کچھ مل جائے اور جس کا دامن چھوڑ دیں تو سب کچھ کھو جائے؟ اس کائنات کا ذرہ ذرہ اور خود ہمارے قلب کا ریشہ ریشہ اس کے جواب میں پکار اٹھتا ہے۔ اللہ وہ زندۂ جاوید ہستی جو ساری کائنات کو تھامے ہوئے ہے۔

یہیں سے یہ دوسرا سوال پیدا ہوتا ہے کہ انسان کا حقیقی فائدہ اور اس کا حقیقی نقصان کیا ہے اور یہیں سے یہ جواب نکلتا ہے کہ خدا کی رضا انسان کا حقیقی فائدہ اور خدا کا غضب اس

کا حقیقی نقصان ہے، اس سے بڑی کوئی منفعت نہیں اور اس سے بڑی کوئی مضرت نہیں۔
اس حقیقت کو پا لینے کے بعد ایک سلیم الفطرت انسان کا رویہ کیا ہوگا؟ یہی ہو سکتا ہے کہ وہ اپنی محبت وعقیدت کے تمام نذرانے اور تعظیم وتکریم کی ساری کائنات اس ذاتِ یکتا کی بارگاہ قدس میں پیش کر دے اسی کے آستانے پر سر رکھ دے اور تمام دوسرے خود ساختہ آستانوں سے بے نیاز ہو جائے۔

ذریعۂ رضا و قرب

اللہ کی رضا اور اس کا قرب جب انسان کی سب سے بڑی منفعت اور اس کا سب سے بڑا فائدہ ہے تو پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ اسے کس طرح حاصل کیا جائے؟ ہم کس طرح اپنی محبت وعقیدت کے نذرانے اس کی بارگاہ میں پیش کریں اور ہم کس طرح اس کی تعظیم وتکریم بجا لائیں؟ وہ ہماری نگاہوں سے اوجھل ہے، اسے دیکھ نہیں سکتے۔ وہ ہمارے وہم وخیال سے بھی پرے ہے، اس کی حقیقت جان نہیں سکتے، وہ ہمارے فکر واندیشہ کی سرحد سے وراء الوراء ہے اس کو چھو نہیں سکتے، پھر اس کی رضا اور اس کا قرب حاصل کیسے ہو؟ کیا یہ بات صحیح ہے کہ ہم جس طرح چاہیں اسے پوجیں، جس طرح چاہیں اس سے محبت کریں، اور جس طرح چاہیں اس کی تعظیم وتکریم کے قاعدے اور قانون بنائیں؟ عقل کا جواب یہ ہے کہ نہیں، یہ کسی طرح درست نہیں۔ محبوب کی خوشنودی اس وقت تک حاصل نہیں ہو سکتی جب تک اس کی مرضیات کا علم نہ ہو، جب تک ہم یہ نہ جان لیں کہ وہ چاہتا کیا ہے، وہ کس بات سے خوش ہوتا ہے اور کون سی بات اسے ناخوش کرتی ہے، صرف ہماری عقل ہی نہیں، اللہ کا فرمان بھی یہی ہے کہ ہم جس چیز سے خوش ہوتے ہیں اسے اختیار کرو اور جس چیز سے ناخوش ہوتے ہیں اُسے ترک کرو، اسی لیے اس نے انسانوں ہی میں سے اپنے رسول منتخب کیے اور ان کے واسطے ہی سے ہمیں مکمل ہدایت نامے عطا کیے۔ انبیاء مرسلین کا سلسلہ نبیِ آخری سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ختم ہوا اور کتب سماوی کا سلسلہ کتاب آخری قرآن مجید پر ختم ہوا۔ اب اس دنیا میں صرف ایک ہی ذریعہ باقی ہے جس سے خدا کا قرب اور اس کی رضا حاصل ہو سکتی ہے اور وہ یہ ہے کہ انسان کتاب وسنت کی پیروی اختیار کرے۔

انبیا، صحابہ اور بزرگان دین کا احترام

انبیاء کرام کی اطاعت اور ان کے اتباع سے چونکہ ہمیں سب سے بڑی منفعت اور سب سے بڑا اجر حاصل ہوتا ہے انھیں کے واسطے سے ہمیں اللہ کی مرضیات کا علم حاصل ہوتا ہے اور انھیں کی پاک زندگی ہمارے لیے نمونہ بنتی ہے، انھیں کو دیکھ کر ہم یہ جانتے ہیں کہ خدا کی بارگاہ میں اپنی محبت وعقیدت کے نذرانے کس طرح پیش کریں اور انہیں دیکھ کر ہم یہ معلوم کرتے ہیں کہ اس کی تعظیم وتکریم کس طرح بجا لائیں۔ انبیار کرامؑ عمر بھر خدا کی مخلوق کو حقیقی نفع پہنچانے اور واقعی نقصان سے بچانے کی سعی کرتے رہتے ہیں، وہ زندگی کے آخری لمحے تک انتہائی شفقت ودل سوزی سے خدا کے مقام قرب تک لے جانے اور اس کے غضب سے دور ہٹانے کی انتھک کوششوں میں منہمک ہوتے ہیں اس لیے فطری طور پر جذبۂ احسان مندی کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ ہم ان سے محبت کریں، ان سے عقیدت رکھیں اور ان کے احترام میں کسی طرح کی کوتاہی ہم سے سرزد نہ ہو۔ اسی طرح انبیار کے بعد ان کے رفقار ان کے ساتھی، ان کے صحابہ اس تعلیم کو دوسروں تک پہنچانے کا ذریعہ بنتے ہیں جو انھیں انبیار سے ملتی ہے اور لازمًا ان کی محبت وعقیدت واحترام بھی ہمارے لیے ضروری قرار پاتا ہے۔ یہ سلسلہ ہر اس شخص تک منتہی ہوتا ہے جو ہمیں خدا کی ہدایت اور رسول کی سنت کا علم عطا کرے، ہم پر اپنے ان اساتذہ کی محبت وعقیدت واحترام بھی واجب ہے جو براہِ راست ہمیں دین کی تعلیم دیتے ہیں۔

اس تفصیل سے یہ بات معلوم ہوئی کہ خدا کی محبت اور اس کی تعظیم سے لے کر اپنے اساتذہ کی عقیدت واحترام تک بہت سی محبتیں اور عقیدتیں جمع ہوجاتی ہیں اور یہی وہ محلِّ آزمائش ہے جس سے عہدہ برآ ہونا انسان کی دائمی کامیابی کے لیے ضروری ہے۔

ان محبتوں، عقیدتوں اور اکرام واحترام کے حدود کیا ہیں؟ ان کے درجات کیا ہیں؟ ان کے درمیان فرق مراتب کیا ہے؟ یہی وہ بنیادی سوالات ہیں جن پر ان کی صحت وعدم صحت اور جواز وعدم جواز کا انحصار ہے۔ جس طرح ان کے درمیان توازن واعتدال ہمیں صراط مستقیم پر قائم رکھتا ہے اسی طرح ان کے درمیان عدم توازن اور بے اعتدالی ہمیں گمراہ بھی کردیتی ہے یہاں تک کہ دنیا کی سب سے بڑی گمراہی اور سب سے بڑا ظلم شرک، اسی بے اعتدالی

وعدم توازن سے پیدا ہوا، پیدا ہوتا ہے اور پیدا ہوتا رہے گا اگر یہ محبتیں اور عقیدتیں خدا کی محبت وعقیدت سے مغلوب رہیں اگر یہ تعظیم واکرام خدا کے اکرام وتعظیم کے تابع رہے تو یہ سب ہمارے لیے مفید بلکہ ایک حد خاص تک ضروری ہیں اور ہم ان کے بغیر خدا کی رضا حاصل نہیں کر سکتے اس کے مقام قرب تک نہیں پہنچ سکتے۔ لیکن اگر یہ خدا کی محبت وعقیدت پر غالب آجائیں یہ اس کی تعظیم وتکریم سے بازی لے جائیں۔ اگر ان سے خدا کی محبت وعقیدت کو ٹھیس لگ جائے، اگر ان سے خدا کی عظمت وجلال پر حرف آجائے اور اگر ان سے خدا کے حقوق میں کچھ دوسرے لوگ شریک ہو جائیں تو یہ ساری عقیدتیں اور محبتیں اور یہ سارا احترام واکرام ہمارے لیے وبال جان اور بلائے ایمان بن جاتا ہے۔ انسان نے اکثر اسی مقام پر ٹھوکر کھائی ہے اور وہ حدود سے تجاوز کر گیا ہے۔ یہ عدم توازن اور بے اعتدالی دو طرح سے ظاہر ہوتی ہے ایک طرف غیر اللہ کی محبت وعقیدت اتنی بڑھی کہ حد افراط تک جا پہنچی اور دوسری طرف کم ہوئی تو اتنی کم ہوئی کہ حد تفریط پر پہنچ گئی، حد افراط نے شرک کا دروازہ کھولا اور حد تفریط نے گستاخی کا رنگ اختیار کیا۔ اس وقت سے کر اکثر انسانوں نے توحید کا سر رشتہ اپنے ہاتھوں سے چھوڑ دیا اور شرک کے تاریک جنگل میں بھٹکنے لگے۔ دنیا میں ہمیشہ تین گروہ موجود رہے ہیں ہم چاہتے ہیں کہ ہر گروہ کا مختصر جائزہ لیں۔

پہلا گروہ

مُفرطین، یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے غیر اللہ کی عقیدت واحترام میں غلو اور افراط کی روش اختیار کی ہے۔ انھوں نے خدا اور غیر خدا کی محبت وتعظیم کے تمام حدود توڑ دیے ہیں، اپنی خواہش کے مطابق خود ہی درجات مقرر کر لیے ہیں اور فرق مراتب ان کے نزدیک کوئی شئے باقی نہیں رہی ہے۔ چونکہ خدا کے بعد انبیاء کرام کا درجہ سب سے بڑا ہے اس لیے جب یہ انبیاء کی محبت وعقیدت میں غلو وافراط کی سرحد میں داخل ہوئے تو انھوں نے ان کا احترام یوں کیا کہ انھیں مقام الوہیت پر فائز کر دیا اور جب یہ انبیاء کے علاوہ دوسرے صلحاء وعلماء کی محبت وعقیدت میں آگے بڑھے تو انہیں مقام نبوت کے حقوق عطا کر دیے اور اگر اس پر بھی تسلی نہ ہوئی تو انھیں بھی خدا بنا ڈالا۔ خدا چونکہ سب سے بڑا ہے اس لیے یہ بے چارے اس سے آگے نہ جا سکے ورنہ ان کا جذبۂ عقیدت کچھ

اور اونچا جا سکتا تھا یہود و نصاریٰ کی تاریخ اس سلسلے میں ہمارے سامنے نمونۂ عبرت کے طور پر موجود ہے انھیں کی تردید کرتے ہوئے قرآن نے ایک جگہ کہا ہے :

مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْكِتٰبَ وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ ۔ (آل عمران : ۸)

کسی انسان کا یہ کام نہیں ہے کہ اللہ تو اس کو کتاب اور حکم اور نبوت عطا فرمائے اور وہ لوگوں سے کہے کہ اللہ کے بجائے تم میرے بندے بن جاؤ۔ وہ تو یہی کہے گا کہ سچے ربانی بنو جیسا کہ اس کتاب کی تعلیم کا تقاضا ہے جسے تم پڑھتے اور پڑھاتے ہو۔

انبیاء کرامؑ تو آئے ہی اس لیے تھے کہ دنیا سے شرک و کفر کا استیصال کریں، ان کے لیے یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ خدا کے بندوں کو اپنا بندہ بنالیں لیکن اُن کے بعد ان کے ماننے والوں نے کم تر جہالت اور جھوٹی عقیدت اور زیادہ تر ہوائے نفس کی بنا پر انھیں خدا کا مقام عطا کیا اسی سلسلے میں کہا گیا ہے۔

وَلَا يَاْمُرَكُمْ اَنْ تَتَّخِذُوا الْمَلٰٓئِكَةَ وَالنَّبِيّٖنَ اَرْبَابًا ۭ اَيَاْمُرُكُمْ بِالْكُفْرِ بَعْدَ اِذْ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ۔ (آل عمران : ۸)

وہ تم سے ہرگز یہ نہ کہے گا کہ تم فرشتوں کو یا پیغمبروں کو اپنا رب بنالو، کیا یہ ممکن ہے کہ ایک نبی تمھیں کفر کا حکم دے جبکہ تم مسلم ہو۔

اہل کتاب نے اپنے احبار و رہبان تک کو وہ حقوق عطا کیے جو صرف خدا کے لیے خاص تھے۔ ان کی یہ گمراہی اس طرح ظاہر کی گئی۔

اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَالْمَسِيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ ۚ وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوْٓا اِلٰــهًا وَّاحِدًا ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۭ سُبْحٰنَهٗ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ (توبہ : ۵)

انھوں نے اپنے علماء اور درویشوں کو اللہ کے سوا اپنا رب بنالیا ہے اور اسی طرح مسیح ابن مریم کو بھی، حالانکہ ان کو ایک معبود کے سوا کسی کی بندگی کرنے کا حکم نہیں دیا گیا تھا۔ وہ جس کے سوا کوئی مستحق عبادت نہیں، پاک ہے وہ ان مشرکانہ باتوں سے جو یہ لوگ کرتے ہیں۔

سورۂ توبہ کی اس آیت کریمہ کی بہترین و صحیح ترین تشریح احادیث میں موجود ہے۔ اس آیت کو سن کر حضرت عدی بن حاتم کو یہ شبہ پیدا ہوا کہ یہود و نصاریٰ نے اپنے علماء و مشائخ کو معبود اور رب تو بنایا نہ تھا پھر یہ کیسے کہا جا رہا ہے کہ انھوں نے اپنے احبار و رہبان کو اللہ کے سوا اپنا رب بنا لیا ہے، انھوں نے یہ شبہ دربارِ نبوی میں پیش کیا۔ یہ سن کر حضورؐ نے ان سے پوچھا "کیا یہ بات نہیں کہ احبار و رہبان جس چیز کو حلال قرار دیتے تھے تم اسے حلال سمجھتے تھے اور جس شئے کو حرام قرار دیتے تھے تم حرام سمجھتے تھے" حضرت عدیؓ نے جواب دیا۔ "ہاں یارسول اللہ ایسا تو ہوتا تھا" آپؐ نے فرمایا۔ "احبار و رہبان کو رب بنا لینے کا یہی مطلب ہے"

اس حدیث سے واضح طور پر معلوم ہوا کہ کسی انسان کو رب بنانے کا صرف یہی مطلب نہیں ہے کہ اسے رب اور معبود قرار دیا جائے اور اس کے سامنے مراسم عبودیت ادا کیے جائیں بلکہ اس کا مطلب یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے کسی ایسے حق میں اسے شریک کر لیا جائے جو صرف خدا کے لیے خاص ہے، تحلیل و تحریم اللہ تعالیٰ کا وہ مخصوص حق ہے جو انبیاء کرام علیہم السلام کو بھی حاصل نہیں۔ کیوں کہ وہ جس چیز کو بھی حلال یا حرام قرار دیتے ہیں خدا کے حکم سے اور اس کی مرضی کے مطابق قرار دیتے ہیں۔ اپنی طرف سے حلت و حرمت کا حکم صادر نہیں فرماتے۔ اب اگر کسی غیر نبی کو یہ حق دیا جائے تو اس کے معنی یہی ہوئے کہ اسے خدا کے مخصوص حق میں شریک کر لیا گیا اور اسے اپنا رب بنا لیا گیا۔ آل عمران کی ان دو آیتوں اور سورۂ توبہ کی اس ایک آیت نے غیر اللہ کے غلوئے عقیدت کی جڑ کاٹ دی ہے۔ ان آیتوں کے موجود ہوتے ہوئے اور ان پر ایمان کا دعویٰ کرتے ہوئے بھی اگر کوئی انبیاء کرامؑ یا علماء و مشائخ کی عقیدت میں وہ غلو اختیار کرے جو یہود و نصاریٰ نے اختیار کیا تھا تو یہ مقامِ حیرت بھی ہے اور مقامِ افسوس بھی۔

اُمتِ مسلمہ کا حال

یہود و نصاریٰ کی طرح امت مسلمہ میں بھی غیر اللہ کے احترام و عقیدت کا غلو گھس آیا اور اس امت میں بھی ایسے لوگ موجود ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں بھی ایسے عقیدے رکھتے ہیں جو خلاف حقیقت و خلاف واقعیت ہیں، انھوں نے بھی حضورؐ کو وہ مقام عطا کیا ہے جو کسی انسان کے لیے جائز

نہیں ہے اور جس کی کوئی سند خدا نے نہیں اتاری اور ایک لحاظ سے امت مسلمہ کے اس گروہ کا حال یہود و نصاریٰ سے بھی زیادہ عبرت انگیز ہے۔ یہود و نصاریٰ نے تو ان کتابوں ہی کو محرف کر دیا تھا جو خدا نے اتاری تھیں لیکن قرآن بغیر کسی ترمیم و تحریف کے آج بھی موجود ہے، یہ لوگ جھوم جھوم کر اس کی تلاوت بھی کرتے ہیں اور پھر اس ذات گرامی صفات کو جس پر قرآن نازل ہوا تھا وہ مقام عطا کرتے ہیں جو خود اسی قرآن کے خلاف ہے۔ مسلمانوں میں غلوئے عقیدت کی بنیاد سب سے پہلے شیعوں نے ڈالی، انھوں نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا درجہ اتنا بڑھایا کہ بعضوں نے ان کو خدا تک بنا ڈالا اور پھر افراط و غلو کی یہ بیماری اس گروہ میں بھی گھس آئی جو اپنے آپ کو اہل السنتہ والجماعۃ قرار دیتا ہے بلکہ صرف اپنے آپ ہی کو اس لقب کا حقیقی مستحق سمجھتا ہے۔

ائمہ دین اور مشائخ کرام کی عقیدت میں جب غلو پیدا ہوا تو انھیں انبیاء معصومین کا درجہ عطا کیا گیا اور آج وہ لوگ جو اپنے آپ کو متبع سنت سمجھتے ہیں اس غلو عقیدت میں مبتلا ہیں، تمام اہلِ حق کا اس پر اجماع ہے کہ مقام عصمت صرف انبیاء کرام علیہم السلام کو حاصل ہے اور انبیاء کے سوا بنی نوع انسان میں کوئی اور معصوم نہیں ہے لیکن آج کتنے ہی لوگ ایسے موجود ہیں جو ایک طرف اس اجماعی مسئلے کو بھی تسلیم کرتے ہیں اور دوسری طرف "اولیاء کرام" کو معصوم بھی سمجھتے ہیں، انھوں نے ان کو وہ درجہ عطا کیا جو فی الواقع ان کا نہیں اور پھر اصرار یہ ہے کہ دوسرے لوگ بھی اولیاء کا وہی درجہ تسلیم کرلیں جو ان کے نزدیک مسلم ہے۔ یہ لوگ اولیاء کے بارے میں عجیب عجیب تصورات اور نت نئے عقیدے رکھتے ہیں اور ان کا مطالبہ یہ ہے کہ دوسرے لوگ بھی انھیں تصورات اور انھیں عقیدوں کو اپنے دل و دماغ میں جگہ دیں۔

دوسرا گروہ

مقصرین۔ یہ وہ لوگ ہیں جو عدم توازن اور بے اعتدالی کے دوسرے کنارے پر رہتے ہیں۔ یہ لوگ نہ خدا کی محبت و عظمت کا حق بجا لاتے ہیں اور نہ خدا کے نیک بندوں کے اکرام و احترام کا لحاظ کرتے ہیں۔ تفریط و تقصیر ان کا شیوہ ہے۔ یہودیوں کی قوم اس بے اعتدالی میں بھی دنیا کی امام ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے خدا کی

شان میں، "یَدُ اللّٰہِ مَغْلُوْلَۃٌ" اور "اللّٰہُ فَقِیْرٌ وَّنَحْنُ اَغْنِیَآءُ" کے گستاخانہ جملے کہے اور یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے انبیاءؑ کی طرف ایسی بدکاریاں منسوب کیں جو معمولی انسانوں کے لیے بھی باعث ننگ ہیں۔

امت مسلمہ میں جس طرح افراط و غلوئے عقیدت کی بیماری شیعوں نے پیدا کی اسی طرح تفریط و تقصیر کا روگ بھی انہیں لوگوں نے لگایا۔ یہ لوگ سیدنا حضرت علیؓ کی عقیدت میں افراط اور خلفائے ثلٰثہ نیز دیگر صحابہ رضی اللہ عنہم کی شان میں تفریط برتتے ہیں۔ ان لوگوں کے علاوہ دوسرا گروہ خوارج کا ہے جس نے سیدنا علیؓ اور چند دیگر صحابہؓ کی شان میں گستاخی ہی کو اپنا مسلک خاص بنا لیا ہے، امت مسلمہ میں ایسے لوگ بھی موجود ہیں جو انبیاء علیہم السلام کی معصومیت کے بھی قائل نہیں۔ ان کے نزدیک انبیاءؑ سے بھی اسی طرح گناہ سرزد ہو سکتے ہیں جس طرح غیر انبیاء سے۔

تیسری صدی ہجری کے بعد جب ائمہ اربعہ کی عقیدت و احترام میں غلو اور افراط کرنے والے پیدا ہوئے تو ردعمل کے طور پر ایسے لوگ بھی پیدا ہوئے جو تفریط کی طرف لڑھک گئے، اسی طرح جب صوفیۂ علیہ کی عقیدت و محبت میں غلو کیا جانے لگا تو ایسے لوگ بھی نمایاں ہوئے جنھوں نے ان کی شان میں گستاخیاں کیں۔

اس زمانے میں اب ایسے لوگ بھی پیدا ہو گئے ہیں جو اللہ کے نبیؐ کو منصب نبوت سے نیچے اتار کر محض ایک مفکر اور محض ایک قومی لیڈر کی پوزیشن پر کھینچ لانے کی جدوجہد کر رہے ہیں۔ ائمہ دین اور محدثین کرام کو اسلام میں ایک "سازشی گروہ" ثابت کرنے کے لیے اپنی تمام توانائیاں صرف کر رہے ہیں۔ ان کے نزدیک احادیث کا تمام مجموعہ "عجمی سازش" کی پیداوار ہے۔ اس طرح یہ لوگ تفریط و تقصیر کے انتہائی آخری سرے پر پہنچ چکے ہیں۔

تیسرا گروہ معتدلین۔ یہ وہ لوگ ہیں جو توازن و اعتدال کی سیدھی راہ کے مسافر ہیں۔ افراط و تفریط کے درمیان توسط کی روش اختیار کیے ہوئے ہیں۔ انھوں نے ان ساری محبتوں اور عقیدتوں اور اکرام و احترام کے حدود خود اپنی خواہش کے مطابق مقرر نہیں کیے ہیں۔ درجات خود طے نہیں کیے ہیں اور فرقِ مراتب سے اچھی طرح

واقف ہیں۔ یہ خدا کی محبت و عقیدت، اس کی عظمت و ہیبت اور اس کی تعظیم و تبجیل پر کسی دوسری محبت و عقیدت اور کسی دوسرے اکرام و احترام کو غالب نہیں آنے دیتے، یہ اپنے مقصود آخری رضائے الٰہی کے حصول کو ہمیشہ پیش نظر رکھتے ہیں، خدا کی کتاب اور رسولؐ کی سنت نے جو حدود مقرر کر دیے ہیں نہ انھیں توڑتے ہیں اور نہ انھیں پھاند جانے کی جرأت کرتے ہیں، یہ انبیاء کرامؑ کے متعلق وہی عقیدہ رکھتے ہیں جس کی تعلیم خود خدا نے اپنی کتاب میں دی ہے۔ یہ صحابہ کرامؓ ائمہ دین اور صلحائے امت کو وہی حیثیت دیتے ہیں جو اسلام نے انھیں دی ہے، یہ لوگ نہ تو انھیں انبیاء کرامؑ کی طرح معصوم سمجھتے ہیں اور نہ ان کی شان میں گستاخی کرتے ہیں، یہ گروہ نہ تو ان کے علم و فضل اور صلاح و تقویٰ کی وجہ سے انھیں یہ حیثیت دیتا ہے کہ ان کے ہر قول و فعل کو بلا دلیل آنکھ بند کر کے تسلیم کرلے اور نہ یہ کہ ان کی بعض لغزشوں اور کوتاہیوں کی بنا پر ان کے تمام اقوال و افعال کو رد کر دے۔ اس گروہ کے نزدیک کسی کے قول و فعل کو جانچنے کی اصل کسوٹی صرف کتاب و سنت ہے۔ کسی کی محبت و عقیدت اور کسی کا احترام و اکرام اس پر اس قدر غالب نہیں آتا کہ کتاب و سنّت سے آنکھیں بند ہو جائیں۔ اس گروہ نے یہ روش نہ صرف یہ کہ کتاب و سنّت کی روشنی میں اختیار کی ہے بلکہ خود وہ لوگ بھی ہمیشہ اسی روش پر قائم رہے جن کی محبت و عقیدت میں غلو کرنے والے غلو کرتے ہیں یا تفریط کرنے والے تفریط کرتے ہیں۔

اس گروہ کی دشواری

روشِ اعتدال پر قائم رہنا کچھ آسان کام نہیں ہے یہ گروہ چکّی کے دو پاٹ کے درمیان پستا رہتا ہے۔ اس سے نہ پہلا گروہ خوش ہوتا ہے اور نہ دوسرا لیکن زیادہ ہدفِ ملامت یہ پہلے ہی گروہ کا بنتا ہے، افراط و غلو میں مبتلا لوگوں کی چوٹیں کھائے بغیر توسط و اعتدال پر قائم رہنا ممکن نہیں، یہ لوگ اعتدال پسندوں پر توہین صحابہؓ، توہین ائمہ، توہین صوفیہ یہاں تک کہ توہین انبیاءؑ تک کے الزام لگانے سے باز نہیں آتے اور اس سلسلہ میں اپنی صداقت و دیانت کے ایسے ایسے رنگا رنگ اور بوقلموں نمونے پیش کرتے ہیں کہ بس انھیں دیکھا کیجیے۔ عقل و فہم رکھنے والے لوگ ان کے نمونوں سے متاثر نہ بھی ہوں تو کم سے کم عوام کو یہ ضرور متاثر کر لیتے ہیں۔ یہ لوگ عوام کو

بھڑکانے اور مشتعل کرنے کا فن جانتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ بسا اوقات روش اعتدال پر قائم رہنے والوں کو عوام کے غیظ و غضب کا شکار ہونا پڑتا ہے۔ ابن جریر طبری کے عہد میں ایک واعظ نے یہ حدیث بیان کی کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے ساتھ عرش پر بٹھائے گا۔ ابن جریر طبری کو معلوم ہوا تو انھوں نے اپنے دروازے پر ایک تختی لگا دی جس پر لکھا ہوا تھا کہ "خدا کا کوئی ہم نشیں نہیں" یہ دیکھ کر عوام نے ان کے دروازے پر اتنے پتھر برسائے کہ ان کا دروازہ پتھروں سے ڈھک گیا۔ ابن جریر طبری اپنے وقت کے مشہور مورخ، محدث اور مفسر تھے۔ جب ان کے ساتھ یہ برتاؤ کیا گیا تو اسی سے اندازہ لگائیے کہ دوسرے کم درجہ لوگوں کے ساتھ کیا کچھ کیا جاتا ہوگا۔ انھیں کا یہ واقعہ بھی تاریخوں میں مذکور ہے کہ محض اس بنا پر کہ انھوں نے امام احمد بن حنبلؒ کو ائمہ مجتہدین میں شمار نہیں کیا بلکہ انھیں صرف اعلیٰ درجہ کا محدث تسلیم کیا، حنبلیوں نے ان کا راستہ چلنا دشوار کر دیا۔ یہ تو محض نمونہ کے طور پر ایک مثال پیش کی گئی ہے ورنہ اس طرح کی کتنی ہی مثالیں تاریخ میں محفوظ ہیں۔ علامہ ابن قیم نے اپنی کتاب اعلام الموقعین میں اسی طرح کے الزام توہین و تنقیص کی بنا پر چند صفحات میں عقیدت و احترام کے حدود کی وضاحت کی ہے۔ ہم اس نفیس بحث کے چند اقتباسات یہاں درج کرتے ہیں۔

ابن قیم کی تحریر

"سب سے اہم بات تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ، اس کے رسولؐ، اس کی کتاب اور اس کے دین کا حق سب سے بالا و بلند ہے، ہمارے لیے ضروری ہے کہ اللہ کے دین کو تمام ایسے اقوال باطلہ سے پاک و صاف کریں جو خدا کی اتاری ہوئی ہدایات و بینات کے مخالف ہوں کیوں کہ وہ خدا کی حکمت و مصلحت اور عدل و رحمت کے خلاف ہیں۔ ہم تمام ایسے اقوال کو دین سے نکال باہر کریں گے، چاہے ان کو دین میں داخل کرنے والا کوئی شخص بھی ہو اور اس نے انھیں کسی غلط تاویل ہی کی بنا پر کیوں نہ داخل کیا ہو۔

دوسری بات یہ کہ ائمۂ اسلام کے فضل وکمال، قدر ومنزلت، درجات ومراتب اور ان کے حقوق کی معرفت بھی ہمیں ہونی چاہیے۔ ائمہ اسلام کے بارے میں دو رویے اختیار کیے جاتے ہیں۔ ایک یہ کہ ان کے تمام اقوال کو قبول کرلیا جائے۔ دوسرا یہ کہ اگر ان کے کچھ اقوال اور فتووں میں غلطیاں موجود ہوں اور وہ کتاب وسنت کے مطابق نہ ہوں تو ان کے تمام اقوال اور تمام فتووں کو پھینک دیا جائے، ان کی شان میں گستاخیاں کی جائیں اور ان کی تنقیص کی جائے۔ یہ دونوں ہی رویے راہِ اعتدال سے دور ہیں اور اعتدال کی راہ ان کے وسط میں ہے۔ ہم نے یہی اعتدال کی راہ اختیار کی ہے اس لیے ہم نہ انھیں گنہ گار قرار دیتے ہیں اور نہ انھیں معصوم سمجھتے ہیں۔ ان ائمہ اسلام کے متعلق نہ ہمارا وہ مسلک ہے جو روافض نے حضرت علیؓ کے بارے میں اختیار کیا ہے اور نہ وہ مسلک ہے جو انھوں نے حضرات ابوبکرؓ وعمرؓ کے بارے میں پسند کیا ہے بلکہ ہمارا مسلک ان ائمہ اسلام سے متعلق وہی ہے جو خود انھوں نے اپنے ماسبق صحابۂ کرامؓ کے بارے میں اختیار کیا ہے۔ صحابۂ کرامؓ کے بارے میں ائمۂ اسلام کا مسلک یہی ہے کہ وہ نہ ان کو گنہ گار قرار دیتے ہیں اور نہ ان کی معصومیت کے قائل ہیں اسی طرح وہ نہ ان کے تمام اقوال کو قبول کرتے ہیں اور نہ سب کو رد کرتے ہیں۔ پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ لوگ کس طرح ائمۂ اربعہ کے بارے میں ہمارے اس مسلک کا انکار کرتے ہیں۔ جب کہ خود ان کا مسلک صحابۂ کرامؓ کے بارے میں یہی ہے۔ جس شخص کا سینہ اللہ نے اسلام کے لیے کھول دیا ہے وہ ان دو باتوں کے درمیان کوئی منافات نہیں پاتا کہ ایک طرف ائمۂ اسلام کا پورا احترام کیا جائے اور دوسری طرف ان کے تمام اقوال اور تمام فتووں کو قبول نہ کیا جائے۔ ان دو باتوں کے درمیان تضاد ومنافات اسی شخص کو محسوس ہوتی ہے جو یا تو ائمہ کے فضل اور ان کی قدر ومنزلت سے ناواقف ہو یا اس شریعت کی حقیقت نہ جانتا ہو جسے دے کر اللہ نے اپنے رسولؐ کو مبعوث کیا۔

جو شخص واقعات اور شریعت کا علم رکھتا ہے وہ قطعیت کے ساتھ یہ بات جانتا ہے کہ جلیل القدر اور بلند مرتبہ انسان سے بھی کبھی لغزش سرزد ہوتی ہے اور وہ اس غلطی ولغزش میں معذور بلکہ اپنے اجتہاد وسعی کی وجہ سے مستحق اجر ہوتا ہے۔

اس سے یہ بات واضح ہوئی کہ نہ تو اس غلطی میں اس شخص کی پیروی واتباع جائز ہے اور نہ یہ جائز ہے کہ اس کی امامت وفضیلت کی تنقیص کی جائے اور مسلمانوں کے دلوں میں اس

کی جو قدر و منزلت ہے اسے گھٹایا جائے۔

ایک بار عبداللہ بن مبارکؒ سے گفتگو کرتے ہوئے کچھ لوگوں نے امام نخعیؒ و شعبیؒ اور چند دوسرے ائمہ کے نام بطور حجت و دلیل پیش کیے، اس پر ابن مبارکؒ نے فرمایا۔ کسی مسئلے میں گفتگو کرتے وقت لوگوں کے نام نہ پیش کرو، اس لیے کہ بہتیرے اسلامی فضائل و مناقب رکھنے والے انسان سے بھی کبھی لغزش ہوتی ہے تو کیا کسی شخص کے لیے جائز ہے کہ اس غلطی کو دلیل میں پیش کرے؟

شیخ الاسلام ابن تیمیہ نے فرمایا کہ ابن مبارک نے جس بات کا ذکر کیا ہے وہ علماء کے درمیان متفق علیہ ہے اس لیے کہ متقدمین و متاخرین میں کوئی ایک امام جلیل القدر بھی ایسا نہیں ہے جس کے تمام اقوال سنت کے مطابق ہوں بلکہ ان میں سے ہر ایک کے چند اقوال وافعال ایسے بھی ہیں جہاں سنت ان پر مخفی رہی اور سنت سے لاعلمی کی بنا پر انھوں نے وہ اقوال وافعال اختیار کر لیے۔

مجاہد، حکم ابن عتیبہ، مالک اور دوسرے ائمہ دین نے فرمایا ہے۔

لیس احد من خلق اللہ الا یوخذ من قولہ ویترک الا النبی صلے اللہ علیہ وسلم۔	نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا کسی شخص کو یہ درجہ حاصل نہیں کہ اس کے تمام اقوال قبول کر لیے جائیں بلکہ اس کے بعض اقوال قبول کر لیے جاتے ہیں اور بعض ترک کر دیے دیتے ہیں۔

ابن عبد البر نے کہا ہے کہ یہ ایک اجماعی مسئلہ ہے اور اس مسئلہ میں مجھے کسی کے اختلاف کا علم نہیں۔ اس سلسلہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے اصحاب سے بھی روایتیں آئی ہیں جن پر غور کرنا چاہیے۔

ایک صحابی کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا۔ اپنے بعد اپنی امت کے بارے میں مجھے تین باتوں کا خطرہ ہے۔ لوگوں نے پوچھا کہ یا رسول اللہؐ وہ تین باتیں کیا ہیں؟ آپؐ نے فرمایا:

۱۔ عالم کی لغزش ۲۔ ظالم کی حکومت ۳۔ خواہش نفس کی پیروی۔

زیاد بن حدیر کہتے ہیں کہ حضرت عمرؓ نے فرمایا۔ تین چیزیں دین کو برباد کر دیتی ہیں۔

عالم کی غلطی ۔ منافق کا مجادلہ بالقرآن ۔ گمراہ امراء ۔

حضرت معاذ بن جبل جب خطبہ دیتے تھے تو ایسا بہت کم ہوتا تھا کہ اس میں یہ باتیں نہ فرماتے ہوں:

• اللہ، حاکم عادل ہے، شک کرنے والے ہلاک ہوئے۔ تمھارے پیچھے طرح طرح کے فتنے آرہے ہیں۔ ان ایام میں مال کی کثرت ہوگی اور قرآن کی تلاوت عام ہوجائے گی یہاں تک کہ مومن، منافق، عورتیں بچے، کالے، گورے سبھی اس کو پڑھیں گے وہ وقت قریب ہے کہ ان میں سے کوئی (اپنے دل میں) یہ کہے کہ میں نے قرآن پڑھ لیا لیکن میں نہیں سمجھتا کہ جب تک میں قرآن کے علاوہ کچھ اور گھڑ نہ لوں، لوگ میرے اتباع پر آمادہ ہوں گے" یہ بیان کرکے حضرت معاذ فرماتے "اے لوگو، ایسے اشخاص کی دل سے گھڑی ہوئی باتوں (بدعات) کی پیروی نہ کرنا اس لیے کہ ہر بدعت ضلالت ہے اور میں تمہیں خبردار کرتا ہوں کہ مرد حکیم کی گمراہی سے بچنا۔ اس لیے کہ شیطان کبھی مرد حکیم (مرد مومن) کی زبان سے کلمۂ ضلالت کہلوا دیتا ہے اور کبھی مرد منافق کلمۂ حق ادا کرتا ہے لہٰذا تمھارے لیے یہ لازم ہے کہ حق کو اختیار کرو، چاہے اسے پیش کرنے والا کوئی ہو، اس لیے کہ حق میں ایک نورانیت ہوتی ہے"۔ لوگوں نے پوچھا ایک حکیم وفہیم شخص کی گمراہی کی علامت کیا ہے؟ حضرت معاذ نے فرمایا "ایسی بات جو تمھیں گھبرا دے، تم اس کا انکار کرنے لگو اور کہنے لگو کہ یہ کیا ہے؟ لہٰذا تم ایسی گمراہ کن بات سے پرہیز کرو لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ تم اس مرد حکیم (مومن) کی تمام باتوں کا انکار کرنے لگو اور اس سے ملنا ترک کر دو، اس لیے کہ کچھ بعید نہیں کہ وہ حق کی طرف رجوع کرے علم اور ایمان قیامت تک موجود رہیں گے لہٰذا جو شخص بھی ان دونوں کو تلاش کرے گا پالے گا"۔

حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے۔ انھوں نے فرمایا کہ عالم کی لغزشوں اور غلطیوں کی پیروی کرنے والوں کے لیے تباہی ہے، لوگوں نے پوچھا یہ کیسے، آپ نے فرمایا، ایسا یوں ہوتا ہے کہ کوئی عالم اپنی رائے سے کوئی مسئلہ بتاتا ہے پھر وہ ایسے شخص کو پالیتا ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں اس سے زیادہ علم رکھتا ہے تو وہ اپنی رائے ترک کر دیتا ہے لیکن اس کے متبعین اس کے پہلے ہی قول کی پیروی کرتے رہتے ہیں ——— یہ تمام آثار واحادیث ابوعمرؒ نے بیان کی ہیں۔

ان تمام تفصیلات سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ہمیں نہ تو علمار کی لغزشوں اور غلطیوں کی پیروی کرنی چاہیئے اور نہ ان سے ترک تعلق کرنا چاہیئے۔ جس شخص کا سینہ اللہ نے اسلام کے لیے کھول دیا ہے اس پر لازم ہے کہ جب بعض ائمہ کا کوئی ضعیف قول اس تک پہنچے تو وہ اس قول کو ان لوگوں تک نہ پہنچائے جو اس امام کی تقلید کرتے ہیں بلکہ اس کا یہ رویہ ہونا چاہیئے کہ اگر اس قول کی صحتِ نسبت پر اسے یقین ہے تو خاموش رہے اور دوسروں سے اس قول کا ذکر نہ کرے اور اگر شک ہے تو اس قول کو اس امام کی طرف منسوب کرنے میں توقف کرے اس لیے کہ بہت سے ایسے اقوال ہیں جو ائمہ کی طرف منسوب کیے جاتے ہیں حالانکہ ان کی طرف ان کی نسبت صحیح نہیں ہے[1]

ابن قیم کی یہ تحریر روش اعتدال کی پوری نمائندگی کرتی ہے جو لوگ اس روش کو پسند کرتے ہیں انھیں سنجیدگی کے ساتھ اس پر غور کرنا چاہیئے۔

ہماری روش

خدا کا شکر ہے کہ ہم نے تیسرے ہی گروہ کی روش پسند کی ہے اور پوری کوشش کرتے ہیں کہ اعتدال و توسط سے ہٹنے نہ پائیں اس سلسلہ میں ہمیں کچھ لکھنا نہیں ہے۔ ہم پر تصوف کی مخالفت اور بزرگانِ دین کی توہین وتنقیص یہاں تک کہ انبیار کرام کی توہین وتنقیص کا جو الزام لگایا جارہا ہے وہ کوئی نیا الزام نہیں ہے، اس روش پر قائم رہنے والوں کو اس سے پہلے بھی سابقہ پیش آیا ہے آج بھی آرہا ہے اور شاید کل بھی پیش آئے گا۔

اس تحریر کے دو مقصد ہیں ایک تو یہ کہ اسے پڑھ کر شاید کوئی منصف مزاج ہماری روش پر غور کر سکے اور دوسرا یہ کہ ہم خود پوری طرح متنبہ اور چوکنا رہیں، جو لوگ بھی دعوتِ اسلامی کو لے کر آگے بڑھنا چاہتے ہیں انھیں ہمیشہ اعتدال و توسط کو پیش نظر رکھنا چاہیئے۔ جس طرح یہ ضروری ہے کہ ہم افراط وغلو کے قریب نہ پھٹکیں بالکل اسی طرح یہ بھی لازم ہے کہ ہم تفریط و تقصیر کی طرف نہ لڑھک جائیں۔ ہمیں ہمیشہ اپنی زبان

---

[1] اعلام الموقعین ج ۳ مطبوعہ: مصر صہ ۲۴۷ تا صہ ۲۵۰

اور اپنے قلم کی نگرانی کرتے رہنا چاہیئے تاکہ بزرگانِ دین کی شان میں کوئی ایسا جملہ نہ نکل جائے جس سے ان کی تحقیر و تنقیص ہوتی ہو، ہم الزامات واتہامات کو روک نہیں سکتے لیکن اپنی روش کا جائزہ ضرور لے سکتے ہیں اور ہمیں یہ جائزہ لیتے رہنا چاہیئے۔

دسمبر ۱۹۵۵ء

فقہ و تصوّف چوتھی صدی ہجری میں

ایک مختصر تاریخی جائزہ[1]

چوتھی صدی ہجری میں فقہ نے ایک نیا پلٹا کھایا اور اس میں ایک جدید تبدیلی پیدا ہوئی، اس تبدیلی کا سب سے بڑا مظہر یہ تھا کہ اجتہاد کا دروازہ بند کر دیا گیا۔ گذشتہ صدیوں میں فقہ نے جو بلندی حاصل کی تھی بس اسی پر اکتفا کر لیا گیا اور اس صدی کے علماء نے گزشتہ مذاہب فقہ کی تقلید ہی کو اپنا طرۂ امتیاز بنا لیا۔ فقیہ قیروان سعید بن حداد نے یہ بات کہی تھی کہ جس چیز نے اکثر لوگوں کو تقلید اختیار کرنے پر مجبور کیا وہ ہمت کی پستی اور عقل و ذہانت کی کمی تھی،" سعید بن حداد کی وفات ۳۰۲ھ میں ہوئی تھی۔ مخالفت اجتہاد کا نتیجہ یہ نکلا:-

۱۔ اس صدی کے فقہاء نے جو کام کیا وہ یہ تھا کہ اپنی کتابوں میں اگلے فقہا کے مذاہب اور ان کی عبارتیں نقل کیں اور ساری توجہ متقدمین کی کتابوں کی شرح کرنے، اور ان کو سمجھنے سمجھانے اور ان کو مختصر کرنے میں صرف ہونے لگی۔

۲۔ کم سے کم الفاظ میں زیادہ سے زیادہ فروعی مسائل کو جمع کر دینے کا رواج ہوا۔

۳۔ کچھ فقہا نے متقدمین کی کتابوں پر صرف حاشیہ نویسی ہی کو کافی سمجھا۔

۴۔ فرضی مسائل کی کثرت ہوئی، یعنی بکثرت ایسے مسائل لکھ کر ان کے جواب دینے کی کوشش شروع ہوئی جو واقع نہیں ہوئے تھے بلکہ محض فرض کر لیے گئے تھے ــــــ فقہ میں اس تقلید جامد

---

[1] اس مضمون کا اکثر حصہ احمد امین مصری مرحوم کی کتاب ظہر الاسلام سے ترجمہ کیا گیا ہے۔

کا سبب اس عہد کی سیاسی و اجتماعی تاریخ میں ڈھونڈنا چاہیے، اس عہد کی سیاسی تاریخ یہ تھی کہ خلفاء کبھی ترکوں کے تسلط و اقتدار میں تھے اور کبھی دیلمیوں کے، یہ لوگ نہ تو عربی زبان سے اچھی طرح واقف تھے اور نہ انھیں اسلامی تربیت کا کوئی حصہ ملا تھا، یہ صرف نشۂ اقتدار میں سرمست تھے۔ جور و جفا اور جبر و استبداد ان کا شیوہ تھا، ترکی اکثر و بیشتر ایسے ہی تھے، لیکن انھیں علوم و فنون اور ان کی ترقی سے کوئی دل چسپی نہ تھی، بنی بویہ دیلمی شیعہ تھے اور وہ یہ پسند نہیں کر سکتے تھے کہ اہل سنت کی فقہ ترقی کے مدارج طے کرے، ایسے دور انحطاط میں اگر فقہ کے اندر جمود و خمود پیدا ہوا تو یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے، عام طور پر عوام و خواص کے حوصلے پست اور ان کی قوت فکریہ ٹھٹھر کر رہ گئی تھی۔

فقہ کی اس جدید تبدیلی کا ایک دوسرا مظہر یہ تھا کہ مختلف مذاہب فقہ کو ماننے والوں میں مذہبی تعصبات شدت اختیار کر گئے، حالانکہ جن ائمہ کی پیروی کا وہ دعویٰ کرتے تھے خود ان کے درمیان اس لغو تعصب کا پتہ بھی نہ تھا۔ بلکہ وہ ایک دوسرے کا احترام کرتے تھے، دوسروں کے لیے انھوں نے اجتہاد کا دروازہ بند نہیں کیا تھا اور وہ حریت رائے کی قدر و قیمت سے واقف تھے، امام شافعی اس کے باوجود کہ وہ مذہب حنفی پر بہت تنقید کیا کرتے تھے، امام ابو حنیفہؒ کے بارے میں انھوں نے یہ رائے ظاہر کی:

"الناس فی الفقہ عیال علی ابی حنیفہ" (لوگ فقہ میں ابو حنیفہ کے محتاج ہیں)

وہ یہ بھی کہا کرتے تھے: "مذھبنا صواب یحتمل الخطأ ومذھب غیرنا خطأ یحتمل الصواب" (ہمارا مذہب درست ہے لیکن اس میں غلطی کا احتمال ہے اور ہمارے غیر کا مذہب غلط ہے لیکن اس میں اس کا بھی احتمال ہے کہ وہ صحیح و درست ہو") یہ رواداری و مسالمت چوتھی صدی ہجری میں ختم ہو گئی اور آپس میں دنگا و فساد شروع ہوا۔ زیادہ سے زیادہ اس صدی میں جو اجتہاد لوگوں نے کیا وہ اجتہاد فی المذہب تھا یعنی اگر امام سے کسی مسئلہ میں دو روایتیں منقول ہیں تو ان میں سے کسی ایک کو ترجیح دے دینا۔

تیسری چیز اس صدی میں یہ پیدا ہوئی کہ کسی مذہب فقہ کو اگر کوئی اختیار کرے تو بتمام و کمال اختیار کرے اگر وہ حنفی ہو تو پورے کا پورا حنفی ہو اور اگر شافعی ہو تو پورے کا پورا شافعی ہو،

کسی حنفی کے لیے یہ جائز نہ تھا کہ کسی مسئلے میں مذہب شافعی کی رائے اختیار کرے اور کسی شافعی کے لیے یہ درست نہ تھا کہ فقہ حنفی کا کوئی مسئلہ پسند کرے، کسی ایک مذہب فقہ سے کسی دوسرے مذہب فقہ کی طرف منتقل ہونا گویا ایک دین سے دوسرے دین کی طرف منتقل ہونے کے برابر سمجھا جاتا تھا، یہ مذہب فقہ مستقل، ایک دین بن گیا تھا۔

ایک طرف تو فقہ کا یہ حال تھا اور دوسری طرف تصوف نے بھی ایک نیا رنگ اختیار کیا۔ تیسری صدی ہجری کے وسط سے تصوف میں ہندی اور یونانی فلسفے داخل ہوتے لگے اور اس کی قدیم سادگی ختم ہونے لگی۔ عراق میں سب سے پہلے حارث محاسبی نے تصوف میں فلسفہ داخل کیا، خواطر و وساوس نیز دوسرے مسائل پر انھوں نے جو گفتگو کی اس سے مسلمانوں کے کان نا آشنا تھے، خود امام احمد بن حنبل نے اس پر سخت انکار کیا اور اسے بدعت قرار دیا، حنابلہ کے شدید انکار کی وجہ سے عوام نے بھی اسے ناپسند کیا اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ حارث محاسبی کو عوام کی نگاہ سے مخفی ہو جانا پڑا اور جب ان کی وفات ہوئی تو جنازے میں صرف چار اشخاص شریک تھے۔ حارث محاسبی اصلا بصرہ کے رہنے والے تھے انھوں نے بہت ساری کتابیں لکھیں اور ان کی تالیفات کو یہ درجہ حاصل ہوا کہ امام غزالیؒ نے اپنی کتابوں میں اصول کی حیثیت سے ان پر اعتماد کیا ہے۔ ۲۴۳ھ میں ان کی وفات ہوئی۔ حنابلہ کے شدید انکار کے باوجود اور عوام کی ناپسندیدگی کے باوصف حارث محاسبی نے جو دروازہ کھولا تھا وہ بند نہ ہو سکا اور تصوف میں فلسفہ داخل ہوتا رہا، یہاں تک کہ چوتھی صدی ہجری میں اس نے فلسفہ کا گہرا رنگ اختیار کر لیا اور اس میں مسئلہ وحدت الوجود تک کی ابتدا ہو گئی۔

فقہا اور صوفیہ میں جو نزاع برپا ہوئی تھی اس نے بھی شدت اختیار کر لی اور اب فقہا اور صوفیہ دو متخاصم گروہوں کی شکل میں ایک دوسرے کے سامنے کھڑے ہو گئے، ایک دوسرے پر اتہامات و الزامات کی بارش ہونے لگی۔ حنابلہ نے تو کوشش کی کہ جس طرح انھوں نے معتزلہ کا زور توڑ دیا ہے اسی طرح صوفیہ کی قوت بھی ختم کر دیں لیکن وہ اس میں کامیاب نہ ہو سکے۔ فقہا اور صوفیہ میں اس وقت جو نزاع برپا ہوئی وہ بالکل طبعی تھی کیوں کہ دونوں گروہوں کے میلانات و رجحانات ایک دوسرے سے مختلف تھے۔ صوفیہ کا اعتماد، قلب،

ذوق، باطن اور ایسی معرفت پر تھا جو بطریق الہام حاصل ہوتی ہے اور فقہا کا اعتماد ظاہر کتاب وسنت پر تھا۔ ان کے نزدیک باطن کوئی شے نہ تھی اور نہ ظاہر نصوص اور ان کے معانی کے فہم سے الگ کوئی "حقیقت" انھیں تسلیم تھی۔ صوفیہ کی توجہ زیادہ تر روح اور نفس پر تھی اور فقہا کی توجہ شریعت کی ظاہری وعملی حیثیت پر۔ کہنا چاہیے کہ صوفیہ کا گروہ روحانی اور فقہا کا گروہ محض قانونی تھا۔ صوفیہ کی اصل توجہ محبت الٰہی کی طرف تھی اوامر ونواہی پر ثواب وعتاب کا معاملہ انھیں کچھ زیادہ متوجہ نہ کرتا تھا اور فقہا کی اصل توجہ ثواب وعقاب ہی کی طرف تھی، وہ عبادت اس لیے کرتے تھے کہ ثواب حاصل ہو اور گناہوں سے اس لیے بچتے تھے کہ عقاب سے محفوظ رہیں۔ اطاعت کے سوا محبت الٰہی کا کوئی اور تصور ان کے نزدیک ناقابل تسلیم تھا۔ ان میلانات کے پیش نظر اگر ان دو گروہوں میں تصادم ہوا تو یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔ عام طور سے فقہا نے روح اعمال سے نظر پھیر لی تھی اور صرف ظاہر اعمال پر اکتفا کرنے لگے تھے اور صوفیہ نے روح اعمال پر نظر جمالی تھی اور ظاہر کی طرف زیادہ متوجہ نہ تھے، دونوں گروہ ایک ایک کنارے پر کھڑے تھے۔ صوفیہ الزام لگاتے تھے کہ فقہا نے محض چھلکوں پر قناعت کرلی ہے، ان کی عبادتوں سے مغز غائب ہے۔ فقہا جواب میں کہتے تھے کہ صوفیہ نے دین میں غلو کی روش اختیار کی ہے اور احوال روح کی ایسی تشریحیں کر رہے ہیں جن میں سے اکثر کا اسلامی تعلیمات میں کہیں پتہ نہیں ہے۔

یہاں ایک اور پہلو بھی ہے جس سے ان دو گروہوں کے درمیان کش مکش کا سبب معلوم ہوتا ہے، درحقیقت یہ دو گروہوں کا ٹکراؤ نہ تھا بلکہ دو مکاتب فکر کا تصادم تھا۔ ایک طرف تو یہ عقیدہ تھا کہ خدا اور اس کی مخلوق دو الگ الگ مستقل وجود ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انسانوں سمیت یہ کائنات پیدا کی اور اسی نے ان کو وجود بخشا، وہی ہے جو نظام کائنات کو کمال حکمت سے چلا رہا ہے۔ چھوٹی سے چھوٹی اور بڑی سے بڑی چیز اس کے حیطۂ اقتدار میں جکڑی ہوئی ہے، وہ سب سے بڑا اور سب سے بلند وبرتر ہے، وہ ہر جگہ موجود ہوتے ہوئے بھی کسی جہت اور کسی مقام کے ساتھ محدود نہیں ہے، اس کی حقیقت تمام کائنات سے وراء الوراء ہے اور اس پوری کائنات میں دو وجود ایک دوسرے سے بدرجۂ کمال متمیز اور جدا ہیں، ایک وجود خالق کا ہے اور دوسرا مخلوق کا، ایک وجود حاکم کا ہے اور دوسرا محکوم کا،

ایک وجود بادشاہ کا ہے اور دوسرا اس کی رعیت کا، خدا خالق ہے اور تمام دنیا اس کی مخلوق، وہ حاکم ہے اور پوری کائنات اس کی محکوم، وہ بادشاہ ہے اور تمام انسان، فرشتے اور جن اس کی رعیت ــــ اس عقیدے کے مقابلے میں دوسرا خیال یہ ہے کہ اس پوری کائنات میں خدا کے سوا کوئی موجود نہیں ہے ــــ لاموجود الا اللہ، خالق و مخلوق اور حاکم و محکوم الگ الگ دو شے نہیں ہیں بلکہ دونوں ایک ہی ہیں، ایک ہی حقیقت کی دو تعبیریں ہیں اور اس کے سوا کچھ نہیں، یہ وحدۃ الوجود کا نظریہ ہے جس کی ابتدا چوتھی صدی ہجری میں ہو چکی تھی، ابو منصور حلاج کے یہ اشعار ہم تک پہنچے ہیں۔

انا من اھوی و من اھوی انا	نحن روحان حللنا بدنا
فاذا ابصرتہ ابصرتنی	واذا ابصرتنی ابصرتنا[1]

یہ دو افکار تھے جو آپس میں ٹکرا رہے تھے۔ پہلا مکتب فکر فقہاء کا تھا اور دوسرا اکثر صوفیاء کا، وحدۃ الوجود کا یہی نظریہ تھا جس کو چھٹی صدی ہجری میں محی الدین بن عربی متوفی ۶۳۸ھ نے ایک مستقل فن بنا دیا اور اس میں امامت کا درجہ حاصل کیا۔ فقہا کی باتیں "شریعت" اور صوفیہ کا کلام "حقیقت" اور اس بنیاد پر فقہا کا نام اہل شریعت اور صوفیہ کا نام اہل حقیقت رکھا گیا اور دونوں ایک دوسرے سے جھگڑتے رہے۔ ان دو افکار کی بنا پر لازماً قرب الٰہی کے حصول کے طریقے بھی مختلف ہو گئے تھے، فقہا، ادائے عبادات کے بعد علوم دینیہ، تفسیر و حدیث و فقہ و اصول میں ترقی و مہارت اور ان علوم کی خدمت و اشاعت کو قرب الٰہی کا ذریعہ بنائے ہوئے تھے اور ان کا خیال تھا کہ اسی طریقے سے خدا کا قرب حاصل ہو سکتا ہے، صوفیہ عام طور سے ادائے عبادت کے بعد، ریاضت و اعمال شاقہ کے ذریعہ خدا تک پہنچتے تھے۔ اور ان کا خیال تھا کہ اسی طرح خدا کا قرب حاصل کیا جا سکتا ہے، وہ سمجھتے تھے کہ خدا کی ذات و صفات کا علم "معرفت" سے حاصل ہوتا ہے اور معرفت ریاضت سے حاصل ہوتی ہے جب

---

[1] میں کس سے محبت کرتا ہوں اور وہ کون ہے جس سے میں محبت کرتا ہوں۔ ہم دو روحیں ہیں جو ایک بدن میں حلول کر گئی ہیں جب تو نے اس کو دیکھا تو مجھ کو دیکھا اور جب تو نے مجھ کو دیکھا تو ہم دونوں کو دیکھا۔

ایک شخص نفس کشی، فاقہ کشی، شب بیداری اور لذائذ سے اجتناب کا مکمل نصاب پورا کر لیتا ہے تو نفس میں صفائی پیدا ہو جاتی ہے اور خدا کا جلوہ اس میں منعکس ہونے لگتا ہے اور پھر کشف کے ذریعہ خدا کی معرفت حاصل ہو جاتی ہے اور رفتہ رفتہ وہ شخص فنا فی اللہ کا درجہ حاصل کر لیتا ہے۔ صوفیہ نے خدا کی معرفت کا جو طریقہ اور ذریعہ اختیار کیا تھا اس میں توہمات کو گھس آنے کا بہت موقع حاصل تھا۔ کشف کے ذریعہ جو چیزیں حاصل ہوتی ہیں اگر ان کو کتاب و سنت کی کسوٹی پر کس کر جانچ نہ لیا جائے تو بہت ممکن ہے کہ انسان، اوہام کو حقائق اور گمرہی کو ہدایت تصور کرنے لگے، چنانچہ حلاج اور ان جیسے دوسرے لوگ اسی وہم پرستی کا شکار ہوئے، کشف کے ذریعہ جو معرفت انھیں حاصل ہوئی تھی اس نے ان کو وحدۃ الوجود کی پر آشوب گھاٹی میں پہنچایا اور ان کی زبانیں 'انا الحق'، انا اللہ اور لیس فی جبتی سوی اللہ کے نعرے لگانے لگے۔ حلاج کا واقعہ چوتھی صدی ہجری کا ایک بڑا فتنہ انگیز حادثہ تھا جس نے نہ صرف اس صدی کو متاثر کیا بلکہ آج تک اس کے اثرات موجود ہیں، حلاج کے حالاتِ زندگی اور ان کے حادثۂ قتل کی تفصیلات ہمیں یہ بتاتی ہیں کہ وہ ایک شدید قسم کے وہم میں مبتلا ہو گئے تھے اور انھوں نے زیادتی یہ کی تھی کہ اپنے اس وہم کو دوسروں کے سامنے ظاہر کرنا اور اسے پھیلانا شروع کر دیا تھا۔ ان کی زندگی اور حادثۂ قتل کے بارے میں یہاں چند اشارات نامناسب نہ ہوں گے۔

حسین بن منصور الحلاج فارسی الاصل تھے۔ ۲۴۴ھ میں بمقام "بیضا" پیدا ہوئے۔ واسط میں نشو و نما پائی۔ شروع ہی سے ان کا مزاج گرم تھا اور طور طریقہ عجیب و غریب تھا۔ سولہ سال کی عمر ہی سے یہ تصوف میں مشغول ہو گئے۔ وقت کے مشہور صوفی سہل التستری متوفی ۲۸۳ھ کی صحبت اختیار کی، پھر وہاں سے بغداد گئے اور وہاں اٹھارہ سال مقیم رہے پھر جنید بغدادیؒ کی صحبت میں بیٹھے، اس کے بعد حج کے لیے مکہ معظمہ گئے اور وہاں تقریباً ایک سال مقیم رہے۔ یہاں عمرو مکی نے ان پر یہ الزام لگایا کہ وہ قرآن کا معارضہ کر رہے ہیں۔ واقعہ یہ تھا کہ ایک دن حلاج کچھ لکھ رہے تھے۔ عمرو مکی نے ان سے پوچھا کہ کیا کر رہے ہو؟ انھوں نے جواب میں کہا کہ قرآن کا معارضہ کر رہا ہوں۔ یعنی ایسی چیز تیار کر رہا ہوں جو قرآن کے مقابلے میں پیش کی جا سکے، یہ سُن کر عمرو مکی نے ان پر لعنت بھیجی اور اگر وہ مکے سے چلے نہ

جاتے تو شاید وہیں قتل کر دیئے جاتے۔ مکہ سے جاتے ہوئے انھوں نے صوفیہ کا لباس اتار دیا اور خراسان وماوراء النہر اور دوسرے مقامات کا تقریباً پانچ سال تک گشت لگاتے رہے، پھر دوسری بار حج کو گئے، اور وہاں سے پھر بغداد پہنچے، وہاں کچھ دنوں قیام کر کے ہندوستان گئے اور کہا جاتا ہے کہ وہاں سحر کی تعلیم حاصل کی، پھر تیسری بار حج کو گئے۔ واپسی میں فارس اور خصوصیت کے ساتھ مقام "قم" کی سیر کی۔ قم اس وقت فرقۂ امامیہ کا مرکز تھا ــــــ ۲۹۷ھ میں ابن ابوداؤد ظاہری نے ان پر کفر کا فتویٰ لگایا، ..... اس کے بعد وہ اہواز میں مخفی ہو گئے۔ یہیں ان پر دعوئے الوہیت کا اتہام لگا اور سات سال تک مختلف جیل خانوں میں پڑے رہے لیکن اس کے باوجود وہ اپنی "دعوت" سے باز نہ آئے، یہاں تک کہ خلیفۂ وقت کے بعض امرا ان پر ایمان لے آئے اور آخری نتیجہ یہ ہوا کہ باضابطہ ان پر مقدمہ چلا اور انھیں سولی دے دی گئی، یہ ان کی زندگی کا ایک بالکل مختصر خلاصہ ہے۔ اس سے اتنا تو یقینی طور پر معلوم ہوتا ہے کہ یہ جہاں گئے ان پر گمرہی وضلالت اور زندقہ کا اتہام لگایا گیا۔ کبھی معارضۂ قرآن کا اتہام لگا کبھی فرقۂ قرامطہ سے تعلق کا اتہام لگا اور کبھی دعویٰ الوہیت کا اتہام لگا۔ انھوں نے اپنے پیچھے جو کتابیں اور جو کلام چھوڑا ہے انہیں پڑھ کر بھی کوئی شخص ان کے بارے میں اچھی رائے قائم نہیں کر سکتا۔ ان کے واقعۂ قتل کا مختصر حال یہ ہے۔

خلیفہ مقتدر باللہ کے عہد خلافت اور حامد بن عباس کے عہد وزارت میں، حلاج کو قید کیا گیا اور وزیر کے حکم سے ان کا مقدمہ قاضی ابوعمر، قاضی ابوجعفر اور دوسرے قاضیوں کی ایک مشترک مجلس قضا میں پیش ہوا۔ ان پر جو الزامات تھے ان کی فہرست انھیں سنائی گئی، انھوں نے سارے الزامات کا انکار کیا۔ اس کے بعد گواہ پیش ہوئے جنھوں نے ان الزامات کی تصدیق کی۔ اسی اثنا میں قاضی ابوجعفر کے حکم سے ان کے اور ان کے دوسرے ساتھیوں کے گھر کی تلاشی لی گئی، اور وہاں سے ان کی کتابیں اور دوسرے خطوط وکاغذات حاصل کیے گئے، انہیں خطوط وکاغذات میں حج ادا کرنے کی ایک نئی ترکیب بھی درج تھی، لکھا تھا کہ کسی شخص کے لیے یہ کافی ہے کہ اپنے گھر کے کسی کمرے کو خاص کرے اور اس بات کا لحاظ رکھے کہ گندگی اور نجاست اس میں نہ جانے پائیں اور نہ کوئی دوسرا شخص اس میں داخل ہو۔ جب ایام حج آئیں تو وہ اس کمرے کا طواف کرے اور

جو مناسک مکے میں ادا کیے جاتے ہیں وہ سب ادا کرے۔ پھر تیس یتیموں کو جمع کر کے ان کو بہترین کھانا کھلائے، ان کی خدمت خود کرے، ان کے ہاتھ دھلائے، ہر ایک کو ایک قمیص اور سات درہم عطا کرے، اس طرح کرنے سے حج ادا ہو جاتا ہے۔ یہ عبارت حلاج کو سنائی گئی اور پھر صدر مجلس نے ان سے پوچھا، حج کی یہ ترکیب تم نے کہاں سے حاصل کی۔ حلاج نے جواب میں کہا کہ حسن بصریؒ کی کتاب الاخلاص سے، قاضی نے غصے میں کہا، اے گردن زدنی تو جھوٹا ہے۔ ہم سب نے حسن بصریؒ کی کتاب الاخلاص سنی ہے اور اس میں یہ سب کچھ نہیں جو تو نے لکھا ہے جب مقدمہ کی کارروائی ختم ہوئی تو وزیر نے قاضیوں سے محضر نامۂ قتل پر دستخط لیے اور آخری حکم کے لیے خلیفہ کے پاس بھیجا۔ مقتدر نے اس پر یہ توقیع لکھ کر واپس کیا۔ اگر قاضیوں کا فتویٰ وہی ہے جو تو نے میرے سامنے پیش کیا ہے تو مجرم کو پولیس اسٹیشن میں حاضر کر اور ایک ہزار کوڑے لگا اگر وہ اس پر بھی نہ مرے تو اس کے ہاتھ پاؤں کاٹ کر قتل کر دے۔ اور اس کے سر کو بلندی پر نصب کر اور اس کے جسم کو آگ میں جلا کر خاک کر دے۔"

دوسری صبح کو عوام کے مجمع عام میں حسین بن منصور الحلاج رحمۃ اللہ کے ساتھ وہ سب کچھ کیا گیا جو خلیفہ نے لکھا تھا۔ انھوں نے دو رکعت نماز پڑھی اور نہایت بہادری اور خوشی سے اپنی جان، جان آفریں کے سپرد کی۔ یہ واقعہ ۳۰۹ھ کا ہے۔

اس حادثۂ فاجعہ سے اس مخالفت و نزاع کی شدت کا پتہ چلتا ہے جو فقہا و صوفیہ کے درمیان برپا تھی۔ حالات سے پتہ چلتا ہے کہ اس قتل میں سیاست کو بھی دخل تھا، ان پر متعدد اتہامات جو لگائے گئے تھے ان میں ایک اتہام یہ بھی تھا کہ ان کا تعلق شیعوں کے اس فرقے سے ہے جو عباسی خلافت کو ختم کر کے علوی خلافت قائم کرنا چاہتا ہے اور شاید یہی وہ اتہام تھا جس نے خلیفۂ وقت اور اس کے ارکان دولت کے دلوں میں گھبراہٹ پیدا کر دی وقت کا بادشاہ سب کچھ برداشت کر سکتا ہے لیکن اپنے اقتدار کی مخالفت اسے کسی حال اور کسی رنگ میں گوارا نہیں ہوتی۔ حلاج کی زبان و قلم سے جو شطحیات نکلی تھیں اس میں وہ منفرد نہ تھے بلکہ کچھ اور صوفیہ بھی اس میں شریک تھے لیکن اقتدار وقت نے کسی کو وہ سزا نہ دی جو حلاج کو دی۔ کیوں کہ کسی اور صوفی پر حکومت کی بغاوت کا اتہام نہیں لگا تھا۔ ایک دوسرے پہلو

سے بھی اس قتل نے کوئی فائدہ نہیں پہنچایا بلکہ اس سے نقصان ہی پہنچا، عوام وخواص ان آراء وافکار اور اس فلسفیانہ تصوف کی طرف کچھ اور زیادہ متوجہ ہو گئے جس کی بنا پر حلاج کو قتل کیا گیا تھا اور ہم دیکھتے ہیں کہ وحدۃ الوجود کا نظریہ اس کے بعد کمزور ہونے کے بجائے اور زیادہ زور پکڑ گیا۔ اگر کتاب و سنت کے دلائل سے حلاج کے افکار وآراء کو بدلنے کی کوشش کی جاتی اور ان کے اس وہم کو دور کر دیا جاتا جس میں وہ مبتلا ہو گئے تھے تو نہ ان کے قتل کی نوبت آتی اور نہ وہ افکار اس تیزی سے پھیلتے جس تیزی سے واقعۂ قتل کے بعد پھیل گئے ـــ مثلاً نظریۂ وحدۃ الوجود کو حلاج اپنی کتاب "الطواسین" میں ایک جگہ یوں لکھتے ہیں ۔

"اس وقت جب خدا کے سوا کوئی نہ تھا، خدا نے اپنی ذات پر ایک نظر ڈالی اور اس کے بعد اپنی ذات سے اسے ایسی محبت پیدا ہوئی جو ہر طرح کے نقص وعیب سے پاک تھی اور جس کی نہ کوئی تعریف بیان کی جا سکتی ہے اور نہ کوئی کیفیت، یہی محبت تمام مخلوقات کے وجود کی علت ہے اور یہی کثرتِ وجود کا سبب۔ پھر حق سبحانہ نے چاہا کہ اس محبت ذاتی کو کسی صورت خارجی کی تمثیل میں ملاحظہ کرے۔ چنانچہ اس نے اپنی ہی ذات سے ایک صورت پیدا کی جس کو اپنی تمام صفات اور اپنے تمام اسماء عطا کیے تاکہ وہ اپنی ہی ذات کا مشاہدہ کرے اور اس سے مخاطب ہو۔ اسی صورت کا نام آدم ہے جن کو اللہ نے اپنی صورت پر پیدا کیا تھا اور اس لحاظ سے آدم اور خدا کی ذات وصفات میں کوئی فرق نہیں دونوں ایک ہیں۔"

سبحان من اَظْہَرَ نَاسُوتَہٗ سِرَّ سَنَا لاہوتہ الثاقب
ثم بدا لخلقہ ظاہراً فی صورۃ الآکل والشارب

(پاک ہے اس کی ذات جس کے ناسوت نے اس کے روشن لاہوت کی چمک دمک کا راز ظاہر کیا پھر وہ کھانے والے اور پینے والے کی صورت میں اپنی مخلوق کے لیے ظاہر ہوا۔)

یہ نظریۂ وحدۃ الوجود کی وہ اساس ہے جس پر محی الدین بن عربی نے پوری عمارت کی تعمیر کی ہے۔ یہی وہ محور ہے جس پر فلسفیانہ و متکلمانہ تصوف چوتھی صدی ہجری سے لے کر آج تک گردش کر رہا ہے اور جس کی مخالفت کے لیے ہر دور میں اللہ کے کچھ بندے اٹھتے رہے ہیں۔ ورنہ احسان، تزکیۂ قلب اور تقویٰ سے کس مومن کو انکار ہو سکتا ہے۔ ـــــــــ (فروری ۱۹۵۶ء)

باب دوم

چند اکابر صوفیاء

امام ابوالقاسم قشیریؒ

نام ونسب الامام ابوالقاسم عبدالکریم بن ہوازن بن عبدالملک بن طلحہ بن محمد النیسابوری القشیری۔ ان کا خاندان عرب کے علاقہ "استوا" کا باشندہ تھا۔ ان کا نسبی تعلق بنو قشیر بن کعب سے ہے۔ یہ خاندان عرب سے منتقل ہو کر خراسان میں آباد ہو گیا تھا۔

ولادت امام قشیری ربیع الاول ۳۷۶ھ مطابق ۹۸۶ء میں پیدا ہوئے۔ بچپن ہی میں ان کے والد کا انتقال ہو گیا لیکن انھوں نے علوم شرعیہ اور ادب کی تعلیم جاری رکھی۔ "استوا" کے علاقے میں یہ ایک بستی کے مالک تھے جس پر خراج اور دوسرے مطالبات کا بہت بار پڑ گیا تھا۔ انھوں نے یہ رائے قائم کی کہ نیسابور جائیں تاکہ وہاں حساب اور معاملات سے متعلق دوسرے امور و علوم کی تعلیم حاصل کریں اور اس کے ذریعہ اپنی جائداد کے مالی بار سے عہدہ برآ ہونے کی کوشش کریں۔

نیسابور میں آمد اسی رائے کے ساتھ وہ نیسابور آئے جو اس وقت علماء اور مفکرین اسلام کا مرکز تھا۔ اتفاقاً وہ اُس مجلس میں شریک ہوئے جو اپنے وقت کے امام صوفیہ ابو علی الحسن بن علی الدقاق منعقد کیا کرتے تھے۔ جب انھوں نے ان کی گفتگو سنی تو بہت پسند آئی اور وہ ان کے دل میں اُتر گئی۔ ان کے ایمان کی کلی کھل گئی۔ اُسی دن انھوں نے اپنے اس سابق ارادے کو جو انھیں نیسابور لایا تھا، ترک کر دیا اور سلوک الی اللہ اور مجاہدے کی زندگی اختیار کر لی۔ ابو علی دقاق نے جب ان کے جذبے اور ان کی صلاحیت محسوس کر لی تو انھیں قبول کر لیا پھر اپنی بہترین نگرانی میں ان کی روحانی تربیت شروع کر دی۔ انھوں نے ان سے کہا کہ علوم شرعیہ کی تکمیل کریں۔ ان کی ہدایت کے پیشِ نظر انھوں نے اس

وقت کے ماہرین علوم شرعیہ سے علم دین کی تکمیل کی۔ پہلے وہ ابوبکر محمد بن ابوبکر طوسی کے درس میں شریک ہوئے اور "فقہ" میں مہارت حاصل کی۔ اس کے بعد وہ ابوبکر محمد بن الحسن بن فورک کے درس میں شریک ہوئے اور "علم الاصول" میں مہارت حاصل کی، پھر انھوں نے ابواسحاق اسفرائنی کے درس میں شرکت کی اور چند دن وہ ان کا درس سنتے رہے، ایک دن اُن کے استاذ نے کہا کہ یہ علم صرف سننے سے نہیں آتا بلکہ اس کو قلم بند کرنا بھی ضروری ہے۔ امام قشیری نے ان چند دنوں میں استاذ سے جو کچھ سنا تھا وہ اُن کے سامنے دُہرایا۔ استاد ان کی ذہانت اور حافظے کی قوت پر متعجب ہوئے اور سمجھ گئے کہ ان کا شاگرد کس درجے کا آدمی ہے۔ انھوں نے فرمایا کہ تمھیں میرے درس میں شریک ہونے کی ضرورت نہیں ہے بلکہ میری تصنیفات کا مطالعہ تمھارے لیے کافی ہے۔ اس کے بعد انھوں نے اسفرائنی اور ابن فورک کے طریقوں کو جمع کیا پھر انھوں نے قاضی ابوبکر بن الطیب الباقلانی کی کتاب کا مطالعہ کیا۔ تعلیم کی اس پوری مدت میں وہ برابر اپنے شیخ ابوعلی الدقاق کی مجلسوں میں بھی شریک ہوتے رہے۔ جب ان کے شیخ نے محسوس کرلیا کہ وہ مرتبۂ کمال پر پہنچ گئے ہیں تو اپنی صاجزادی سے ان کا نکاح کردیا اور اس طرح ان کو اپنے خاندان کا ایک فرد بنالیا۔

علماء و مورخین کے اعترافات

ابن خلکان نے اپنی کتاب "وفیات" میں اُن کے متعلق لکھا ہے:

کان علامة فی الفقه و التفسير والحديث والاصول و الادب والشعر والكتابة وعلم التصوف۔ جمع بين الشريعة والحقيقة۔	وہ فقہ، تفسیر، حدیث، اصول، ادب، شعر، کتابت اور علم تصوف میں علامہ تھے، انھوں نے شریعت و حقیقت کو یک جا کردیا تھا۔

ابوالحسن باخرزی نے مبالغے کے ساتھ ان کی تعریف لکھی ہے اور خطیب نے اپنی تاریخ میں لکھا ہے کہ امام قشیری ۴۴۸ھ میں بغداد آئے اور انھوں نے علمار کو حدیثیں سنائیں اور ہم لوگوں نے ان کی حدیثیں لکھیں:

وكان ثقة، احسن الوعظ،	وہ ثقہ تھے، ان کا وعظ بہترین اور

علیہا الاشارۃ وکان یعرف الاصول علی مذہب الاشعری والفروع علی مذہب الشافعی۔ ان کا اشارہ حسین تھا۔ وہ مذہب اشعری کے مطابق اصول اور مذہب شافعی کے مطابق فروع کے عالم تھے۔

مورخین نے ان کے اشعار بھی نقل کیے ہیں اور ان کی تعریف کی ہے۔

سفرِ حج

انھوں نے علماء و محدثین کے ایک قافلے کے ساتھ سفرِ حج کیا تھا اس قافلے میں امام الحرمین کے والد ابو محمد الجوینی اور احمد بن الحسین البیہقی بھی تھے۔ ان لوگوں سے بغداد اور حجاز میں بہت سے علماء نے حدیثیں سنیں۔ احادیث سننے والوں میں یہ علماء بھی تھے۔

احمد بن محمد بن عمر الخفاف ـــــ محمد بن احمد بن عبدوس المکی ـــــ ابو نعیم عبد الملک بن الحسن الاسفرائنی ـــــ الحاکم ابو عبد اللہ ـــــ اور صاحبِ "طبقات الصوفیہ" ابو عبد الرحمٰن السلمی۔

تصنیفات

امام قشیری نے بہت سی کتابیں تصنیف کیں۔ یہاں ایک فہرست پیش کی جا رہی ہے۔

۱۔ الرسالۃ القشیریہ۔ اس کی شرح شیخ الاسلام زکریا الانصاری نے لکھی ہے اور اس شرح پر نفیس حاشیہ شیخ الاسلام السید مصطفیٰ العروسی نے لکھا ہے۔ یہ کتاب متعدد دفعہ طبع ہو چکی ہے۔

۲۔ "لطائف الاشارات" فی تفسیر القرآن۔ غیر مطبوعہ۔ اس کتاب کے مخطوطات ہندوستان، استانبول، دمشق اور لیڈن میں موجود ہیں۔

۳۔ "کتاب الفتوی" اس کا ذکر سبکی نے طبقات میں کیا ہے۔

۴۔ "حیاۃ الارواح والدلیل علی طریق الصلاح والفلاح" غیر مطبوعہ۔ اس کا نسخہ اسکوریال میں ہے۔

۵۔ "کتاب المعراج" اس کا نسخہ بانکی پور میں ہے۔ ڈاکٹر حسن عبد القادر نے اس کو ایڈٹ کر کے قاہرہ سے شائع کر دیا ہے۔

۶۔ "شکایۃ اہل السنۃ" اس کا ذکر سبکی نے طبقات الشافعیہ میں کیا ہے۔

۷۔ "الفصول" "اللمع" یہ دونوں کتابیں غیر مطبوعہ ہیں اور قاہرہ میں ہیں۔

۸۔ "کتاب التوحید النبوی" غیر مطبوعہ۔ قاہرہ میں ہے۔

۹۔ "کتاب التفسیر فی علم التفسیر" اس کا مخطوطہ ہندوستان اور لیڈن میں ہے۔

۱۰۔ "کتاب التمیز فی علم التذکیر" غیر مطبوعہ۔ استانبول۔ طہران۔ قیروان اور قاہرہ میں ہے۔

۱۱۔ کتاب "الاربعین حدیثا" اس کا مخطوطہ لیڈن میں ہے۔

۱۲۔ کتاب "ترتیب السلوک" اس کا مخطوطہ وٹیکن میں ہے۔

۱۳۔ کتاب "شرح الاسماء الحسنیٰ" اس کا مخطوطہ، موصل، طہران، تونس اور دمشق میں ہے۔

ان کے علاوہ ان کی اور تصنیفات بھی ہیں۔

وفات

۱۶ ربیع الاول ۴۶۵ھ مطابق ۱۰۷۲ء سنیچر کی صبح کو نیسابور میں وفات پائی اور اپنے شیخ اور خسر ابوعلی دقاق کے جوار میں مدفون ہوئے رحمہ اللہ تعالیٰ۔

(مجلۃ التربیۃ الاسلامیۃ بغداد۔ رمضان المبارک ۱۳۹۱ھ)

شیخ عبدالقادر جیلانیؒ

ربیع الثانی کے مہینے میں سیدی الشیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کے نام پر معلوم نہیں کیا کچھ کیا جاتا ہے اور ان مراسم کو ادا کرتے وقت لوگوں کے ذہن میں یہ خیال بھی نہیں آتا کہ وہ زندگی بھر کیا کرتے رہے اور ہم ان کے نام پر کیا کر رہے ہیں۔

اگر یہ سوال کیا جائے کہ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کا اصل کارنامہ کیا ہے؟ تو ان کے سوانح حیات، ان کے مواعظ و خطبات و ملفوظات اور ان کی کتابیں اور اس دور کی تاریخ کا جواب ہوگا کہ ان کی زندگی کا اصل کارنامہ احیاء اسلام کی سعی اور انفرادی و اجتماعی اصلاح کی کوشش ہے جس میں خدا کے فضل سے انہیں بڑی کامیابی بھی حاصل ہوئی۔

ابتدائی حالاتِ زندگی

حضرت شیخ کی ولادت علاقۂ گیلان کے مقام نیف میں ۴۷۰ھ میں ہوئی۔ وہ خلیفۂ عباسی مقتدی بامر اللہ کا عہدِ حکومت تھا۔ ابتدا ہی سے آپ صلاح و تقویٰ کی گود میں پرورش پاتے رہے اور اپنی والدہ ماجدہ کی صالح تربیت کے سائے میں جوان ہوئے۔ گاؤں میں جتنی تعلیم ہو سکتی تھی حاصل کی لیکن اس پر قانع نہ ہوئے۔ تکمیلِ علم کا شوق پیدا ہوا اور آپ نے اپنی والدہ ماجدہ سے بغداد جانے کی اجازت مانگی۔ انھوں نے اجازت دی اور زادِ راہ کے طور پر چالیس دینار آپ کی عبا میں بغل کے نیچے استر میں سی دیے اور نصیحت کی کہ کسی حال میں جھوٹ نہ بولنا۔ درحقیقت یہ نصیحت ہی اصل زادِ راہ تھی جسے لے کر آپ روانہ ہوئے۔ راستے میں ڈاکوؤں کا مشہور واقعہ پیش آیا۔ وہ واقعہ ایک کھلا نشان تھا کہ آگے چل کر آپ کو کیا خدمت انجام دینی ہے اور اللہ تعالیٰ آپ سے کیا کام لینے والا ہے۔ ڈاکوؤں کی توبہ اور ان کا رجوع الی اللہ بتا رہا تھا کہ آئندہ اس ہاتھ پر بہت سے لوگوں کو توبہ کرنی ہے اور آپ کی پُر اثر تعلیم سے

بہت سارے خدا کے بھاگے ہوئے غلام اپنے آقا کی طرف پلٹنے والے ہیں۔

۴۸۸ھ میں آپ بغداد پہنچے۔ اس وقت آپ کی عمر ۱۸ سال تھی۔ بغداد فتنوں کی آماجگاہ تھا۔ ایک طرف شیعت، اعتزال، فتنۂ خلق قرآن اور باطنیت کی تحریکیں خطرۂ ایمان بنی ہوئی تھیں دوسری طرف علماء سوء اور مکار صوفی، لوگوں کی جان و مال اور ان کے دین و ایمان پر ڈاکے ڈال رہے تھے۔

حرام خوری و بدکاری اور منافقت کی گرم بازاری سے بغداد جل رہا تھا۔ مستظہر باللہ کو تختِ خلافت پر متمکن ہوئے ایک سال گزرا تھا۔ بنی بویہ کی حکومت کو ختم ہوئے زیادہ دن نہ گزرے تھے اور سلجوقی آپس میں دست و گریبان تھے۔ بغداد میں کبھی کسی سلجوقی بادشاہ کا خطبہ پڑھا جاتا اور کبھی کسی دوسرے سلطان کا۔ جس سلطان کی طاقت بڑھ جاتی تھی، مجبور و بے بس خلیفہ اسی کو خلعت سلطانی عطا کر دیتا تھا۔ سلجوقیوں کی خانہ جنگی کی وجہ سے باطنی تحریک پھر زور پکڑ گئی تھی۔ انھوں نے متعدد قلعوں پر قبضہ کر کے ملک میں اودھم مچادی تھی۔ کسی اہلِ حق کی نہ جان محفوظ تھی اور نہ مال۔ بڑے بڑے امراء اپنے کو محفوظ رکھنے کے لیے احتیاطی تدابیر اختیار کرنے پر مجبور تھے۔ ۴۹۸ھ میں ان کی دراز دستی اس قدر بڑھ گئی تھی کہ حجاج کے قافلوں کو لوٹ کر ان سب کو تہ تیغ کر دیتے تھے۔ مستظہر کے عہد خلافت کا ایک اہم واقعہ جنگِ صلیبی کا آغاز بھی ہے۔ اسی کے عہد حکومت میں یہ طویل جنگ شروع ہوئی تھی اور اس جنگ کے اثرات بھی بغداد میں محسوس کیے جا رہے تھے۔ خیریت یہ تھی کہ مستظہر کی بیدار مغزی کی وجہ سے بغداد سیاسی اعتبار سے پرسکون تھا۔ یعنی خود بغداد پر اس وقت کوئی طاقت حملہ آور نہ تھی ــــ حضرت شیخ نے اس سیاسی سکون سے پورا فائدہ اٹھایا اور اپنی تعلیم و تربیت میں ہمہ تن مشغول رہے۔ اس وقت کے مشہور علماء اور ائمہ سے آپ نے تعلیم حاصل کی اور انتہائی تنگ دستی کی حالت میں حاصل کی۔ اس راہ میں آپ نے بڑی مصیبتیں برداشت کیں لیکن ہمت نہ ہاری اور مسلسل اپنی تکمیل میں لگے رہے ــــ یہ مصائب و آلام وہ بھٹی ہیں جن میں تپے بغیر کوئی سونا کندن نہیں بنتا۔

۴۹۶ھ میں اپنے مدرسے سے تمام مروجہ علوم و فنون میں کامل ہو کر نکلے۔ شیخ ابوالخیر حماد بن مسلم الدباس کی صحبت میں احسان و سلوک کی تربیت حاصل کی اور پھر قاضی ابوسعید مخرمی

سے اس کی تکمیل کی۔

دعوتی واصلاحی سرگرمیاں

کتاب وسنت کے علوم وفنون سے مسلح مزاجِ شریعت سے آشنا اور صلاح وتقویٰ سے آراستہ ہوکر آپ میدانِ جہاد میں اترے۔ تین محاذوں سے باطل کے خلاف جنگ کا آغاز کیا۔ دعوتی اجتماعات۔ مدرسہ۔ مجالسِ ارشاد وتربیت۔

آپ کو الگ سے کوئی نیا مدرسہ قائم کرنے کی ضرورت نہ پڑی۔ اپنے استاد وشیخ ابوسعید مخرمی کے مدرسے میں آپ نے مسندِ صدارت کو زینت بخشی اور ابتداءً وہیں دعوت الی الحق کے اجتماعات بھی منعقد کیے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کے درس وتدریس اور آپ کی تقریروں میں وہ اثر بخشا کہ کچھ دنوں میں طلبہ وسامعین کی کثرت کے سبب سے مدرسے کی عمارت ناکافی ہوگئی اور اس کی توسیع عمل میں آئی لیکن بسا اوقات دعوتی اجتماعات کے لیے وہ بھی ناکافی تھی۔ چناں چہ تقریر کے لیے شہر سے باہر وسیع میدان میں منبر رکھا جاتا تھا۔ سامعین کی تعداد کبھی کبھی ستر ہزار تک پہنچ جاتی تھی۔ چار سو اشخاص آپ کے مواعظ وخطبات قلم بند کیا کرتے تھے اور یہ سلسلہ چالیس سال جاری رہا۔ دعوتی واصلاحی تقریریں ہفتے میں تین بار ہوا کرتی تھیں۔ ایک اہم اور معنی خیز بات یہ بھی کہ آپ اپنی تقریر کی تمہید میں هُوَ الَّذِیْ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ كُلِّهٖ کی آیت تلاوت فرماتے تھے اور امام وقت کی اصلاح کی دعا بھی کرتے تھے۔ یہ دونوں باتیں آپ کی جدوجہد کے مقصد کو واضح کرتی ہیں۔

کوئی دین اور کوئی نظام زندگی، سیاسی اقتدار کی اصلاح کے بغیر کما حقہٗ نافذ نہیں ہوسکتا۔ اس وقت خلافت عباسیہ کا سیاسی اقتدار کمزور بلکہ برائے نام تھا۔ اور عام طور سے خلفاء اپنے عیش وعشرت میں مگن تھے۔ ہمہ جہتی اصلاح کی کوئی جدوجہد کامیاب نہ ہوسکتی تھی جب تک سیاسی اقتدار مستحکم اور سلطان وقت خود صلاح وتقوے سے آراستہ نہ ہو۔ حضرت الشیخ کے علم وبصیرت سے یہ بات پوشیدہ نہیں رہ سکتی تھی۔

خلیفۂ وقت کی اصلاح

پھر یہ بھی نہیں ہے کہ خلیفۂ وقت کی اصلاح کے معاملے میں آپ نے کبھی بے جا لینت و نرمی، خوشامد اور چاپلوسی کی روش اختیار کی ہو بلکہ اس کے برعکس آپ سلطان وقت کی غلط حرکتوں پر سختی کے ساتھ علیٰ رؤس الاشہاد ٹوکتے تھے اور آپ کے پُراثر کلام، پُرتاثیر شخصیت، اخلاص، دردمندی، بے نفسی اور بے غرضی کا یہ اثر تھا کہ بے نظیر قبولیت عامہ کے باوجود کبھی کسی خلیفہ نے آپ پر ٹیڑھی نگاہ نہ ڈالی۔ تاریخ میں ہمیں یہ الفاظ ملتے ہیں۔

کان یامر بالمعروف	آپ معروف کا حکم دیتے اور منکر سے
وینھیٰ عن المنکر للخلفاء	روکتے تھے۔ خلفاء کو، وزیروں کو، قاضیوں
والوزراء والسلاطین والقضاۃ	کو، خواص کو، عوام کو، سب کو، اور یہ امر بالمعروف
والخاصۃ والعامۃ یصدعھم	اور نہی عن المنکر کا کام بڑی صفائی کے
بذلک علی رؤس الاشہاد	ساتھ بھرے مجمع میں اور بر سر منبر ہوتا تھا جو
ورؤس المنابر وفی المحافل	خلیفہ کسی ظالم کو حاکم بناتا آپ اس پر انکار
وینکر علی من یولیّ الظلمۃ	کرتے اور اللہ کے معاملے میں کسی ملامت کرنے
ولا تاخذہ فی اللہ	والے کی ملامت آپ کو حق کے اظہار سے
لومۃ لائم۔	نہ روکتی۔

اس عبارت میں "یصدعھم" کا ٹکڑا دراصل تلمیح ہے قرآن کی آیت فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ (اے نبی تمھیں جو حکم دیا جارہا ہے اسے کھول کر بیان کرو) کی طرف اس عبارت سے صراحۃً آپ کی ہمہ جہتی سعی اصلاح کا پتہ چلتا ہے۔ کوئی طبقہ ایسا نہ تھا جو آپ کے دائرۂ اصلاح سے باہر ہو۔

ایک بار خلیفہ مقتفی لامر اللہ نے قاضی ابوالوفا یحییٰ بن سعید کو جو ابن المرجم الظالم کے لقب سے مشہور تھا، بغداد کا قاضی مقرر کیا۔ جب حضرت شیخ کو اس کی خبر ملی تو برسرِ منبر خلیفہ کو مخاطب کرکے کہا۔

ولّیت علی المسلمین	تم نے مسلمانوں پر ایک ایسے شخص کو حاکم

اظلم الظلمین فما جوابک	بنایا ہے جو اظلم الظالمین یعنی بہت بڑا ظالم
غداً عند رب	ہے کل قیامت میں رب العالمین کو کیا جواب
العٰلمِینَ ارحم	دوگے جو ارحم الراحمین یعنی سب سے زیادہ
الراحمین۔	مہربان ہے۔

تاریخ کہتی ہے کہ یہ بلیغ جملے سن کر خلیفہ لرز اٹھا، رونے لگا اور اسی وقت اس قاضی کو اس کے عہدے سے معزول کر دیا۔ آپ کی مجالس وعظ میں وزرار، نقیب النقباء اور نائبین سلطنت بھی شریک ہوتے تھے اور یہ وہ لوگ ہوتے تھے کہ بعض اوقات ان کا اقتدار خلیفہ سے بھی بڑھ جاتا تھا لیکن ان کو نصیحت کرنے میں بھی آپ نرمی نہیں برتتے تھے، ان میں سے کتنے ہی آپ کے زجر و توبیخ کا شکار ہوئے۔ ایک بار خلیفہ کے قصور و محلات کا ناظم عزیز الدین آپ کی مجلس میں اپنے حشم و خدم کے ساتھ آیا۔ مجلس میں آنے کا پہلا اتفاق تھا، اس کے آتے ہی آپ نے اپنی تقریر کا رُخ اس کی طرف موڑ دیا۔

آپ نے فرمایا۔ تم سب کی حالت یہ ہے کہ ایک دوسرے کی خدمت کرتا ہے اللہ کی خدمت کون کرتا ہے؟" اس سوال کے بعد آپ نے طویل نصیحت کی اور آخر میں اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:

"کھڑا ہو، اپنا ہاتھ میرے ہاتھ پر رکھ دے تاکہ اس اجاڑ گھر یعنی دنیا سے بھاگ کر رب کی طرف لپکیں، اور اللہ کی طرف اور عمل کی طرف چلیں، عنقریب تجھ کو حق کی طرف لوٹنا ہوگا اور وہ تجھ سے تیرے اعمال کی باز پرس کرے گا۔"

(فیوض یزدانی ص۵۰۰)

ایک موقع پر آپ سے درخواست کی گئی کہ کلام میں اگر اتنی سختی نہ ہوتی تو اچھا تھا۔ آپ نے جواب میں فرمایا:

"میل جم گیا ہے اور جب تک اس کو زور سے نہ ملا جائے وہ دور نہ ہوگا۔"

یہ کتنا بلیغ، معنی خیز اور دور رس جواب ہے ؎

پھول کی پتی سے کٹ سکتا ہے ہیرے کا جگر مرد ناداں پر کلام نرم و نازک بے اثر

اس جواب کے ساتھ ہی ساتھ آپ نے یہ بھی فرمایا کہ ان شاء اللہ میرا کلام سخت ان کے لیے آب حیات کا کام کرے گا اور انھیں حیات تازہ عطا کرے گا اور واقعہ یہ ہے کہ آپ کی سخت تنقیدیں بہتوں کے لیے آب حیات ثابت ہوئیں۔ درباری علماء و مشائخ کے مقابلے میں بھی آپ کے تیز و تند کلام کی یہی مصلحت تھی۔ یہاں یہ غلط فہمی نہ ہو کہ ہر داعی یہ روش اختیار کر سکتا ہے، اس کے لیے موقع شناسی، شخصیت اور وہ صفات درکار ہیں جو حضرت شیخ میں تھیں۔ ایک بار مجموعی طور پر اپنی سخت کلامی کا سبب اپنی تقریر میں یوں بیان فرمایا:

"میرا وعظ کے لیے منبر پر بیٹھنا تمہارے قلوب کی مصلحتوں اور ان کو سنوارنے کے لیے ہے نہ کہ تقریر میں الٹ پھیر کرنے اور اس کو سنوارنے کے لیے۔ میری سخت کلامی سے بھاگو مت۔ کیوں کہ میری تربیت اس نے کی ہے جو دین خداوندی میں سخت تھا۔ میری تقریر بھی سخت ہے اور کھانا بھی سخت اور روکھا سوکھا ہے پس جو مجھ سے اور مجھ جیسے لوگوں سے بھاگا اس کو فلاح نصیب نہیں ہوئی جن باتوں کا تعلق دین کے ساتھ ہے ان کے متعلق جب تو بے ادب بنے گا تو میں تجھ کو چھوڑوں گا نہیں اور یہ نہ کہوں گا کہ اس کو کیے جا۔ تو میرے پاس آئے یا نہ آئے میں پروا نہ کروں گا۔ میں قوت کا خواہاں خدا سے ہوں نہ کہ تم سے۔ میں تمہاری گنتی اور شمار سے یک طرف ہوں۔" (ص ۲۷۳)

احیائے اسلام کی تڑپ

آپ کی زندگی کے اصل کارنامے کی ایک دلیل آپ کا لقب 'محی الدین' بھی ہے۔ اگر آپ کی احیاء دین کی جد و جہد نمایاں نہ ہوتی اور اگر آپ کا کوئی امتیازی وصف نہ ہوتا تو پھر یہ لقب بے معنی ہوتا۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلام کی مظلومیت نے آپ کو آتش زیر پا بنا دیا تھا اور آپ دین کو پھر سے غالب کرنے کے لیے ہمہ تن مصروف جہاد ہو گئے تھے۔ ایک ملفوظ میں فرماتے ہیں:

"جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دین کی دیواریں پے در پے گر رہی ہیں اور اس کی بنیاد بکھری جاتی ہے، اے باشندگانِ زمین آؤ اور جو گر گیا ہے اس کو مضبوط کر دیں اور جو ڈھے گیا ہے اس کو درست کر دیں۔ یہ چیز ایک سے پوری

نہیں ہوتی (سب ہی کو مل کر کام کرنا چاہیئے) اے سورج اور اے چاند اور اے دن تم سب آؤ۔ (ص ۴۹۸)

اس مختصر سے ملفوظ میں احیائے اسلام اور اقامتِ دین کے لیے کتنی تڑپ، کتنا سوز اور کتنا درد چھپا ہوا ہے؟ اس کو پڑھ کر قاری کا دل ہل جاتا ہے، پکارنے والا دین کی اقامت کے لیے ساری کائنات کو پکار رہا ہے، اس سے زیادہ پُر زور اور عام دعوتِ دین اور کیا ہو گی، اس پکار میں ایک تحریک اور ایک تنظیم کی دھمک محسوس ہوتی ہے۔ ایک دوسرے ملفوظ میں فرماتے ہیں:

" صاحبو! اسلام رو رہا ہے اور ان فاسقوں، ان بدعتیوں، گمراہوں، اور مکر کے کپڑے پہننے والوں اور ایسی باتوں کا دعویٰ کرنے والوں کے ظلم سے جو ان میں موجود نہیں ہیں اپنے سر کو تھامے ہوئے فریاد مچا رہا ہے۔" (ص ۵۰۰)

بہت سے لوگ تقدیر کو اپنی بے عملی اور احیائے اسلام کی جدوجہد سے علیحدگی کا بہانہ بناتے ہیں۔ ایک بار آپ نے اس مسئلے کو عجیب انداز میں سمجھایا۔

"ہاں بعض حالت وہ بھی ہے جو مخفی رکھی جاتی ہے۔ ہم کو چاہیئے کہ تقدیر کی آمد کے انتظار میں سو رہیں بسم اللہ (اس کے بعد آپ نے منبر پر تکیہ لگایا اور ہاتھ سر کے نیچے رکھ کر آنکھیں بند کر لیں اور کچھ دیر اسی حالت میں رہے اس کے بعد بیٹھ گئے، اور فرمایا) تم بے وقوف ہو اور دیوانے ہو، تمہارا مجھ سے الگ ہو کر بلا عذر بیٹھ رہنا اصل راس المال کا نقصان ہے۔" (ص ۴۹۸)

اس کا صاف مطلب یہی ہے کہ میں احیائے اسلام کی دعوت دے رہا ہوں اور اس کام میں معاونت کے لیے تمھیں پکار رہا ہوں اور تم تقدیر کا عذر پیش کر کے اس جدوجہد سے علیحدگی اختیار کر رہے ہو، یہ کھلی ہوئی حماقت ہے، اس سے تم راس المال یعنی اپنی عمر اور مہلت کار کو برباد کر رہے ہو۔ اس عذر کو چھوڑ دو اور میرے ساتھ آؤ۔ کیا اب بھی شبہ باقی رہتا ہے کہ حضرت شیخ کا اصل کارنامہ کیا ہے اور آپ کی جدوجہد کا نصب العین کیا تھا؟ اس وقت بغداد میں مسلمانوں کے جتنے طبقات موجود تھے ان میں سے ہر طبقے کو آپ نے نام لے لے کر پکارا ہے، ان پر تنقیدیں

کی ہیں اور ان تک حق کی دعوت پہنچانے کی سعی کی ہے۔ یہاں تمام تقریروں کے اقتباسات پیش کرنا طوالت کا سبب ہوگا یہاں اس طرح کا صرف ایک اقتباس دیا جاتا ہے جس میں آپ نے مجموعی طور پر تمام باشندگان بغداد کو مخاطب کیا ہے:

"اے باشندگانِ بغداد، تمھارے اندر نفاق بڑھ گیا اور اخلاص کم ہو گیا ہے۔ اقوال بڑھ گئے اور اعمال کم ہو گئے ہیں، تمھیں جاننا چاہیے کہ قول بلا عمل کسی کام کا نہیں بلکہ وہ تمھارے خلاف حجت ہے۔ قول بلا عمل ایسا خزانہ ہے جو خرچ نہیں کیا جاتا۔ وہ محض دعویٰ ہے دلیل اور گواہ کے بغیر۔ وہ ایک ڈھانچہ ہے جس میں روح نہیں۔ کیوں کہ روح تو اخلاص و توحید اور کتاب و سنت پر عمل کرنے سے آتی ہے اور وہ تمھارے اکثر اعمال سے نکل چکی ہے غفلت سے باز آؤ اور خدا کی طرف پلٹو، اس کے حکم کی تعمیل کرو اور اس کے ممنوعات سے بچو۔" (صفحہ ۱۳۰)

یہاں تک جو تفصیل پیش کی گئی اس سے بالکل واضح ہے کہ آپ کا اصل کارنامہ احیائے اسلام کی جدوجہد ہے اور اس طریقِ زندگی کی اقامت نصب العین ہے جس کی تعلیم رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ و تابعین دے گئے ہیں۔ آخر میں خود حضرت شیخ کی تصریح پیش کرتا ہوں جس سے زیادہ مستند ذریعہ دوسرا موجود نہیں ہے۔

"یہ آخری زمانہ ہے کہ نفاق کا بازار جما ہوا ہے اور میں اس طریقے کو قائم کرنے کی کوشش کر رہا ہوں جس پر جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ اور آپؐ کے تابعین رہے ہیں۔ یہ آخری زمانہ ہے کہ لوگوں کے معبود دراہم و دنانیر بن گئے ہیں۔ لوگ موسیٰ علیہ السلام کی قوم کی طرح بن گئے کہ ان کے دلوں میں گوسالے کی محبت رچ گئی تھی اور اس زمانے کا گوسالہ دینار و درہم بن گیا تجھ پر افسوس، تو اس دنیا کے بادشاہ سے جاہ و مال کا طالب کس طرح بنا ہوا ہے اور اپنی مہمات میں اس پر کیسے بھروسہ کرتا ہے۔ حالانکہ عنقریب وہ یا معزول ہونے والا ہے یا مر جانے والا۔ اس کا مال و ملک و

جاہ سب جاتا رہے گا اور ایک ایسی قبر میں جا بسے گا جو تاریکی و وحشت اور تنہائی و اندوہ و رنج و غم اور کیڑے مکوڑوں کا گھر ہے۔ وہ حکومت سے ہلاکت کی طرف منتقل ہو جائے گا، ہاں اگر اس کے پاس نیک عمل اور نیک نیتی ہوگی تو حق تعالیٰ اس کو اپنی نعمت سے ڈھانپ لے گا اور حساب کتاب میں تخفیف فرمائے گا جو معزول ہونے والا، مرجانے والا ہے اس پر بھروسہ مت کر ورنہ تیری توقع نامراد رہے گی اور مدد منقطع ہو جائے گی۔" (صہ ۲۰۶)

یہ تھے سیدی الشیخ عبدالقادر جیلانیؒ اور یہ ہے ان کا کارنامہ۔ آپ کی جدوجہد اور اس کے تمام ذرائع تجدید و احیائے اسلام کے محور و مرکز کے گرد گھومتے ہیں۔ دعوتی اجتماعات کا منبر وعظ ہو، مدرسے کی مسند درس ہو یا خانقاہ کی خلوت تربیت۔ ہر جگہ وہی ایک مقصد تھا جو ہمیشہ آپ کے پیش نظر رہا۔

آپ کی اس جدوجہد کے نتائج کیا رہے؟ اس سوال کا جواب بھی بڑا دل کش اور اطمینان بخش ہے۔ یہاں اس کی تفصیل طوالت کے خوف سے چھوڑ دی گئی، مختصراً اتنا لکھنا کافی ہے کہ حضرت الشیخ کی جدوجہد سے بغداد میں صلاح و تقویٰ کی ایک تازہ بہار آگئی تھی یہی نہیں کہ عوام و خواص کی زندگیوں میں تبدیلی پیدا ہو گئی تھی بلکہ قصرِ خلافت تک اس کے اثرات جا پہنچے تھے۔

اب ہر شخص خود فیصلہ کر سکتا ہے کہ حضرت الشیخ کے حقیقی عقیدت مند وہ لوگ ہیں جو اقامتِ دین کی جدوجہد میں مشغول ہیں یا وہ لوگ جنھیں اس جدوجہد کے نام ہی سے پسینہ آتا ہے اور وہ "یا غوث" کا نعرہ مار کر اور ان کی گیارہویں منا کر مطمئن ہو جاتے ہیں کہ انھوں نے اپنی عقیدت کا ثبوت پیش کر دیا۔

ہم مسلمانوں کو بالعموم اور قادریوں کو بالخصوص دعوت دیتے ہیں کہ وہ اقامتِ دین اور احیائے اسلام کی جدوجہد شروع کریں جس کے لیے حضرت شیخ زندگی بھر مصروف عمل رہے۔ رَحِمَهُ اللّٰهُ رَحْمَةً وَّاسِعَةً وَجَزَاهُ عَنِ الْإِسْلَامِ خَيْرَ الْجَزَاءِ۔

شیخ عبدالحق محدث دہلوی ؒ[۱]

چودھویں صدی ہجری ختم ہو رہی ہے اور ہم پندرہویں صدی ہجری کے استقبال کی تیاری کر رہے ہیں۔ بہ حیثیت مجموعی تمام عالم اسلام اور خصوصی طور پر ہر ملک کی تاریخ کا الگ الگ بھی جائزہ لیا جا رہا ہے اس موقع پر میرے عالم تصور میں شمالی ہند کی دسویں اور گیارہویں صدی کا ایک روشن چراغ اپنے تاریک ماحول میں روشنی پھیلاتا نظر آرہا ہے۔

شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے مال و زر، جاہ و منصب، شہرت اور نام و نمود کو پائے استحقار سے ٹھکرا دیا، ایک گوشے میں بیٹھ کر کتاب و سنت کی شمع جلائی اور ۵۲ سال تک مسلسل تاریک ماحول کو روشن کرنے، حکومتِ وقت کا رُخ بدلنے، شریعتِ اسلامی کو رواج دینے، نبوتِ محمدیؐ پر ایمان و یقین کی تجدید کرنے، اسلامی تہذیب و تمدن کو برقرار رکھنے اور باطل کے خلاف لڑنے والے انسان تیار کرنے کی انتھک جد و جہد کرتے رہے۔ ایک ایسی شخصیت کا یہ حق تھا کہ اس کے سوانح حیات اور کارناموں پر اس کے شایانِ شان کتابیں لکھی جاتیں لیکن حضرت شیخ کا یہ حق اب تک پوری طرح ادا نہیں کیا گیا ہے۔ اگرچہ ان کی حیات اور کارناموں پر چند کتابیں لکھی گئی ہیں لیکن ابھی ان

---

[۱] مصنفؒ نے مدرسہ شمس الہدیٰ پٹنہ میں تدریسی مصروفیات کے زمانے میں ایک کتاب "تذکرہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی" مرتب کی تھی جس کی اشاعت سنہ ۱۳۳۲ھ میں ہوئی۔ اس موضوع پر ایک دوسری کتاب، پروفیسر خلیق احمد نظامی سابق استاذ شعبہ تاریخ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے بھی مرتب کی جو "حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی" کے نام سے سنہ ۱۳۷۳ھ میں ندوۃ المصنفین دہلی سے شائع ہوئی۔ مصنفؒ نے یہ مقالہ انھیں دونوں کتابوں کو سامنے رکھ کر ترتیب دیا ہے۔ یہ پہلے حلقہ طلبۂ اسلامی بہار کے سالانہ مجلہ "میزان" ۱۹۸۰ء میں شائع ہوا۔ اس کے بعد کتابچہ کی شکل میں بھی شائع ہو رہا ہے۔ (مرتب)

کا حق ادا نہیں ہوا ہے۔ (۱) میں اس مقالے میں جو کچھ لکھنے والا ہوں اس کی حیثیت صاحبانِ علم و قلم کو اس کام کی طرف متوجہ کرنے کی ہے۔

شیخ عبدالحق نے ۹۴ سال کی عمر پائی اور ان کی زندگی مہد سے لحد تک مومنانہ و مسلمانہ رہی ان پر بلا مبالغہ "شابٌ نشأ فی عبادۃ اللہ" (وہ نوجوان جس کی نشو و نما اللہ کی عبادت میں ہوئی ہو) کا جملہ صادق آتا ہے۔ ان کی زندگی میں جوانوں اور بوڑھوں، طلباء اور علماء سب کے لیے سبق موجود ہے۔ میں یہاں اختصار کے ساتھ حضرت شیخ کی حیات اور کارنامے پیش کر رہا ہوں۔

شیخ عبدالحق کا عہد

محدث دہلوی کے عہد کی طرف مختصر اشارہ ضروری ہے تاکہ ان کے کارناموں کی قدر و قیمت اور ان کا صحیح دینی موقف معلوم ہو۔

شیخ عبدالحق نے مغلیہ دورِ حکومت کے تین عظیم الشان بادشاہوں کا زمانہ پایا ہے۔ اکبر کی تخت نشینی کے وقت ان کی عمر دو مہینے کم پانچ سال تھی اور جب ان کا انتقال ہوا تو شاہجہاں کی حکومت کا سولہواں سال تھا۔

اکبر کو تحصیل علم سے کوئی دلچسپی نہ تھی اس لیے وہ جاہل رہ گیا۔ مغلیہ دور کے دوسرے بادشاہوں کے برخلاف وہ علم سے بے بہرہ تھا۔ ابتداء میں اس نے ایک صوفی منش بادشاہ کی طرح زندگی بسر کی لیکن بعد کو علماء سوء، صوفیان بد عقیدہ اور چالاک دانش وروں نے اس کے ذہن کو اتنا بگاڑا کہ وہ اسلام سے بیزار ہو گیا۔ نام کی مسلمان بادشاہت کے باوجود اس کی وسیع حکومت کے دائرے میں ہر جگہ "اسلام محکوم اور مسلمان ذلیل و خوار بنا کر رکھ دیئے گئے"، اکبر کی حالت یہ ہو گئی تھی کہ وہ ہندو تھا، عیسائی تھا، پارسی تھا، وہ سب کچھ تھا لیکن مسلمان نہ تھا۔ سب سے زیادہ جس دین سے اس کو نفرت ہو

---

(۱) عرصہ گزرا ایک کتاب "مرآۃ الحقایق" کے نام سے حضرت شیخ کے خاندان کے ایک فرد نے لکھی تھی جو اب صرف بعض کتب خانوں میں پائی جاتی ہے۔ ادھر ماضی قریب میں دو کتابیں اور شائع ہوئی ہیں۔ ایک تذکرہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی ۱۳۰۰ ہجری میں شائع ہوئی تھی اور دوسری کتاب پروفیسر خلیق نظامی صاحب استاذ شعبہ تاریخ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے قلم سے "حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی" مطابق ۱۹۶۴ء ندوۃ المصنفین دہلی سے شائع ہوئی۔

گئی تھی وہ اسلام تھا چالاک لوگوں نے اس کو یہ پٹی پڑھائی کہ ہزار سال کے بعد دین اسلام کا زمانہ ختم ہوگیا اور ایک نئی نبوت کی ضرورت ہے۔ چنانچہ دینِ الٰہی اکبر شاہی ایجاد کیا گیا، علماء نے اسے مجتہد مطلق کا مقام عطا کیا اور اگرچہ اس نے زبان سے نبوت کا دعویٰ تو نہیں کیا لیکن لوگوں نے اسے باور کرایا تھا کہ وہ نبی سے کم نہیں ہے۔ جن مردانِ حق نے اکبر کی بے دینی کے خلاف لب کشائی کی وہ یا تو قتل کیے گئے یا انھیں ذلیل کیا گیا۔ ملا محمد یزدی نے جو ایک شیعی عالم اور جونپور کے قاضی القضاۃ (چیف جسٹس) تھے۔ بادشاہ کے خلاف جہاد کا فتویٰ دیا، بنگال کے چیف جسٹس نے بھی یہی صدا لگائی، اس کی جزا ان دونوں کو یہ ملی کہ ٹوٹی ہوئی کشتی میں بٹھا کر دریا میں ڈبو دیئے گئے۔ قاضی یعقوب کو بھی کسی طرح ختم کیا گیا۔ شیخ سلیم چشتی کے صاحبزادے مولانا بدرالدین کو بھی ستایا گیا یہاں تک کہ وہ مجبور ہو کر حجاز چلے گئے۔ قطب الدین خاں کوکہ اور شہباز خاں کمبوہ پر بھی جوتیاں پڑیں، خواجہ شاہ منصور کو مرزا حکیم، حاکم کابل سے خط و کتابت کے جرم میں پھانسی دی گئی، غرض جن لوگوں نے بادشاہ کے خلاف لب کشائی کی یا اس کو تخت سے اتار دینے کی تحریک کے موید پائے گئے ان کو چن چن کر ختم کر دیا گیا۔ ہم ان تمام مردانِ حق کے لیے دعائے مغفرت کرتے ہیں جنھوں نے اکبر کی بے دینی کے خلاف لب کشائی کی اور اسی راہ میں ستائے گئے یا شہید کیے گئے، ان کی حمیتِ دینی ہمارے لیے درسِ عبرت ہے۔ اللہ تعالیٰ انہیں جزائے خیر دے۔

علمی حیثیت سے اس وقت شمالی ہند میں منطق و فلسفہ کا پرچم لہرا رہا تھا۔ قرآن اور حدیث کی تعلیم ناقابلِ ذکر تھی۔ مذہبی حیثیت سے عقائد میں سخت انتشار تھا اور اخلاقی حیثیت سے مادیت اور دنیا پرستی چھائی ہوئی تھی۔ صحیح عقیدہ و عمل کے لوگ گوشوں میں بیٹھے اس صورت حال پر آنسو بہا رہے تھے۔ غلط قسم کے فلسفیانہ تصوف کی گرم بازاری تھی اور اسی کو لوگوں نے دنیا کمانے کا ایک آلہ بنا لیا تھا۔

شیخ عبدالحق کا خاندان

حضرت شیخ جس خاندان کے چشم و چراغ تھے وہ بخارا کا ایک ذی اثر اور ... کی خاندان تھا۔ آغا محمد ترک سب سے

پہلے شخص ہیں جو سلطان علاؤالدین خلجی کے عہد میں ہندوستان آئے۔ چونکہ وہ اپنے قبیلہ کے سردار اور تلوار کے دھنی تھے اس لیے بادشاہ نے ہاتھوں ہاتھ لیا اور بڑے بڑے مناصب عطا کیے۔ شیخ کے جد اعلیٰ نے "زور شمشیر" سے بادشاہ کے دل میں جگہ حاصل کی تھی اور دادا کے پوتے نے "زور قلم" سے عام وخاص کے دلوں کو جیتا، تلوار کے آثار معلوم نہیں کب کے مٹ چکے لیکن قلم کے آثار آج بھی ویسے ہی تازہ ہیں جیسے کل تھے۔ حضرت شیخ نے اپنے خاندانی حالات "اخبار الاخیار" کے آخر میں بطور تکملہ لکھے ہیں۔ خاندانی حالات کے متعلق اس سے بہتر اور مستند کوئی دوسری تحریر نہیں ہو سکتی۔ ہم طوالت کے خوف سے مکمل تحریر یہاں نہیں دے رہے ہیں، ضرورت کے مطابق چند اقتباسات پیش کیے جائیں گے۔

شیخ سیف الدین

محدث دہلوی کے والد ماجد شیخ سیف الدین اپنے وقت کے مشہور مشائخ میں تھے۔ مورخین نے شیخ سیف الدین کا ذکر خیر بھی کیا ہے اور خود شیخ عبدالحق نے اخبار الاخیار میں اپنے والد کے حالات وکوائف تفصیل سے لکھے ہیں۔ شیخ سیف الدین ۹۲۰ھ کو دہلی میں پیدا ہوئے اور ۲۷ شعبان ۹۹۰ھ کو دہلی ہی میں وفات پائی۔

شیخ سیف الدین کی روحانی تربیت شیخ امان اللہ پانی پتی نے کی۔ واقعہ یہ ہے کہ ہدایت وضلالت اللہ کے دست قدرت میں ہے۔ شیخ امان اللہ کے تربیت یافتہ لوگوں میں شیخ سیف الدین تو اللہ کی اطاعت وعبادت میں مشغول رہے۔ دنیاوی جاہ ومنصب کا خیال بھی ان کے ذہن پاک میں پیدا نہ ہوا اور دوسرا شخص نہ صرف یہ کہ خود گمراہ ہوا بلکہ اکبر بادشاہ کی گمراہی کا ایک ذریعہ بنا۔ یہ دوسرے شخص تاج الدین بن زکریا اجودھنی تھے، جو تاج العارفین کے لقب سے یاد کیے جاتے ہیں ان کی شرارت کا ذکر ملا بدایونی نے اپنی تاریخ میں کیا ہے۔ یہ شخص "دیوی برہمن" کی طرح چارپائی پر بٹھا کر اکبر کے بالاخانے پر لے جایا جاتا تھا اور وہاں بیٹھ کر طرح طرح کی کفریات بکتا تھا اور وحدۃ الوجود کو ملحدانہ رنگ میں سمجھاتا تھا۔ (بدایونی) شیخ عبدالحق نے اپنے والد کی حیات وموت کے جو حالات لکھے ہیں وہ پڑھنے کے لائق ہیں اور ان سے پتہ چلتا ہے کہ شیخ کو کیسی بابرکت آغوش

تربیت نصیب ہوئی تھی۔

شیخ عبدالحق کی ولادت

ابوالمجد شیخ عبدالحق کی ولادت باسعادت محرم ۹۵۸ھ مطابق ۱۵۵۱ء کو دہلی میں ہوئی۔

نشوونما اور ابتدائی تعلیم

انھوں نے ابتدائی تعلیم اور تربیت اپنے والد سے پائی انھوں نے خود لکھا ہے:

"آخر عمر میں جو ضعف و پیری کا زمانہ ہوتا ہے، میرے والد کی مشغولیٔ خاطر مجھ فقیر کے ساتھ وابستہ تھی، جوانی ختم ہو جانے اور غمگسار دوستوں کے گزر جانے کی وجہ سے ان کو ایک سخت مرض لاحق ہو گیا تھا، اس وقت میری عمر تین چار سال کی تھی۔ اس بیماری میں ان کے رنج و غم اور ضعف پیری کی کلفتوں کو دور کرنے کا سبب یہی فقیر تھا۔ رات دن انھیں کے آغوشِ رحمت و شفقت میں پرورش پا رہا تھا۔ بچپن کے انہیں دنوں میں مشائخ کی باتوں کو میرے دل و دماغ میں ڈال کر وہ تربیت ظاہری کے ساتھ میری باطنی تربیت بھی کرتے جاتے تھے۔

(اخبار الاخیار)

یہ نہال علم و معرفت اسی ترتیب سے فیض یاب ہو کر پروان چڑھا اور علم و فن کے وہ برگ و بار لایا کہ آج سینکڑوں برس گزر جانے کے بعد بھی ہر خاص و عام اس سے متمتع ہو رہا ہے خود شیخ اپنی تمام ترقیوں کو اپنے والد ہی کی تربیت کا ثمرہ قرار دیتے ہیں۔

نرالا طریقہ تعلیم اور نادر الوجود قوت حافظہ

شیخ سیف الدین نے اپنے صاحب زادے کو ابتدائی تعلیم جس ڈھنگ سے دی وہ عجیب و غریب ہے اور تمام قدیم و جدید طریقہ ہائے تعلیم سے الگ، اس سے شیخ عبدالحق کی جودت طبع اور انتہائی ذہانت و فطانت کا پتہ چلتا ہے اور یہ طریقہ ایک نئے تعلیمی تجربہ کی حیثیت رکھتا ہے، حضرت شیخ لکھتے ہیں:

"پہلے بغیر کسی سابق تعلیم اور حروف تہجی پڑھانے کے جیسا کہ بچے پڑھتے ہیں، قرآن مجید کا دو تین جز بلکہ اس سے کم مجھے پڑھایا۔ وہ سبق سبق لکھتے تھے اور میں پڑھتا۔ قرآن کی یہی مقدار میں نے سبقاً پڑھی ہے اس کے بعد ان کی تربیت اور توجہ کے اثر سے اتنی قوت

پیدا ہو گئی کہ روزانہ قرآن کا جتنا حصہ میں پڑھتا تھا ان کو سنا دیتا، دو مہینے میں قرآن میں نے ختم کر دیا، لکھنے کی مشق کا یہ حال ہوا کہ والد اس طریقہ کے پابند نہ ہوئے جو معلم بچوں کے ساتھ مکاتب میں اختیار کرتے ہیں، بس تا ف و قاف تک انھوں نے اسی طرح لکھوایا اس کے بعد تھوڑی مدت میں، اگر میں ایک ماہ کہوں تو جھوٹ نہ ہوگا کتابت اور انشار کا سلیقہ پیدا ہو گیا۔"

ان کے والد نے ان کو گلستاں، بوستاں اور دیوانِ حافظ کے چند جزو پڑھائے۔ اسی طرح میزان الصرف سے مصباح و کافیہ تک خود تعلیم دی۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت شیخ کو نادر الوجود قوت حافظہ دی تھی، انھوں نے لکھا ہے کہ ڈھائی سال کی عمر کی باتیں بھی انہیں یاد ہیں۔ بیس سال کی عمر سے کم میں وہ فارغ التحصیل ہو گئے۔

شوق اور محنت

جس شوق اور محنت سے انھوں نے علم حاصل کیا وہ طلبہ کے لیے سبق آموز ہے۔ حضرت شیخ کو تحصیل علم کا شوق ہی نہیں عشق تھا، ان کی تمام دل بستگی اور دل چسپی کا مرکز علم تھا۔ وہ لکھتے ہیں:

"بچپن کی ابتدا ہی سے میں نہیں جانتا کہ کھیل کیا چیز ہے، آرام کی نیند کیسی ہوتی ہے، یاروں اور دوستوں کے ساتھ خوش گپی کس طرح کی جاتی ہے، شوق کسب علم میں، میں نے نہ کبھی وقت پر کھانا کھایا اور نہ کبھی وقت پر سویا، جاڑے کی اکڑا دینے والی ہوائیں اور گرمی کے جھلسا دینے والے جھونکوں میں ہر روز دو بار دہلی کے مدرسہ میں حاضر ہوتا تھا جو میرے گھر سے دو میل دور ہوگا۔"

میرے ماں باپ ہمیشہ اس بات کے مشتاق رہے کہ میں کسی وقت محلے کے لڑکوں کے ساتھ کھیلتا یا رات کو سونے کے وقت آرام سے دراز ہوتا۔ میں کہتا کہ کھیل کود سے غرض تو دل کا خوش کرنا ہی ہے، میرا جی اسی میں خوش ہوتا ہے کہ کچھ پڑھوں یا مشق کروں۔ کبھی اثنار مطالعہ میں کہ آدھی رات کا وقت ہوتا میرے والد پکارتے "بابا کیا کرتا ہے؟" میں فوراً دراز ہو جاتا اور کہتا "سویا ہوا ہوں کیا فرماتے ہیں؟" جب سوال و جواب ختم ہو جاتا تو میں اٹھ بیٹھتا اور پھر مشغول ہو جاتا۔ چند بار ایسا ہوا کہ پگڑی اور سر کے بال میں

چراغ سے آگ لگ گئی اور جب تک اس کی گرمی سر تک نہ پہنچی، مجھے خبر نہ ہوئی۔"

حفظ قرآن تعلیم سے فراغت کے بعد حفظ قرآن کی توفیق بھی نصیب ہوئی اور یہ دولت گراں مایہ ایک سال سے کچھ زیادہ مدت میں حاصل ہو گئی اور میں کلام اللہ کی حفاظت میں آگیا۔

مزید تحقیق فراغت کے بعد مزید تحقیق اور بحث و مذاکرہ کے لیے سات آٹھ سال شیخ نے بعض علماء کے درس میں شرکت کی لیکن اس وقت خود شیخ کی علمی صلاحیت کا حال یہ تھا کہ استاد اپنے اس شاگرد سے استفادہ کرتے تھے۔

استاد شاگرد سے استفادہ کرتے حضرت شیخ لکھتے ہیں :— "مزید تکمیل و اہتمام کے لیے سات آٹھ سال میں نے ماوراء النہر کے بعض دانش مندوں کے درس میں شرکت کی، اس زمانے میں بھی رات دن میں شاید چند گھنٹے فرصت ملتی ہو، استادوں کی توجہ کی وجہ سے علمی بحث و مذاکرہ میں اس حقیر کی زبان سے جو باتیں نکلتیں اسے سن کر اکثر ہمارے اساتذہ یہ فرماتے کہ ہم لوگ تم سے استفادہ کرتے ہیں، ہمارا تم پر کوئی احسان نہیں ہے۔ خداوندا وہ کیا شوق تھا اور وہ کیا طلب تھی۔

اخبار الاخیار فارسی زبان میں ہے، اس کی عبارتوں کے صرف ترجمے اس مقالے میں دے رہا ہوں۔

عبادت و انابت تحصیل علم کے زمانے میں بھی حضرت شیخ عبادت اور انابت الی اللہ سے کبھی غافل نہیں رہے۔ وہ خود لکھتے ہیں :

"تحصیل علم میں شوق اور شغف اور بحث و مباحثہ کے باوجود، بچپن سے نماز کی کثرت، اوراد کی پابندی، شب خیزی اور مناجات اس طرح ظہور میں آتی کہ لوگ حیران ہوتے۔ اب بھی اس زمانے کی سحر خیزی کا لطف اور اسی کا ذوق اپنی طبیعت میں محسوس کرتا ہوں۔"

فتح پور سیکری میں قیام تکمیل کے بعد سفر حج (۹۹۶ھ) تک حضرت شیخ کی مشغولیتوں کی تفصیل نہیں معلوم، پروفیسر خلیق نظامی نے

بادشاہ نامے کے حوالے سے لکھا ہے :

"جب ان کی عمر بیس سال کی ہوئی تو تکمیل علم کے بعد درس و تدریس کا شغل اختیار کیا اور کچھ دنوں یہ مشغلہ جاری رکھنے کے بعد عازم حجاز ہوئے۔

پھر ان کو کچھ لوگوں نے اکسایا کہ وہ شاہی دربار سے تعلق پیدا کریں۔ چنانچہ وہ فتح پور سیکری گئے، ان کے فتح پور جانے سے پہلے اکبر ملحد ہو چکا تھا۔ فتح پور پہنچتے ہی انھیں معلوم ہو گیا کہ جس جگہ وہ آئے ہیں وہ دین و تقویٰ کا مقتل ہے، انھوں نے اچھی طرح محسوس کر لیا کہ الحاد اور بے دینی کا یہ سیلاب کن چشموں سے اُبل رہا ہے، جب تک ان سرچشموں کو بند نہ کیا جائے اور لوگوں کے خیالات و عقاید میں تبدیلی پیدا نہ کی جائے اس کے خلاف علی الاعلان لب کشائی کر کے جان تو دی جا سکتی ہے لیکن اس سیلاب کو روکا نہیں جا سکتا اللہ تعالیٰ نے ان کی دستگیری کی اور فتح پور سے نکل آئے۔ وہ فتح پور سیکری کب پہنچے۔ اور کتنے دن قیام رہا اس کے بارے میں کچھ نہیں معلوم۔ ان کے والد کا انتقال ۹۹۰ھ میں ہوا اور وہ ۹۹۶ھ میں حجاز چلے گئے اس لیے اسی درمیان میں وہ فتح پور سیکری پہنچے ہوں گے۔ ان کی رسائی فیضی کے دربار میں ہوئی تھی۔ چند ہی دنوں میں صحبت کے بعد انہیں معلوم ہو گیا کہ اکبر کی موجودہ حکومت میں دین و مذہب کو قربان کیے بغیر منصب اور عزت نہیں مل سکتی۔ سینکڑوں علمار صوفیار اور مشائخ دنیائے دوں کے لیے دین کو دھڑا دھڑ فروخت کر رہے تھے۔ یہ محض اللہ کا فضل تھا کہ شیخ اپنا دین بچا لے گئے۔ وہ وہاں سے بھاگ کر پھر دہلی کے گوشۂ تنہائی میں واپس آئے اور پھر یہاں سے حجاز کے لیے روانہ ہوئے شیخ عبدالحق ۹۹۵ھ کے شروع میں گجرات پہنچے، وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ حجاز جانے کا موسم گزر چکا اس لیے ایک سال وہ گجرات میں رہے اور ۹۹۶ھ میں رمضان المبارک سے بہت پہلے مکہ معظمہ پہنچ گئے تھے۔ وہ چار سال حرمین شریفین میں مقیم رہے، میں اس قیام کی تفصیلات اس مقالے میں نظر انداز کرتا ہوں۔ ان کا صرف ایک بیان جو انھوں نے اپنے استاذ شیخ عبدالوہاب متقی کی خدمت میں دیا تھا یہاں نقل کرتا ہوں۔

"یا سیدی! میں ایک ایسا شخص ہوں کہ بچپن ہی سے حصول علم اور عبادت کی محنت

وریاضت میں پلا ہوں۔ میں کبھی عوام الناس کی صحبت، ان سے اختلاط اور ان کے گروہ میں شرکت کو خاطر میں نہ لایا۔ جب مجھے اللہ کے فضل سے علم کا اچھا خاصا حصہ مل گیا تو بعض اہلِ حقوق نے مجھے اہل دنیا کی طرف بلایا، پس میں وقت کے بادشاہ اور امراء کے پاس گیا، انھوں نے میرے ساتھ بہت اعتنا کیا، میرا رتبہ بلند کیا اور چاہا کہ میرے ذریعہ اپنی جماعت بڑھائیں اور مجھ کمزور سے اپنی طاقت مضبوط کریں لیکن اللہ نے مجھے محفوظ رکھا اور نہ چاہا کہ میں ان کے ساتھ رہوں، اپنے بندے کے قلب میں ایک جذبہ پیدا کیا جس نے اس مقام شریف تک پہنچایا۔[۱]

اس مختصر بیان نے دلی سے فتح پور کے سفر، وہاں کے قیام اور والپسی کا پورا نقشہ کھینچ دیا ہے۔ اس میں اس کا سبب بھی موجود ہے کہ شیخ دلی سے نکل کر فتح پور کیوں پہنچے تھے۔ وہاں پہنچ کر وہ جس ماحول میں گھِر گئے، اور جس سبب سے ان کی خاطر تواضع اور عزت و منزلت ہوئی اسے بھی انھوں نے کھول کر بیان کر دیا ہے پھر وہاں سے کیوں دلی آئے اور کیوں مکہ پہنچے اسے بھی ایک جملے سے ظاہر کر دیا ہے، رفعت، منزلت، عزت اور شاہی پارٹی میں شرکت، اس سے بڑھ کر دنیا دی کامرانی اور کیا ہو گی لیکن اس مردِ حق نے ان سب کو ٹھکرا دیا۔

حجاز سے واپسی اور درس و تدریس کا آغاز

حجاز سے واپس آتے ہی دہلی کے ایک گوشے میں حضرت شیخ نے سند درس و تدریس اور بساط دعوت وارشاد بچھا دی اور آخر دم تک ایک نہ تھکنے والی مشین کی طرح کام کرتے رہے جس وقت انھوں نے درس و تدریس کا کام شروع کیا اس وقت شمالی ہند کے مدرسوں کا نصاب تعلیم یہ تھا۔

لودھیوں کے زمانے تک ہندوستان میں اہل ترکستان کے اثر سے صرف فقہ، اصولِ فقہ، اور علم کلام کا رواج تھا اور اسی کا نام علم و دانائی تھا، جدال و مناظرہ، انہی فنون میں ہوتا تھا، انہی کو پڑھ کر علماء، قاضی اور مفتی اور محتسب کے شاہی عہدے پاتے تھے۔ دینیات میں تفسیر بیضاوی اور مدارک کے کچھ اجزاء اور حدیث میں مشکوٰۃ المصابیح یا مشارق الانوار کا درس ہوتا تھا۔ سب سے پہلے شیخ عبدالحق محدث دہلوی حرمین محترمین سے کتب احادیث

[۱] المکاتیب والرسائل مکتوب ۵۷

کا تحفہ ہندوستان لائے۔[1]

پہلے اس کی طرف اشارہ گزر چکا ہے کہ فتح پور سیکری کے قیام میں شیخ عبدالحق نے یہ محسوس فرما لیا تھا کہ الحاد و بے دینی کا یہ سیلاب کن سرچشموں سے ابل رہا ہے اور ان کو کس چیز سے بند کیا جا سکتا ہے۔ کتاب و سنت ہی وہ چیز ہے جو ان سرچشموں کا منہ بند کر سکتی ہے چنانچہ وہ حجاز سے اپنے ساتھ احادیث رسول لائے اور بے دینی کے سرچشموں کو بند کرنے کی سعی شروع کر دی۔ مولانا مسعود عالم ندوی نے لکھا ہے:

"ان کی ذات سے شمالی ہند میں علم حدیث کو زندگی ملی اور سنت نبوی کا خزانہ ہر خاص و عام کے لیے عام ہو گیا، ہمارے نزدیک حدیث کی خدمت اور کتب حدیث کی مزاولت خود بخود دین کی سچی روح سے قریب کرتی ہے۔ اگلے علماء سوء اور صوفی نما متاخرین کی فقہ اور معقولیت میں الجھ کر رہ گئے اور کم از کم شمالی ہند میں حدیث کا عام چرچا نہ ہو سکا، بد دینی اور بد عقیدگی کا بڑا سبب یہی ہے۔ شیخ عبدالحق نے اس جہل کے دور کرنے کی کوشش کی اور اسی لیے ہم آج ان کے شکر گزار ہیں اور ان کی علمی خدمات کا دل سے اعتراف کرتے ہیں۔"[2]

نصاب تعلیم کا محور و مرکز کتاب و سنّت

شیخ عبدالحق کے مکتوبات "المکاتیب والرسائل" کے حوالہ سے پروفیسر خلیق نظامی نے لکھا ہے:

"حجاز سے واپسی پر شیخ عبدالحق نے دہلی میں مسند درس و ارشاد بچھا دی، شمالی ہندوستان میں اس زمانے میں یہ پہلا مدرسہ تھا جہاں سے شریعت و سنّت کی آواز بلند ہوئی اس مدرسہ کا نصاب تعلیم دوسری درس گاہوں سے بالکل مختلف تھا

---

[1] خطبہ صدارت مولانا سید سلیمان ندوی۔ معارف جون ۱۹۳۶ء

[2] الفرقان بریلی شاہ ولی اللہ نمبر

یہاں قرآن وحدیث کو تمام علوم دینی کا مرکزی نقطہ قرار دے کر تعلیم دی جاتی تھی۔ فرماتے تھے:

چو غلام آفتابم ہمہ ز آفتاب گویم — نہ شبم نہ شب پرستم کہ حدیث خواب گویم[1]

پروفیسر صاحب نے آگے لکھا ہے:

"درس وتدریس کا یہ ہنگامہ شیخ محدث نے اپنی زندگی کے آخری لمحات تک برپا کیا ان کا مدرسہ دہلی ہی میں نہیں سارے شمالی ہندوستان میں ایک امتیازی شان رکھتا تھا۔ سیکڑوں کی تعداد میں طلبہ استفادہ کے لیے جمع ہوتے تھے اور متعدد اساتذہ درس و تدریس کا کام انجام دیتے تھے۔" پروفیسر صاحب کا درج ذیل اعتراف ایک منصفانہ اعتراف ہے:

"شیخ محدث کا یہ دارالعلوم اس طوفانی دور میں شریعت اسلام اور سنت نبوی کا سب سے بڑا پشت پناہ تھا، مذہبی گمراہیوں کے بادل چاروں طرف منڈلائے، مخالف طاقتیں بار بار اس دارالعلوم کے بام و در سے آکر ٹکرائیں لیکن شیخ محدث کے پائے ثبات میں ذرا بھی جنبش پیدا نہ ہوئی، ان کے عزم واستقلال نے وہ کام انجام دیا جو ان حالات میں ناممکن نظر آتا تھا ؎

ہوا ہے گو تند و تیز لیکن چراغ اپنا جلا رہا ہے — وہ مرد درویش جس کو حق نے دیئے ہیں انداز خسروانہ[2]

پروفیسر صاحب نے ہندوستان میں علم حدیث پر بحث کرتے ہوئے آخر میں لکھا ہے:

"بہر حال حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے جس وقت مسند درس بچھائی تھی اس وقت شمالی ہندوستان میں حدیث کا علم تقریباً ختم ہو چکا تھا۔ انھوں نے اس تنگ وتاریک ماحول میں علوم دینی کی ایسی شمع روشن کی کہ دور دور سے لوگ پروانوں کی طرح کھینچ کر ان کے گرد جمع ہونے لگے، درس حدیث کا یہ نیا سلسلہ شمالی ہندوستان

---

[1] حیات شیخ عبدالحق ص ۱۲۵

[2] ایضاً ص ۱۲۶

میں جاری ہوگیا، علوم دینی خصوصاً حدیث کا مرکز ثقل گجرات سے منتقل ہوکر دہلی آگیا۔ گیارہویں صدی ہجری کے شروع سے تیرہویں صدی کے آخر تک علم حدیث پر جتنی کتابیں ہندوستان میں لکھی گئی ہیں ان کا بیشتر حصہ دہلی یا شمالی ہندوستان میں لکھا گیا ہے، یہ سب شیخ عبدالحق محدث دہلوی کا اثر تھا۔[۱]

داراشکوہ نے بجا طور پر حضرت شیخ کو "امام محدثان وقت" کہا ہے۔

حکومت کا رُخ بدلنے کی کوشش

ایک طرف کتاب وسنت کی تدریس، دوسری طرف تزکیہ واحسان کی تعلیم اور تیسری طرف وقت کی تمام گمراہیوں کی تردید میں تصنیفات، ان سب ذرائع سے وہ لوگوں کے ذہن اور ان کے عقاید وخیالات کی اصلاح کر رہے تھے۔ چوتھی طرف انھوں نے دین دار اور باثر امرائے دربار کو خطوط لکھ کر ان کو حکومت کی اصلاح اور اس کا رُخ بدلنے کی سعی پر ابھارنا شروع کیا اور خدا کے فضل سے وہ اپنی اس کوشش میں کامیاب ہوئے، ابوالفضل اور فیضی کے انتقال کے بعد دین دار اور باثر امرائے سلطنت، اکبر سے زیادہ قریب ہوگئے تھے اور ان کی کوشش سے زندگی کے آخری لمحات میں اکبر از سرِ نو مسلمان ہوگیا تھا، اس طرح اس نے خود ہی دین الٰہی اکبر شاہی کو ختم کر دیا تھا، دوسرا بہت بڑا کام یہ ہوا کہ شیخ فرید کی کوششوں سے اکبر کے بعد جہانگیر تخت حکومت پر بیٹھا، وہ عقیدۃً مسلمان تھا اس نے تخت پر بیٹھتے ہی ایک ایسا فرمان جاری کیا جو دینِ الٰہی اکبر شاہی کے تابوت میں آخری کیل کی حیثیت رکھتا تھا۔ حضرت شیخ کے مکاتیب میں صرف دو باثر امراد کے نام خطوط یا مختصر رسائل پائے جاتے ہیں شیخ فرید کے نام خطوط کا تذکرہ کرتے ہوئے خلیق نظامی نے لکھا ہے:

"ان مکتوبات کا ایک ایک لفظ پُر معنی ہے، شیخ محدث اور شیخ فرید کے باہمی تعلقات کی نوعیت اور اس زمانے کے مذہبی اور سماجی حالات پر بڑی مفید اور

---

[۱] حیات شیخ عبدالحق ص ۴۳

دل چسپ روشنی پڑتی ہے۔ اگر ان خطوط کے مطالعہ کے وقت یہ بات بھی ذہن میں رکھی جائے کہ یہ زیادہ تر عہد اکبری میں لکھے گئے ہیں تو ان کا صحیح مفہوم سامنے آجاتا ہے۔" لہ

مقالہ طویل ہوتا جارہا ہے اس لیے مکاتیب کے اقتباسات ہم نہیں دے رہے ہیں۔ جب حکومت کا رُخ بدل گیا تو اکبر کی وفات کے بعد ایک طویل نام لکھا اور ان کو ہدایت کی کہ یہ خط جہانگیر کے سامنے پیش کر دیا جائے۔ اس خط میں انھوں نے ان تمام گمراہیوں کی نشان دہی کی ہے جو اکبر کے وقت میں رائج ہوگئی تھیں اور مقصد یہ تھا کہ جہانگیر ان گمراہیوں سے محفوظ رہے اور ان کا اعادہ نہ کرے، انھوں نے اسی پر بس نہیں کیا بلکہ جہانگیر کے لیے ایک مستقل رسالہ "نوریہ سلطانیہ" لکھا جس میں ایک مسلمان سلطنت کے قواعد احکام و ارکان وغیرہ کی تفصیل تھی۔ حضرت شیخ نے شاہ جہاں کے لیے بھی چالیس ایسی حدیثوں کا ترجمہ کیا تھا جن کا تعلق سلطنت و حکومت سے ہے اس کا نام "ترجمۃ الاحادیث الاربعین فی نصیحۃ الملوک والسلاطین" تھا۔

نبوّتِ محمدیؐ پر تجدیدِ ایمان و یقین کی سعیٔ بلیغ

حضرت شیخ کے "کارِ تجدید" کا یہ مرکزی نقطہ تھا۔ ان کی کوئی تصنیف اس کوشش سے خالی نہیں لیکن انھوں نے صرف اس پر اکتفا نہیں کیا بلکہ سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت اور ان کے مقام بلند کو واضح کرنے کے لیے ایک ضخیم کتاب "مدارج النبوۃ" مرتب کی، سیرت نبوی پر فارسی زبان میں وہ اس زمانے میں بہترین تصنیف تھی اور آج بھی اس کی وقعت کم نہیں ہوئی ہے۔ راقم الحروف نے تیس سال پہلے اس کتاب کے بارے میں لکھا تھا۔

"ہندوستان میں سب سے پہلے حضرت شیخ ہی نے اس زمانے کی عام زبان فارسی میں سیرت نبویؐ پر ایک جامع کتاب "مدارج النبوۃ" پیش کی، اس سے پہلے سیرت نبوی میں کسی مکمل اور جامع کتاب کا راقم الحروف کو علم نہیں کہ ہندوستان میں مرتب کی گئی ہو۔

لہ ایضاً ص۱۱

"لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ" کا خزانہ عربی میں تھا اور عام طور پر ہندوستانی مسلمانوں کی دسترس سے باہر تھا وہ جس رسولؐ کی امت میں تھے اس کی عظمت وجلالت اخلاق وعادات، صورت وسیرت، نبوت کی حقیقت اور فرائض منصبِ رسالت سے عام طور پر ناواقف تھے اور یہی وجہ ہے کہ بعض حلقوں سے رسالت اور خود ذاتِ رسالت پناہ کے متعلق نادانیوں کا ظہور ہو رہا تھا وہی شخص جس نے احادیث رسول کا خزانہ وقف عام کیا تھا آگے بڑھا اور سیرتِ نبویہ کے جواہرات لوگوں کے سامنے بکھیر دیئے کہ اس کے بغیر نہ تو حدیث کی تکمیل ممکن ہے اور نہ اتباع سنت آسان "[1]

حضرت شیخ نے خود مدارج النبوۃ میں لکھا ہے کہ انھوں نے یہ کتاب، نبوت محمدی کے بارے میں پھیلے ہوئے غلط خیالات ونظریات کی تردید اور اصلاح کے لیے لکھی ہے خلیق نظامی صاحب نے اس کتاب کے بارے میں لکھا ہے:

"رسول پاکؐ کی زندگی کا شاید ہی کوئی گوشہ ہو جس پر اس کتاب میں روشنی نہ ڈالی گئی ہو، یہ کتاب شیخ محدث کا نہایت، علمی اور ادبی شاہکار ہے۔ ہندوستان میں مسلمانوں نے جو مذہبی لٹریچر پیدا کیا ہے اس میں مدارج النبوۃ، کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے اس سے پہلے کسی ہندی مسلمان نے رسول پاک کی اتنی جامع، مفصل اور مکمل سوانح حیات مرتب نہیں کی تھی۔ مدارج النبوۃ بارہ سو سے زیادہ صفحات پر مشتمل ہے۔"[2]

نظامی صاحب نے یہ بھی لکھا ہے:

"مدارج النبوۃ کی تصنیف کا محرک اس زمانے کے حالات تھے، اکبری عہد میں شریعت وسنت سے بے اعتنائی انتہا درجہ کو پہنچ گئی تھی، حضور سرورِ کائناتؐ سے تعلق ٹوٹ رہا تھا ان حالات میں ضروری تھا کہ رسول مقبولؐ کی حیاتِ طیبہ کو مکمل طور پر پیش کر دیا جائے۔"[3]

---

[1] تذکرہ شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ

[2] حیات شیخ عبدالحق ص ۱۹۸

[3] ایضاً ص ۱۹۹

حضرت شیخ کے دل ودماغ پر نبوت محمدی پر ایمان ویقین کی تجدید کا جذبہ اتنا چھایا ہوا تھا کہ وہ اپنے ہر مکتوب کی ابتدا کلمہ طیبہ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہُ مُحَمَّدٌ رَّسُولُ اللہِ سے کرتے ہیں۔ حضرت شیخ نے حق کی تائید اور ہر قسم کے باطل کی تردید میں کتابوں کا ڈھیر لگا دیا ہے۔ جزاہ اللہ عنا الخیر۔

صوفیانہ دعاوی اور اظہار مقامات سے کلّی اجتناب

حضرت شیخ کے اخلاق حسنہ میں نمایاں ترین وصف ان کا تواضع ہے۔ انھیں اپنے سے کم عمر اور کم علم لوگوں سے استفادہ میں بھی ذرہ برابر تامل نہیں ہوتا تھا۔ انھوں نے اپنے اس مزاج کی وجہ سے بھی، حضرت شیخ عبدالوہاب متقی کی ہدایت کی وجہ سے بھی اس وجہ سے بھی کہ اکبر کے عہد میں صوفیانہ دعاوی اور اظہار مقامات نے گمراہیاں پھیلائی تھیں، طرح طرح کے دعوؤں سے کلّی اجتناب کیا ہے وہ صوفیانہ دعاوی اور اظہار مقامات کو سخت ناپسند کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ جب ان کے ایک معاصر شیخ نے لوگوں کو اشتباہ میں ڈالنے والے دعوے کیے تو ان سے محبت کا تعلق ہونے کے باوجود انھوں نے ان کے دعوؤں کی تردید میں ان کو ایک طویل خط لکھا تھا" جو حیات عبدالحق" کے آخر میں ضمیمہ کے طور پر شائع ہوگیا ہے اس کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت شیخ، سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں کوئی ایسی بات برداشت نہیں کرسکتے تھے جس سے یہ شبہ بھی پیدا ہوتا کہ کوئی شخص اس ذات سے ہمسری کا دعویٰ کر رہا ہے جس کے بارے میں بجا طور پر کہا گیا ہے ـــــ بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر

وفات

ابوالمجد شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ ۱۰۰۰ھ میں حجاز سے واپس آئے، اور اس وقت سے آخر دم تک سرگرم عمل رہے، باون سال تک مسلسل سرگرم عمل رہ کر دلّی کے اس فقیر گوشہ نشین نے ۲۳ ربیع الاول ۱۰۵۲ھ کو چورانوے ۹۴ سال دو مہینے کی عمر

میں وفات پائی۔ برّد اللہ مضجعہ واسکنہ فی جوار رحمتہ ان کا مقبرہ آج بھی حوض شمسی کے کنارے موجود ہے۔

جامعیت

اللہ تعالیٰ نے جامعیت کے جس وصف سے ان کو نوازا تھا وہ ان کے معاصرین میں سے کسی کو نصیب نہ تھا وہ مفسر قرآن تھے "امام محدثان وقت" تھے، تمام علوم دینیہ کے ماہر تھے، مورخ تھے، ادیب وشاعر تھے، داعی الی اللہ اور مصلح، صوفی صافی اور علم تصوف کے امام تھے۔ اس زمانے میں جو علوم وفنون رائج تھے ان میں سے شاید ہی کوئی علم وفن ہو جس میں ان کی کوئی تصنیف نہ ہو۔

شیخ محدث پر اللہ کا ایک خاص انعام

دنیا میں اللہ تعالیٰ نے اپنے اس خاص بندے کو جو ایک خاص انعام دیا وہ یہ تھا کہ ان کی ساتؔ پشت تک مسلسل علمار محدثین، مفسرین اور مصنفین پیدا ہوتے رہے۔ میں ذیل میں صرف ان کے نام لکھ رہا ہوں۔

عبد الحق

نور الحق

نور اللہ

محب اللہ

فخر الدین

شیخ الاسلام محمد

سلام اللہ

نور الاسلام

یہ ایک ایسا شرف وامتیاز ہے جو بہت کم علمار کو نصیب ہوا ہے۔

معاصر مورخین کا اعتراف

شیخ عبدالحق محدث دہلوی اس معنی میں بھی ایک تاریخی شخصیت ہیں کہ عہد مغلیہ کے نامور ہم عصر مورخین نے ان کے فضل و کمال کا اعتراف کیا ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ محض ان کے سلسلہ کے عقیدت مند تذکرہ نگاروں نے ان کے فضل و کمال کی قصیدہ خوانی کی ہو۔ میں اختصار کی بنا پر یہاں صرف ان کے نام لکھ رہا ہوں۔

۱۔ مرزا نظام الدین احمد صاحب طبقات اکبری۔ ۲۔ ملا عبدالقادر بدایونی صاحب منتخب التواریخ۔ ۳۔ صاحب طبقات شاہجہانی۔ ۴۔ عبدالحمید لاہوری صاحب بادشاہ نامہ۔ ۵۔ محمد صالح کنبوہ صاحب "عمل صالح"۔ ۶۔ بادشاہ جہانگیر صاحب "جہانگیر نامہ"۔

قریب العہد مورخین

۱۔ بختاور خاں صاحب مراۃ العالم

۲۔ شاہ نواز خاں صاحب مراۃ آفتاب نما

۳۔ خوافی خاں

باب سوم

مکاتیبِ صوفیاء

شیخ عبدالحق محدّث دہلویؒ کا ایک مکتوب

اکبر کی موت پر شیخ فرید کے نام

دنیا دار اور چالاک لوگوں نے اکبر کو بہکا کر الوہیت اور نبوت کے سلسلے میں اس کے عقائد کو جس طرح بگاڑا تھا وہ تاریخ ہند کا عبرت ناک سانحہ ہے اس کی موت اور جہانگیر کی تخت نشینی کے بعد شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے نواب فرید مرتضیٰ کو جو مکتوب لکھا ہے، اسے اس تاریخی پس منظر میں پڑھنا اس کی اہمیت کو دو چند کر دیتا ہے۔ اس مکتوب میں ادعائے الوہیت، ادعائے نبوت رسالت کی تحریف، انبیاء کے فرائض وخصائص اور دنیا کی بے ثباتی پر بصیرت افروز اشارات موجود ہیں۔

لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ

پاک ہے وہ زندۂ جاوید بادشاہ جس کی ذات موت اور فوت سے منزہ ہے۔

اس عظیم واقعہ وحادثہ (اکبر کی موت) کے اس طرح یکایک واقع ہونے سے جو حیرت ووحشت طاری ہوئی وہ حد بیان سے باہر ہے۔ کیا کیا جائے۔ سنتِ الٰہی اسی طرح جاری ہے۔ شاہ ہو یا گدا سب کو یہی پیش آنا ہے اور سبھی کو اس وادیٔ موت سے گزرنا ہے۔

ہر کہ آمد بجہاں اہل فنا خواہد شد — وانکہ پائندہ وباقیست خدا خواہد بود

جو بھی دنیا میں آیا ہے اسے فنا ہونا ہے — زندہ وپایندہ تو صرف خدا کی ذات ہے

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس بادشاہ گردوں شکوہ، قوی دولت، جواں بخت (جہانگیر) کے

سایۂ عدل واحسان میں سب خاص وعام اور بالخصوص اہل اسلام کو امن وامان نصیب کرے اور انھیں تمام آفات ومکروہات سے محفوظ رکھے۔ اللہ اس بادشاہ کی عزت میں اضافہ کرے اور اس کی حکومت کو ہمیشہ اپنی مرضیات پر چلنے کی توفیق دے۔

اَللّٰهُمَّ اَصْلِحِ الامام وَالْاُمَّةَ وَالرَّاعِیَ وَالرَّعِیَّةَ وَاَلِّفْ قُلُوْبَهُمْ فِی الْخَیْرَاتِ اَللّٰهُمَّ اَصْلِحْ اُمَّةَ مُحَمَّدٍ اَللّٰهُمَّ ارْحَمْ اُمَّةَ مُحَمَّدٍ اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِاُمَّةِ مُحَمَّدٍ۔	اے اللہ امام وامت اور راعی ورعیت کی اصلاح حال فرما اور نیکیوں کے حصول میں ان کے دلوں کو جوڑ دے۔ اے اللہ امت محمدی کی اصلاح فرما، اے اللہ امت محمدی پر رحم فرما۔ اے اللہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی امت کو بخش دے۔

دنیا کی تشبیہ

دنیا کی فنا پذیری وبے ثباتی کے بارے میں کیا لکھا جائے، بعض حکمار نے تشبیہی انداز میں بیان کیا ہے کہ: "دنیا سایۂ ابر ہے" یا "خواب شہوت انگیز" پہلی تشبیہ سے اس کی بے ثباتی دکھانی مقصود ہے اور دوسری سے اس کی حقارت اسی مضمون کو ایک شاعر نے ایک مصرع میں یوں کہا ہے۔

ع گفت یا خوابیست یا بادیست یا افسانہ

موت ایک ایسا حادثہ ہے جس سے ہر شخص کو یقیناً دوچار ہونا ہے لیکن افسوس کہ انسان دیدۂ عبرت وحیرت بند کیے بستر غفلت پر پڑا ہے اور اسے کوئی فکر نہیں کہ اس کے سامنے کیسا مشکل کام ہے اور کتنی سخت مہم درپیش ہے۔

یقین مشکوک

کسی نے یہ عجیب سوال کیا۔ کون سا یقین، "یقین مشکوک" ہے یعنی وہ کون سی شئے ہے جسے انسان یقین کے ساتھ جانتا ہے اور اس کے باوجود اس میں

اس طرح شک کرتا ہے جیسے اسے نہیں جانتا۔ کچھ لوگوں نے جواب دیا۔ یقین مشکوک موت ہے۔ لوگ یقین کے ساتھ جانتے ہیں کہ موت آ کر رہے گی لیکن اس طرح زندگی بسر کرتے ہیں جیسے انھیں موت کا علم ہی نہ ہو۔ سبحان اللہ، یہ کیسا پردہ ہے جو انسان کی آنکھوں پر ڈال دیا گیا ہے اور یہ کیسا فریب ہے جس میں وہ مبتلا ہے۔ درج ذیل حکایت میں اس فریب و غفلت کی کتنی بلیغ تمثیل پیش کی گئی ہے۔

ایک بلیغ تمثیل

حکایت ہے کہ جنگل میں ایک شخص کے پیچھے شیر لگا ہوا تھا اور وہ شخص بھاگ رہا تھا جب شیر بہت قریب آگیا تو گھبرا کر اس نے اپنے آپ کو ایک ویران کنویں میں ڈال دیا لیکن اس کی تہ تک پہنچنے سے پہلے اس میں اُگی ہوئی گھاس کی جڑیں تھام کر معلق ہو گیا۔ اس نے نیچے نگاہ ڈالی تو دیکھا کہ ایک اژدہا منہ کھولے بیٹھا ہے اگر وہ شاخوں سے چھوٹے تو ٹھیک اس کے منہ میں جا گرے۔ شیر جو تعاقب کر رہا تھا کنویں کے قریب آبیٹھا کہ وہ جیسے ہی باہر نکلے اس کا کام تمام کر دے۔ ابھی وہ غریب دم بھی نہ لینے پایا تھا کہ دو چوہے کہیں سے برآمد ہوئے اور جڑوں کو کاٹنے لگے جن کے سہارے وہ لٹکا ہوا تھا۔ اب وہ حیران کہ کیا کرے؟ نیچے گرے تو اژدہا موجود، باہر نکلے تو شیر تیار۔ اس نے اپنے آپ کو تقدیر پر چھوڑ دیا اور موت کا انتظار کرنے لگا۔ ناگاہ اس کی نگاہ شہد کے ایک چھتے پر پڑی جو کنوئیں کی دیوار سے لگا ہوا تھا اسے دیکھتے ہی وہ سب کچھ بھول گیا، اسے نہ شیر یاد رہا نہ اژدہا اور نہ چوہے۔ اس نے انگلی شہد کے چھتے میں ڈال دی اور شہد کی مکھیوں کی مزاحمت کے باوجود شہد چاٹنے لگا۔ ابھی دو تین انگلی ہی اس نے شہد چاٹا ہوگا کہ جڑیں کٹ گئیں اور وہ اژدہے کے منہ میں جا گرا۔

(اس تمثیل میں شیر قضائے الٰہی ہے، کنواں دُنیا ہے، چوہے رات اور دن ہیں اژدہا موت ہے اور شہد دنیا کی لذتیں ہیں) قضائے الٰہی کا شیر ہمارے پیچھے لگا ہوتا

ہے، رات اور دن ہمارے رشتۂ حیات کو کاٹتے رہتے ہیں، موت کا اژدہا ہمارا منتظر ہوتا ہے اور ہم ان سب سے آنکھیں بند کیے دنیا کی لذتوں میں منہمک رہتے ہیں۔ یہاں تک کہ اژدہائے مرگ ہمیں نگل لیتا ہے۔

مدّتِ عمر کا علم

خیال آتا ہے، اے کاش انسان کو اس کی مدت حیات معلوم ہوتی اور اسے علم ہوتا کہ اس راہ کی مسافت کتنی ہے تو وہ اسی کے مطابق اپنے سفر کا پروگرام ٹھیک کرتا، اطمینان و سکون سے سفر کرتا، ایک قسم کی فراغت نصیب ہوتی، اور چند لمحے فرصت و آرام کے بھی مل جاتے لیکن افسوس کہ نہ تو مدت عمر معلوم، نہ یہ پتہ کہ مسافت کتنی ہے ہر قدم پر اور ہر سانس میں یہ احتمال موجود کہ زندگی کا یہی آخری قدم اور آخری سانس ہو لیکن پھر خیال آتا ہے، فرض کرو کہ مدت عمر بھی معلوم ہوتی اور مسافت بھی دراز ہوتی تو کیا ہوتا؟ جب اس دنیا سے جانا ٹھہرا تو مدت عمر معلوم ہو یا نہ ہو۔ مسافت دراز ہو یا کوتاہ، سب برابر ہے۔

چوں قامت ما برائے غرق ست　　　کوتاہ و دراز را چہ فرق ست

جب ہمیں ڈوبنا ہی ہے تو لمبے قد اور ناٹے قد میں کیا فرق ہے

محبتِ الٰہی کا تقاضا

اگر دنیا باقی اور اسباب دنیا دائمی ہوتے، اطمینان خاطر اور ہمیشہ کا عیش و آرام بھی نصیب ہوتا اور اس کے باوجود کوئی شخص اللہ کی محبت اور عالم آخرت کے شوق میں اس دنیا سے صبر کر لیتا اور عیش و آرام کو ٹھکرا دیتا تو بے شک یہ بڑا کام ہوتا لیکن جبکہ دنیا فانی ہے، وحشت، کدورت، محنت و مشقت اور سیکڑوں بلاؤں کا گھر ہے محبت الٰہی اور شوق آخرت میں اسے ترک کرنا کون سا بڑا کام ہے جس پر انسان ناز کرے اور اس کے فوت پر حسرت و افسوس کے غم کھائے۔ محبت الٰہی کا تقاضا تو یہ ہے کہ دنیا سے اپنے قلبی تعلق کا رشتہ بالکل کاٹ دیا جائے۔ کلی انقطاع کے بغیر دنیا کی محبت

ختم نہیں ہوسکتی کیوں کہ دنیا کی طرف تھوڑا میلان بھی شراب کی سی خاصیت رکھتا ہے۔

خاصیت شراب

شراب کی خاصیت یہ ہے کہ ہر جرعہ اور ہر قطرہ پینے والے کے اندر مزید جرعات و قطرات کی حرص پیدا کرتا اور اسے تشنہ سے تشنہ تر بناتا ہے یہاں تک کہ وہ ہوش و خرد کھو کر بدمست ہو جائے۔ پھر نوبت یہاں تک پہنچتی ہے کہ اس کے کان نصیحت سننے سے انکار کر دیتے ہیں اور اس کا دماغ اندیشۂ عاقبت سے آزاد ہو جاتا ہے۔ غرورِ دنیا اور نشۂ حکومت و حکمرانی کی خاصیت بھی یہی ہے۔ یہ نشہ بڑھتے بڑھتے اس حد تک پہنچتا ہے کہ انسان خدائی اور پیغمبری کے دعوے کرنے لگتا ہے۔

فرعون، مصر کی چھوٹی سی حکومت پر اتنا بدمست ہوا کہ خدائی کا دعویٰ کرنے لگا۔ کیا وہ دیوانہ تھا؟ نہیں، اگر پاگل ہوتا تو موسیٰ علیہ السلام کو اس کی طرف مبعوث نہ کیا جاتا۔ خدا کے رسول عقلاء کے پاس بھیجے جاتے ہیں نہ کہ مجنونوں اور پاگلوں کے پاس۔ حقیقت یہ ہے کہ فرعون کے تمام ہذیانات، ملک و سلطنت کی بدمستی اور اسباب دنیا کے غرور کا نتیجہ تھے۔

بعض انسانوں کی سرشت، غرور اور حماقت کے خمیر سے تیار ہوتی ہے، ان سے فہم و تمیز کی صلاحیت چھن جاتی ہے اور وہ عقل طبعی کے باوجود مجنونوں جیسے کام کرنے اور پاگلوں جیسی باتیں کہنے لگتے ہیں۔ وہ دیوانے نہیں ہوتے، دیوانہ صفت ہوتے ہیں۔ یہی حال بعض ان احمقوں کا ہے کہ جب ان پر سنک سوار ہوتی ہے تو پیغمبری کا دعوےٰ کرنے لگتے ہیں انھیں کچھ خبر نہیں ہوتی کہ پیغمبری کے معنی کیا ہیں؟

انبیاء کرامؑ کی چند خصوصیتیں

رسالت، خدا اور خلق خدا کے درمیان واسطہ بننے کا نام ہے۔ رسول، خدا سے فیض حاصل کرتا ہے اور پھر اسے خدا کی مخلوق تک پہنچاتا ہے۔ رسول اول عمر سے آخر عمر تک گناہوں سے معصوم ہوتا ہے۔ اس کی روح عالم قدس و عالم ملکوت سے متصل ہوتی ہے۔ فرشتہ، خدا کا پیغام لے کر

اس کے پاس آتا ہے اور خدا اس کے ہاتھ سے معجزات دکھا کر لوگوں کو اس کی نبوت و رسالت کی طرف متوجہ کرتا ہے۔ اللہ اپنے رسول پر ایک ایسی کتاب نازل کرتا ہے کہ اگر جن و انس جمع ہوں تو سب مل کر بھی اس کتاب جیسی ایک سورہ نہ لاسکیں۔ اس کتاب کے معانی کی وسعت و ہمہ گیری کا یہ عالم ہے کہ تمام عالم کے عقلاء و علماء اگر اس کی تفسیر و تشریح کریں جب بھی اس کے معانی ختم نہیں ہو سکتے۔ رسول کے ساتھ بہترین شریعت ہوتی ہے۔ وہ دنیا کو علم و ایمان کے نور سے منور کرتا ہے۔ کافروں کو کفر سے اور جاہلوں کو جہل سے باہر لاتا ہے۔ خدا سے جو بندے دور ہیں انھیں نزدیک کرتا اور گمراہوں کو راہ راست دکھاتا ہے۔ وہ صورت، سیرت اور ظاہری و باطنی خوبیوں میں دوسرے انسانوں سے بالاتر ہوتا ہے۔ کسی خوبی میں کوئی بھی اس کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔ رسول پر ایمان لانے والی ایک امت ہوتی ہے۔ صلاح و فلاح سے آراستہ اور محبت و اعتقاد سے مزین۔ جو لوگ اس سے قریب ہوتے ہیں وہ علم و عمل، زہد و تقویٰ اور نورانیت میں سب سے افضل ہوتے ہیں اور پیغمبر کی کامل پیروی انھیں جامع کمالات بنا دیتی ہے۔۔۔ پیغمبری مجرد دعویٰ غلبہ حکومت و سلطنت اور شان و شوکت کا نام نہیں ہے۔ یہ تمام باتیں روشن ہیں لیکن بھٹکے ہوئے لوگوں سے کس طرح کہی جائیں۔

نفس، قلب، روح

انسان کے اندر تین چیزیں پائی جاتی ہیں۔ نفس، قلب، روح۔۔۔ نفس کی تخلیق اسی عالم کون و فساد سے ہوئی ہے۔ جسمانی اور حسی لذتیں اس کا کمال ہیں۔ ارضیت (عالم آب و گل سے تعلق) اور ظلمت اس کی اصل ہے لیکن دوسرے لطیف اور نورانی اجزاء سے تعلق کی بنا پر اس میں اتنی لطافت اور نورانیت پیدا ہو گئی ہے کہ وہ محسوسات کا ادراک کر لیتا ہے اور اسی وجہ سے وہ حواس خمسہ یعنی دیکھنے، سننے، سونگھنے، چکھنے اور چھونے کی قوتوں کا مرکز بن گیا ہے۔ نفس کو عقلی اور روحانی لذتوں کی کوئی خبر نہیں ہے۔ یہ نفس ہی ہے جو انسان میں ارضیت پیدا کرتا اور اسے عالم آب و گل کا گرفتار بناتا ہے۔

روح انسان کا سب سے لطیف اور نورانی جزو ہے اس کی تخلیق عالم بالا سے ہوئی ہے اور اصلاً اس کی توجہ کا مرکز عالم قدس ہے۔ علم و معرفت اس کی لذت اور خدائے برتر کی محبت، اس کی ذات وصفات کی شناخت اس جزو لطیف کا حصہ ہے لیکن بدن سے تعلق اور نفس کے ساتھ ربط و اختلاط کی وجہ سے یہ نفس کی محبت میں گرفتار اور سرگشتہ و گمراہ ہوجاتی ہے۔ لوگوں نے تمثیلاً بیان کیا ہے کہ نفس و روح میں وہی تعلق ہے جو مرد اور عورت میں ہوتا ہے۔ نفس و روح کے تعلق سے لطیفہ قلبیہ پیدا ہوتا ہے اور قلب ان دونوں کے درمیان الٹتا پلٹتا رہتا ہے۔ اگر کسی پر روح غالب آجائے اور نفس و قلب احکام روحانی کے تابع ہوجائیں اور یہ بہت کم ہوتا ہے تو ایسا شخص سراپا خیر و صلاح بن جاتا ہے اور اگر نفس غالب آجائے اور روح و قلب اس کے محکوم بن جائیں تو ایسا شخص یکسر شر و فساد ہوجاتا ہے۔ یہ بحث اپنی جگہ زیادہ تفصیل و تشریح سے لکھی گئی ہے۔ یہاں تو صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ آدمی تذبذب اور کشاکش میں مبتلا ہے۔ ایک طرف عقل اسے کسی جانب بلاتی ہے اور دوسری طرف خواہش نفس اسے کہیں اور لے جانا چاہتی ہے، وہ اس کشاکش کی وجہ سے محنت و شدت میں گرفتار ہے اور یہ اس دنیا کے مصائب و شدائد ہیں اگر انسان اس عالم آخرت کے احوال اور وہاں کے شدائد پر تفصیل کے ساتھ غور کرے اور انھیں اپنے تصور و خیال میں لائے تو ہوش میں نہ رہے۔ حدیث میں ہے کہ حضورؐ نے فرمایا:

لَوْ تَعْلَمُوْنَ مَا اَعْلَمُ لَضَحِکْتُمْ قَلِیْلًا وَّلَبَکَیْتُمْ کَثِیْرًا — میں جو کچھ جانتا ہوں اگر تم جان لو تو ہنسو کم اور روؤ زیادہ۔

یعنی مبدء و معاد کا جو علم مجھے ہے اور آخرت کے جو حالات مجھے معلوم ہیں وہ تمھیں معلوم ہوجائیں تو تمھاری ہنسی غائب ہوجائے اور آنکھوں سے آنسو اُبلتے رہیں لیکن آزمائش کے لیے اللہ کی حکمت کا اقتضا یہ ہے کہ اس نے آنے والی دنیا کو نگاہوں سے پوشیدہ کر دیا اور اُسے پردۂ غیب میں چھپا دیا ہے اور انسان کی نگاہوں کے سامنے جو کچھ ہے وہ یہی دنیائے فانی ہے اسی وجہ سے وہ سخت فریب میں مبتلا ہے اور سر رشتۂ ہدایت اس کے

ہاتھوں سے چھوٹ گیا ہے۔ قرآن کہتا ہے:

یَعْلَمُوْنَ ظَاهِرًا مِّنَ الْحَیٰوةِ	دنیوی زندگی کے ظاہر کو جانتے ہیں اور
الدُّنْیَا وَهُمْ عَنِ الْاٰخِرَةِ هُمْ غَافِلُوْنَ ۝	وہ آخرت سے بالکل غافل ہیں۔

انبیاء، آخرت کی خبر سناتے ہیں

دنیا کے سب سے زیادہ سچے مُخبِرین۔ انبیاء کرام صلوات اللہ وسلام علیہم اجمعین اس عالم کی خبر انسانوں تک پہنچاتے ہیں اور علم و ہدایت کی روشنی دکھاتے ہیں لیکن افسوس کہ لوگ اس طرح نفس و طبیعت کے تاریک گڑھوں میں پڑے ہوئے ہیں کہ قطعاً ادھر کان نہیں دھرتے اور نہ راہِ ہدایت پر گام زن ہوتے ہیں۔ مرنے کے بعد حقیقت حال کھل جائے گی کہ کیا ہے

باش تا پردہ بر اندازد جہاں از روئے کار　　　آں چہ امشب کردہ فردا ت گردد آشکار

اس دن سے ہوشیار کہ دنیا اپنے چہرے سے پردہ اٹھا دے گی۔ آج رات کے پردے میں تم نے جو کچھ کیا ہے وہ کل آشکار ہو جائے گا۔

اَلنَّاسُ نِیَامٌ فَاِذَا	لوگ خواب غفلت میں پڑے ہیں جب
مَاتُوْا انْتَبَهُوْا	مر جائیں گے تو بیدار و آگاہ ہو جائیں گے۔

ترکِ دنیا کا مطلب

یہاں ایک شبہے کا ازالہ ضروری ہے۔ اگر کچھ لوگ کہیں کہ تمھاری تحریر کا خلاصہ یہ ہے کہ انسان دنیا کو ترک کر دے، مخلوق سے کنارہ کشی اختیار کرے اور تمام کام اپنے نفس و طبیعت کے خلاف انجام دے حالانکہ یہ بات انسانی فطرت کے خلاف ہے۔ انسان جب تک اس دنیا میں بقید حیات ہے وہ نہ اسباب کو چھوڑ سکتا اور نہ بنی نوع انسان سے کنارہ کش ہو سکتا ہے۔ آسائش طبع اور قید نفس سے بھی چارہ نہیں ہے کیوں کہ اسی پر حیاتِ دنیا اور کاروبارِ عالم کا دارومدار ہے۔ اس شبہے کا جواب یہ ہے کہ وہ لوگ بات کی تہہ تک نہ پہنچے،

جب تک کسی بات کی حقیقت معلوم نہ ہو جائے وہ دل نشین نہیں ہوتی اور سراسیمگی و حیرت کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ ترکِ دنیا، عزلت و گوشہ نشینی اور مخالفت نفس و طبع کا جو درس دیا جاتا ہے اس کا اصل مقصد یہ ہے کہ وہ مخالفتِ حق سے باز آئیں، قدم صراط مستقیم سے باہر نہ نکالیں اور دین و شریعت نے جو روش مقرر کر دی ہے اسے ترک نہ کریں۔ محققین دین نے فرمایا ہے کہ مقصود اصلی موافقت حق ہے نہ کہ مخالفت نفس، راہِ حق کے رہرو مطالبہ نفس کے برعکس کام اس لیے کرتے ہیں کہ نفس موافق حق ہو جائے اور راست رو بن جائے۔ اگر نفس خود راست رو ہو اور حق کے خلاف مطالبات نہ کرے تو پھر اس کی مخالفت کے کوئی معنی نہیں ہیں۔ جن لوگوں کا نفس موافق حق ہو جاتا ہے وہ "خلوت در انجمن" ہوتے ہیں۔ ان کا ظاہر لوگوں کے درمیان مجمع میں ہوتا ہے لیکن ان کا باطن خدا کی یاد میں محو ہوتا ہے وہ دنیا کے کام انجام دیتے ہیں لیکن فی الحقیقت تارک الدنیا ہوتے ہیں۔ دنیا تو آخرت کی کھیتی ہے اس سے کنارہ کشی کے کیا معنی؟

سلوک طریقت

انسان فقیر ہوگا یا غنی، حاکم ہوگا یا رعیت، مالک ہوگا یا مملوک، خادم ہوگا یا مخدوم اسی طرح اور تقسیم بھی کی جا سکتی ہے۔ فقیر کے لیے صبر، غنی کے لیے شکر، حاکم کے لیے عدل، رعیت کے لیے اطاعت، مالک کے لیے شفقت، مملوک کے لیے خدمت، خادم کے لیے ادب، مخدوم کے لیے عنایت۔ غرض جو شخص جس طبقے سے ہے اگر اس نے طریقۂ بندگی اور انصاف کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا ہے تو وہ بارگاہِ الٰہی کے مقرب و مقبول لوگوں میں ہے۔ یہی بات ہے جسے صوفیہ نے یوں کہا ہے: "سلوک ہر طائفہ حرفت اوست" یعنی جو شخص جس پیشے اور جس کام میں لگا ہوا ہے اگر اسے قاعدۂ شریعت کے مطابق انجام دے رہا ہے تو وہ سالک ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی لائی ہوئی روشن شریعت کی دعوت۔ اسی نہج پر ہے سرورِ کائنات نے کسی کو بھی اس کے جائز پیشے سے نہیں ہٹایا لیکن ہر طائفے کے لیے دستور العمل اور قواعد بنا دیے کہ وہ اس پر عمل کریں اور راہ سے بے راہ نہ ہوں۔ آپ نے جس کو باہر نکالا

کفر و معصیت سے باہر نکالا اور اس کے بعد ہر ایک کو دائرۂ دین کے اندر جگہ دی۔

سب سے بڑی سعادت

تمام سعادتوں میں سب سے بڑی سعادت، شریعت کا انعقاد اور مسلمانی کا اعتقاد ہے اور اس بات پر یقین رکھنا کہ ہر عمل کا ایک اجر ہے اور ہر فعل کی ایک جزا۔ عملِ نیک کا انجام نیک اور فعلِ بد کا انجام بُرا ہے۔

فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ۔

جو ایک ذرہ کے برابر نیکی کرے گا وہ اسے دیکھ لے گا اور جو ایک ذرہ کے برابر بدی کرے گا وہ اسے دیکھ لے گا۔

دو گروہ

خلاصہ یہ ہے کہ دنیا میں دو گروہ پائے جاتے ہیں ایک وہ جس کا مطمحِ نظر دنیا ہے اور وہ یہیں سب کچھ پالینا چاہتا ہے اور دوسرا وہ جس کا مطمحِ نظر جزائے آخرت ہے۔ اس دنیا میں جو شخص حکمِ شریعت کے ماتحت کوئی کام خدا کے لیے کرے گا وہ کام اس کے لیے دنیا میں بھی ہوگا اور آخرت بھی۔ دنیا میں مفید اور آخرت میں قابلِ اجر۔

مَنْ كَانَ يُرِيْدُ ثَوَابَ الدُّنْيَا فَعِنْدَ اللّٰهِ ثَوَابُ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ وَكَانَ اللّٰهُ سَمِيْعًا بَصِيْرًا ۝

جو شخص دنیا کا ثواب چاہتا ہو تو اللہ کے پاس دنیا بھی ہے اور ثواب آخرت بھی۔ اور اللہ سب کچھ دیکھتا، سنتا ہے۔

(مطلب یہ ہے کہ خدا کے پاس دونوں جہاں کے فائدے ہیں، اس کے پاس دنیا بھی ہے اور آخرت بھی۔ وہ لوگ بڑے کم حوصلہ ہیں جو آخرت کے دائمی اور لازوال فائدے کو چھوڑ کر صرف دنیا کے چند روزہ اور فانی فائدوں کے طلب گار بنے ہوئے ہیں۔)

شیخ عبدالحق محدّث دہلویؒ کا خط
نواب فرید مرتضیٰ کے نام[1]

آپ کے علم شریف سے یہ بات باہر نہ ہوگی کہ خدا کا شکر، نعمت کی زیادتی اور اس کی بقا کا سبب ہے اور یہ بات بھی ہر عاقل جانتا ہے کہ خدا کی نعمتوں کا تمام وکمال پوری طرح شکر ادا کرنا انسان کے بس میں نہیں، اس لیے کہ خدا کی نعمتیں بے شمار ہیں۔

وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا۔ — اگر تم اللہ کی نعمتوں کا شمار کرنا چاہو تو نہ کر سکوگے۔

اللہ کی سب سے بڑی نعمت انسان کا خود اپنا وجود ہے۔ دوسری تمام نعمتیں اس نعمتِ وجود کے بعد ہیں اور جب تک موت نہ آجائے نعمتِ وجود قائم ودائم ہے۔ یہ بھی معلوم ہے کہ دوامِ نعمت کے لیے دوامِ شکر لازم ہے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ جب انسان

---

[1] نواب فرید مرتضیٰ متوفی ۱۰۲۵ھ دربار اکبری کا وہ امیر با توقیر ہے جو اکبر کی زندگی کے آخری ایام میں اس کے خیالات پر اثر انداز ہوا، اس کے عقائد کا رخ پھر اسلام کی طرف موڑا اور اس کی موت کے بعد جہانگیر کو بادشاہ بنا کر اس نے حکومت اکبری کی بے دینی کا خاتمہ کیا۔ وہ ان امرا میں ہے جنھوں نے امیری کے بھیس میں فقیری کی ہے۔ جب ہم تاریخ میں اس کا حال پڑھتے ہیں تو بے اختیار اس کے لیے دل سے دعا نکلتی ہے۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے دین الٰہی اکبر شاہی کو ختم کرنے کے لیے جن امرا کو تیار کیا ان میں نواب فرید مرتضیٰ سب سے نمایاں ہیں۔ شیخ ترک بخاری تھے اور وہ سید بخاری، ان دو بخاریوں کا اتصال فالِ نیک تھا اور دونوں ہماری دعاؤں کے مستحق ہیں۔ (ع۔ ق)

صرف نعمت وجود کے شکریہ سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتا تو وہ دوسری نعمتوں کا شکریہ کب اور کیسے ادا کر سکتا ہے لیکن یہ اللہ کا کرم ہے کہ اپنی بے شمار نعمتوں کے شکرانے میں اس نے اپنے بندوں پر چند اوامر کی تعمیل اور چند نواہی سے اجتناب ضروری قرار دیا ہے اور اتنے ہی پر اکتفا کر کے وہ اپنے بندوں کو اپنی رضا و خوشنودی سے نوازتا ہے۔ اپنی جو بندگی اس نے بندوں پر فرض کی ہے جو بھی اس کو پورا کرے وہ اس کی رضا کا مستحق ہو جاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو مال و دولت اور قوت و قدرت کی جن نعمتوں سے نواز رکھا ہے۔ یہ نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج انھیں نعمتوں کا شکریہ ہیں۔ خصوصیت کے ساتھ نماز تو ایسی عبادت ہے جو ظاہری و باطنی دونوں قسم کی نعمتوں کا شکریہ ہے۔ نماز میں انسان کے تمام اعضاء، تمام ظاہری و باطنی قویٰ اور حواس یہاں تک کہ اس کا پورا وجود خدا کی عبادت و خدمت میں مشغول ہوتا ہے۔ غرض یہ کہ جو شخص بھی شرعی شرائط کے مطابق ان عبادات کو ادا کرتا ہے وہ فی الجملہ شکرگزاروں کے گروہ میں داخل ہو جاتا ہے لیکن ان عبادتوں کو اس طرح ادا کرنا کہ وہ بارگاہِ احدیت میں قابلِ قبول ہو جائیں آسان کام نہیں ہے اور بہت کم لوگ اس سے عہدہ برآ ہوتے ہیں اسی لیے خدا نے فرمایا ہے: وَقَلِیْلٌ مِّنْ عِبَادِیَ الشَّکُوْرُ (اور میرے بندوں میں شکرگزار بندے کم ہیں) ان عبادتوں کے سلسلے میں بھی اللہ کی رحمت عامہ نے بندے کی نجات کو فرائض کے علاوہ کسی اور چیز پر موقوف نہیں رکھا ہے یعنی اگر کوئی شخص صرف فرائض وواجبات ہی کو صدق دل سے ادا کرے تو اس کی نجات ہو جائے گی۔ ہاں جو شخص اپنے اوقات کو نفل عبادتوں سے مشغول رکھے گا وہ خدا کی مزید نعمتوں کا مستحق ہوگا اور مراتب قرب سے سرفراز کیا جائے گا۔

نفل عبادات کے اقسام و مراتب بے نہایت ہے عبادات کے درجات میں جس قدر تفاوت ہوگا اسی نسبت سے مقربانِ بارگاہِ الٰہی کے درجات و مراتب میں تفاوت ہوگا۔ عبادت ہی وہ راہ راست ہے جو انسانوں کو اُن کی منزلِ مقصود یعنی بارگاہِ الٰہی کے قرب

تک پہنچاتی ہے۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :

اِنَّ اللّٰہَ رَبِّیْ وَرَبُّکُمْ فَاعْبُدُوْہُ ۔ بلاشبہ اللہ ہی میرا اور تمھارا رب ہے تو تم
هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِیْمٌ ۔ اس کی بندگی کرو یہی سیدھا راستہ ہے۔

یعنی عبادت ہی راہ راست ہے اس کے علاوہ کوئی راہ نہیں ہے اور اگر ہے تو نا راست (ٹیڑھی) ہے۔ اگر کسی کے قدم ٹیڑھی راہ پر پڑ گئے اور وہ بڑھتا چلا گیا تو تباہی کے گڈھے میں گر کر رہے گا ہاں اگر چند قدم کے بعد ہوشیار ہو گیا اور واپس آکر سیدھی راہ اختیار کر لی، اپنا رخ منزل مقصود کی طرف پھیر دیا تو ایسا شخص سلامت رہے گا اور منزلِ مقصود پالے گا۔

کسانیکہ کزیں راہ برگشتہ اند برفتند و بسیار سرگشتہ اند
(جو لوگ اس راہ میں پھر گئے ہیں انھوں نے اپنے سفر میں سرگشتگی کے سوا کچھ حاصل نہیں کیا ہے۔)

راہ راست ایک ہے اور وہی قریب ترین راہ ہے اس کے دونوں جانب بہت سی پگڈنڈیاں اور پیچ وخم پیدا ہو گئے ہیں۔ ان میں سے ہر پیچ وخم اور ہر پگڈنڈی انسان کو منزل مقصود سے دور کرنے والی ہے۔

ایسا کون ہے جو زندگی میں راہِ راست سے اِدھر اُدھر، دہنے بائیں نہ جھکے اور اس کے قدم پیچ وخم میں بالکل نہ پڑیں ؟

ع یہ رتبۂ بلند ملا جس کو مل گیا

جس شخص کے قدم اتفاقاً پیچ وخم میں جا پڑے لیکن چند قدموں کے بعد اسے ہوش آگیا اور وہ راہِ راست کی طرف پلٹ آیا وہ اہلِ سعادت میں ہے اور اس کا انجام بخیر ہے۔

خدا کی پناہ اس شخص سے جس نے کبھی راہ راست کی طرف توجہ ہی نہ کی یا ٹیڑھی راہ پر اتنا آگے بڑھ گیا کہ راہ راست اس سے بہت دور ہو گئی اور وہاں سے پلٹنا دشوار ہو گیا وہ اسی راہ پر حیران وسرگشتہ چلتا رہا اور ہلاک ہو گیا۔

صراطِ مستقیم کے رہروں پر لازم ہے کہ وہ ہمیشہ چوکنا اور نظر بر قدم رہیں، دیکھتے رہیں

کہ ان کا قدم کہاں پڑ رہا ہے اور کدھر جا رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس راہ کے راہی ہمہ دم توبہ، استغفار اور اعتذار میں مشغول رہتے ہیں۔

توبہ : معصیت سے طاعت، بے رخی و اعراض سے اقبال و توجہ اور غفلت سے ہوشیاری کی طرف پلٹ آنے کا نام ہے۔

استغفار : پردہ پوشی کی طلب کو کہتے ہیں یعنی خدا سے یہ دعا کہ ارتکاب معصیت سے جو ظلمت طاری ہوگئی ہے اور دل پر جو سیاہ نقطہ پڑ گیا ہے، اپنے لطف و کرم اور اپنی رحمت سے اس پر پردہ ڈال دے اور اس کے اثر کو زائل کر دے۔

اعتذار : عذر خواہی کو کہتے ہیں یعنی رہرو اپنے مالک سے معذرت کرتا ہے کہ غلطی سے اس کے قدم راہ کج پر جا پڑے اور راہ استقامت کے سفر میں وقفہ اور خلل واقع ہو گیا۔

یہ توبہ، استغفار اور اعتذار اس راہ کے مسافروں کا توشہ ہے، اس کے بغیر منزلِ مقصود تک پہنچنا ممکن نہیں ہے۔

اس راہ کے راہی کو چاہیئے کہ کبھی اس خیال اور اس فکر سے فارغ نہ رہے۔ اپنی رفتار اور منزلِ مقصود کے قرب و بعد سے آگاہ اور ہوشیار رہے، غفلت کی عادت نہ ڈالے، معصیت پر دلیر نہ ہو اور اپنے آپ کو دائرۂ زجر و سیاست سے باہر نہ نکالے یعنی اپنے نفس کو ہمیشہ ڈانٹتا پھٹکارتا رہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ اس کے قدم ایسی جگہ جا پڑیں جہاں سے واپس آنا دشوار ہو جائے۔

حدیثوں میں آتا ہے کہ وہ شخص جو ارتکاب معصیت کے بعد استغفار کرتا ہے، پھر گناہ میں مبتلا ہوتا ہے اور پھر توبہ کرتا ہے بالفرض دن بھر میں ستر بار ایسا ہوتا ہے جب بھی وہ اس شخص سے بہتر ہے جو ارتکاب معصیت کے بعد توبہ نہیں کرتا، اس پر اصرار کرتا ہے اور گناہ کرتے کرتے اس کا دل سخت ہو جاتا ہے وہ خدا کی دوری و مہجوری سے تسلی پاتا ہے اور خدا کی محبت، عداوت میں بدل جاتی ہے۔ یہی وہ مرتبۂ گناہ ہے جس کو قرآن میں دل پر مہر لگ جانے سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اللہ ہم سب کو اس سے بچائے۔

یہ حقیقت بھی ذہن نشین رکھنے کی ہے کہ انسان، شیطان اور نفس کے شر کو محض اپنی کوشش اور ان سے جنگ کر کے دفع نہیں کر سکتا۔ ان کے شر کو دور کرنے کا حقیقی اور بے خطا ذریعہ یہ ہے کہ انسان ہمیشہ بارگاہِ الٰہی میں دست بدعا رہے، اس کے سامنے روئے اور گڑگڑائے۔ درگاہ ربوبیت میں صدقِ توجہ اور دوام التجا ہی وہ چیز ہے جو انسان کو ان کے شر سے بچا سکتی ہے۔ خصوصیت کے ساتھ نفسِ سرکش کا معاملہ بہت اہم ہے۔ شیطان کا معاملہ تو یہ ہے کہ وہ خدا کا نام لینے اور اس کا ذکر کرنے سے دور دفع ہو جاتا ہے اور ذکر کرنے والوں پر سے اس کا استیلا ختم ہو جاتا ہے لیکن یہ نفس وہ بلا ہے جو ذکرِ الٰہی میں سے بھی اپنا حصہ وصول کرتی اور اس میں خلل انداز ہوتی ہے۔ نفس اس وقت تک شکست نہیں کھاتا جب تک خدائے ذوالجلال کی کبریائی سے استعانت طلب نہ کی جائے صرف اسی کی مدد انسان کو نفس کے شر سے بچا سکتی ہے۔

(مکتوب ۲۶)

جنوری ۱۹۶۱ء

شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ کا مکتوب

(ایمان۔ عمل۔ جزائے عمل)

جن چیزوں پر یقین اور عقیدہ ضروری ہے ان میں سے ایک جزائے عمل ہے۔ عمل نیک ہو یا بد، انسان جو کچھ بھی کرتا ہے دنیا اور آخرت میں اس کا بدلہ پاتا ہے، ہاں دنیا میں عمل کا بدلہ پانا لازم نہیں ہے۔ کیوں کہ یہ دار العمل ہے، دار الجزاء نہیں ہے۔ اصلاً جزا و سزا کی جگہ آخرت ہے، وہاں حقائق اعمال کا ظہور اور اسرار و مخفیات کا انکشاف، قطعی اور حتمی ہے۔ دنیا اصلاً آزمائش کی جگہ اور فتنہ و بلا کا محل ہے۔

دنیا کے مصائب و مکروہات ظالموں اور بدکرداروں کے ساتھ مخصوص نہیں ہیں بلکہ خدا کے راست رو اور نیک بندے بھی ان میں مبتلا کیے جاتے ہیں۔ صالح افراد کے مصائب و آلام میں، خدا کا لطف و کرم پوشیدہ ہوتا ہے — دنیا میں صادقانِ راہ اور مقبولانِ بارگاہ کی بہترین جزا یہ ہے کہ انھیں مزید عمل کی توفیق دی جاتی، طلب رضائے الٰہی کی پیاس میں اضافہ کیا جاتا اور ان کے اعمال میں صدق و یقین کے نور کو نمایاں کیا جاتا ہے، اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مجاہدے کی قوت زیادہ، سعی و طلب کی ہمہ قوی اور شوق و محبت کی آگ تیز ہو جاتی ہے، اس راہ کے مسافروں اور کارگزاروں کے احوال و اعمال کا تجربہ و مشاہدہ اس بات پر گواہ ہے کہ کثرتِ کار اور قوت مجاہدہ، مزید اعمال کی توفیق کو بہت ہی بلند مقام پر پہنچا دیتی ہے۔ مثال کے طور پر، یہ دیکھا جاتا ہے کہ جس شخص پر دو رکعت نماز اور تھوڑی سی تلاوتِ قرآن بھی گراں گزرتی تھی وہی شخص جب اپنے آپ کو اس کا عادی بنا لیتا ہے تو یہ مشق اتنی بڑھ جاتی ہے کہ ہزار رکعتیں اور ایک ختم قرآن بھی

اس کے لیے آسان ہو جاتا ہے۔ یہ سب دراصل، دنیا میں، صدق نیت کا نتیجہ اور عملِ خیر کی جزا ہے، اور یہ دنیوی جزا درحقیقت جزائے آخرت کی تکمیل کی تیاری ہے۔ اس لیے کہ آخرت میں اجر، باندازہ، عمل ملے گا، جزائے عمل پر ایمان لانا اور شریعت کے بارے میں اپنے اعتقاد کو درست کرنا چاہیے اور مخبر صادق صلی اللہ علیہ وسلم نے خدا کے وعدہ و وعید کی جو خبر دی ہے اسے صحیح، درست اور یقینی جاننا چاہیے۔

ضعف ایمان و یقین کا علاج

اگر کسی کا ہیکل ایمان سست اور نور یقین ضعیف ہو گیا ہو تو اس سے کہو کہ ان چیزوں پر عمل کرے جن پر وہ ایمان لایا ہے، اس لیے کہ کثرت عمل اس کے ہیکل ایمان کو چست اور نور یقین کو قوی کر دے گی، اس لیے کہ ایمان و عمل کے انوار ایک دوسرے کو لازم ہیں اور ایک کا عکس دوسرے پر پڑتا ہے، ایمان عمل سے قوت حاصل کرتا ہے اور عمل، ایمان سے، یہ دونوں ایک دوسرے کے مددگار و معاون ہیں۔ عمل کرنے کو ایمان و یقین کی قوت پر موقوف نہ رکھنا چاہیے بلکہ جس قدر بھی ایمان حاصل ہو اور جیسا کچھ بھی ہو، چاہے تقلیدی ہی کیوں نہ ہو، عمل میں سعی کرنی چاہیے۔ عمل سے دل میں نورانیت پیدا ہو گی جس سے ایمان قوت حاصل کرے گا اور پھر ایمان کی قوت، عمل میں قوت پیدا کر دے گی۔ اور پھر موت تک یہی سلسلہ جاری رہے گا۔

ایک گمراہ کن خیال کی تردید

اوپر جو حقیقت بیان ہوئی اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جو شخص یہ کہتا ہے کہ جب یقین، حاصل اور ایمان درست ہو گیا اور محبتِ الٰہی کی ڈوری ہاتھ میں آ گئی، تو اب عمل کی کوئی ضرورت نہیں، تکلیف عمل ختم ہو گئی، اب اگر کوئی عمل ہو گا بھی تو وہ معرفتِ الٰہی میں تفکر ہو گا جو باطن کا عمل ہے، جسم اور جوارح کے اعمال کی کوئی ضرورت نہیں تو ایسا شخص بے دین ہے، اس کا خیال، حقیقت نفس الامری، تجربہ اور نص قرآن،

سب کے خلاف ہے، اس نے الحاد و بے دینی کی راہ اختیار کر لی ہے۔ اہلِ طریقت کے نزدیک یہ بات مسلّم ہے کہ جس قدر محبت میں اضافہ ہوگا، اتباع میں بھی اضافہ ہوگا اور جس قدر ایمان کامل تر ہوگا عمل بھی قوی تر ہوگا۔

ایک دن سید الطائفہ جنید بغدادی قدس سرہٗ کے پاس ایک شخص "معرفت" کی ایسی گفتگو کرنے لگا جس سے اتباع و عمل کو ترک کرنے کی طرف اشارہ ہو رہا تھا یہ گفتگو سن کر حضرت جنیدؒ نے فرمایا "میرے نزدیک یہ بات چوری اور زنا سے بھی بدتر ہے۔ ہرگز کسی عارف کے لیے جائز نہیں کہ وہ ترکِ عمل کرے"۔ ذرا سوچو تو کہ ایمان اور محبت الٰہی میں انبیاء صلوات اللہ وسلامہ علیہم کے احوال سے بلند تر احوال کس شخص کے ہو سکتے ہیں، اس کے باوجود انھوں نے طاعت و عبادت میں بڑی مشقتیں اٹھائی ہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم جو خدا کے سب سے زیادہ مقرب بندے ہیں نمازِ شب میں اتنی دیر کھڑے رہے کہ پائے مبارک پر ورم آگیا، جب آپ کا یہ حال تھا تو دوسروں کے بارے میں اور کیا کہا جائے، نیز یہ بات بھی معلوم ہے کہ انبیاءؑ کے افعال و اعمال تشریع کے لیے ہوتے تھے تاکہ وہ دوسروں کو اپنا عمل دکھائیں اور انھیں سکھائیں، جب تشریع اس لیے ہے کہ دوسرے دیکھیں اور اتباع کریں تو پھر ترکِ عمل کا سوال کہاں پیدا ہوتا ہے اگر لوگ ایمان لانے کے بعد اتباع و عمل چھوڑ دیں تو تشریع بے کار ہو جاتی ہے لہٰذا معلوم ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی متابعت میں عمل کرنا لازم ہے۔ اس پہلو سے بھی ترکِ عمل کی بات غلط ہے کہ ایمان عمل ہی سے کمال حاصل کرتا ہے اور مراتب کمال کی کوئی نہایت نہیں ہے۔ آخر وہ کون سا مرتبہ اور درجہ ہے جہاں پہنچ کر یہ مدعی ترکِ عمل کرے گا۔ بہرحال ترکِ عمل کی بات، ملحد و بے دین لوگ کہتے ہیں، ان کی باتوں پر کان نہ دھرنا چاہیے۔ نعوذ باللہ من الکفر والالحاد۔

ایمان و عمل کا باہمی ربط

یہ بات صحیح ہے کہ حقیقت ایمان اور اس کے اصل وجود میں عمل معتبر نہیں ہے۔

بے عملی کے باوجود نفس ایمان کا وجود ہوتا ہے اور ہو سکتا ہے لیکن ناقص ہوتا ہے' ایمان کا کمال عمل پر موقوف ہے۔ ضعف و قوت اور کمال و نقصان کے لحاظ سے ایمان و یقین کے درجات بہت ہیں۔ ایمان کے نتائج و ثمرات' دلوں کی قوت و نورانیت کے مطابق ظاہر ہوتے ہیں۔ مثلاً کوئی دل آفتاب کی طرح روشن و تاباں ہوتا ہے، کوئی ماہتاب کی طرح' کوئی ستارے کی طرح' اور کوئی شمع کی طرح۔ ایمان و یقین کے تفاوت کو اسی پر قیاس کرنا چاہیئے۔ یہ بات بہت واضح ہے اس لیے مزید تشریح کی ضرورت نہیں' خلاصہ یہ ہے کہ تصدیقاتِ قلبی میں قوت و ضعف اور کمال و نقصان کے لحاظ سے تفاوت ثابت ہے اور یہ بات بھی ثابت ہے کہ ایمان میں قوت و کمال عمل سے پیدا ہوتا ہے اور ضعف و نقصان ترک عمل سے' دنیا آخرت کی کھیتی ہے، جو بوؤ گے وہ کاٹو گے ــــ اصل چیز ایمان ہے اس کی فکر کرنی چاہیئے۔ اگر یہ سلامت رہے تو پھر کسی چیز کا غم نہیں۔

کار کن کار بگذر از گفتار　　　کاندریں رہ، کار دارد کار

ایمان کیا ہے؟

جانتے ہو ایمان کیا ہے؟ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ پر سچے دل سے اعتقاد اور بلا شک و شبہ اس کلمۂ ایمان کے ہر دو جزو کے ساتھ گرویدگی اگرچہ پہلا جزو عظیم تر اور بزرگ تر ہے لیکن دوسرے جزو کی اہمیت اس پہلو سے بہت زیادہ ہے کہ اس کے بغیر پہلا جزو معتبر نہیں۔ اگر کوئی شخص سو سال تک لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کہتا رہے پھر بھی بحکم شرع وہ اس وقت تک مسلمان نہیں ہو سکتا جب تک ایک بار مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ نہ کہہ لے۔ یعنی اللہ فرماتا ہے کہ میں تو تمھارا الٰہ اور پروردگار ہوں ہی' مجھ پر ایمان لانے میں تمھیں کیا تامل ہو سکتا ہے۔ ہاں جسے میں اپنی رسالت کے لیے منتخب کروں اس پر ایمان لاؤ اور اس کے گرویدہ بنو۔ کیونکہ تمھاری بندگی کا امتحان اسی میں ہے۔ اگر تم میرے رسول پر ایمان نہیں لاتے تو اس کے

معنی یہ ہیں کہ تم اپنے دعویٰ عبودیت میں سچے نہیں ہو۔ اس حقیقت کو قصۂ آدم میں سمجھنا چاہیئے۔ اللہ نے ملائکہ سے کہا۔ تم مجھے پوجتے ہو، میری تسبیح و تقدیس میں رطب اللسان ہو، کیوں کہ میں تمھارا رب ہوں اور اس لائق ہوں کہ مجھے پوجا جائے اور میری تسبیح و تقدیس کی جائے، تمھاری بندگی کا اصل امتحان اسی میں ہے کہ میں مٹی سے ایک پتلہ بناتا ہوں، اس میں اپنی روح پھونکتا ہوں، اسے تم پر فوقیت عطا کرتا ہوں اور تمھیں حکم دیتا ہوں کہ اس کے آگے سجدہ ریز ہو جاؤ۔ اس امتحان سے معلوم ہوگا کہ بندہ کون ہے اور بندگی کیا ہے (اس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالےٰ کے ہر حکم پر سرِ تسلیم خم کر دینا ہی ایمان ہے۔)

(کتاب المکاتیب والرسائل کے رسالہ ۲۳ کے چند اقتباسات)

جون ۱۹۶۲ء

شیخ عبدالحقؒ محدّث دہلوی کا مکتوب

(تقویت دین وملّت سے اونچا کوئی کام نہیں)

التعظیم لامراللہ اور الشفقۃ علی خلق اللہ امرِ خداوندی کی تعظیم اور خلقِ خدا پر شفقت، بازوئے دین مسلمانی کے دو ایسے شہپر ہیں جن کی قوت کے بغیر، قرب و رضائے الٰہی کے مقام تک پہنچنا محال ہے۔ اس راہ کے رہرووں کے درمیان سرعت سیر، قوت سلوک اور قلیل مدت میں بارگاہ الٰہی تک پہنچ جانے میں تفاوت انھیں دو بازووں کی قوت کے اندازے سے ہوتا ہے۔ جس شخص کے ان دو بازووں میں زور زیادہ ہوتا ہے وہ مقام قرب تک بہت آسانی سے اور بہت جلد پہنچ جاتا ہے۔ میں نے اس حقیقت کی تعبیر قوت بازو سے کی ہے۔ یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ توفیق الٰہی اگر مددگار ہو تو ان دو صفتوں (امر خداوندی کی تعظیم اور خلق خدا پر شفقت) کی وساطت سے قطع مسافت اس حد تک پہنچتی ہے کہ بعض رہرووں کی رفتار، پرندے کی پرواز بن جاتی ہے اور وہ ایک لمحے میں اس مقام تک پہنچ جاتے ہیں، جہاں دوسرے لوگ سخت محنت و مجاہدہ کے باوجود، عمر کی ایک طویل مدت تک پہنچ نہیں پاتے۔

مردانِ حق ببالِ محبت چو بر پرند ۔۔۔ اول قدم بکنگرۂ عرش جا کنند

(مردانِ حق جب بازوئے محبت سے پرواز کرتے ہیں تو ان کا پہلا قدم عرش کی بلندی پر پڑتا ہے)

ان ۲ دو صفتوں میں پہلی صفت یعنی امر الٰہی کی تعظیم اہم بھی ہے اور مقدم بھی

ہے گویا یوں سمجھو کہ یہ پرندوں کے دو بازوؤں میں دہنا بازو ہے یا آدمیوں کے دو ہاتھوں میں سیدھا ہاتھ ہے جس طرح سیدھے ہاتھ میں قوت بھی زیادہ ہوتی ہے اور عمل پر قدرت بھی زیادہ ہوتی ہے اسی طرح قربِ الٰہی کے حصول میں یہ صفت قوی تر سبب کی حیثیت رکھتی ہے۔

خلقِ خدا پر شفقت اگرچہ نسبتِ محبت کی تحصیل، رحمتِ الٰہی کی کشش، علاقۂ آدمیت و جنسیت کی رعایت اور طریقِ انصاف و شکر گزاریِ حق کے سیر و سلوک میں ایک بلند مقام رکھتی ہے۔ نیز یہ صفت، فطرت کی سلامتی، ہمت کی بلندی اور طبیعت کی پاکیزگی کی دلیل ہے۔ اجرِ جزیل اور دنیا و آخرت میں ثنائے جمیل کا سبب ہے لیکن ان تمام باتوں کے باوجود تعظیم امرِ الٰہی کا مقام، اعلائے کلمۂ اسلام اور دین و ملت کی تقویت و تائید میں اس سے بہت زیادہ بلند ہے۔

و بحقیقت، ہیچ صفتے و ہیچ کارے کہ باعث قبول و سفید روئی مرد، در بارگاہ عزت و درگاہ نبوت تواند شد بالاتر ازاں نیست کہ در تقویت دین و ملت و ترویج و تائید سنت کوشد و در آں بذل مجہود نماید و در سواد آں لشکر اگرچہ تن تنہا باشد بیفزاید[1]

اور درحقیقت کوئی صفت اور کوئی کام جو بارگاہ الٰہی اور درگاہ نبوی میں قبولیت اور سفید روئی کا سبب ہو سکتا ہو اس سے بلند نہیں ہے کہ کوئی شخص، دین و ملت کی تقویت اور سنت کی ترویج و تائید میں کوشاں ہو۔ اس میدان میں اپنی پوری کوشش صرف کرے اور اگرچہ وہ تن تنہا ہو اس لشکر کی تعداد میں اپنے وجود سے اضافہ کرے۔

---

[1] اس عبارت کی اہمیت کما حقہ وہی شخص جان سکتا ہے جو اس تاریخی کشمکش سے واقف ہو جو اکبر کے دینِ الٰہی نے حق پرستوں اور باطل پرستوں کے درمیان برپا کی تھی۔ اس عظیم گمرہی کے استیصال میں شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے بڑا اہم رول ادا کیا تھا۔ یہ خط انھوں نے نواب فرید مرتضیٰ ☆

امرِ الٰہی کی تعظیم کے معنی یہ ہیں کہ جس چیز کے بارے میں اللہ نے کہا ہے کہ "کرو" اسے کرے اور جس چیز کے بارے میں کہا ہے کہ "نہ کرو" اس سے باز رہے۔

بنارِ اسلام کے دُو رکن ہیں۔ اوامر کا امتثال اور نواہیؔ سے اجتناب۔ یہ بات جان لینی چاہیے کہ طریقِ حق میں سیر و سلوک اور مقامِ قرب تک رسائی کے لیے نواہی سے اجتناب زیادہ اہمیت رکھتا ہے کیوں کہ اوامر کی تعمیل، نواہی کے ارتکاب کے ساتھ مفید نہیں ہے۔ اس کو یوں سمجھو کہ مرض سے شفا حاصل کرنے کے لیے مضر چیزوں سے پرہیز دواؤں کے استعمال سے بھی زیادہ ضروری ہے۔ اگر کوئی مریض پرہیز نہ کرے تو نفع بخش دواؤں کے استعمال کے باوجود اسے صحت حاصل نہ ہوگی اور اگر وہ پوری احتیاط اور مبالغہ کے ساتھ نقصان دہ چیزوں سے پرہیز کرے تو دواؤں کے استعمال کے بغیر بھی شفار کی امید ہے ہاں اس صورت میں شفایابی میں دیر لگ سکتی ہے اور اگر پرہیز بھی کرے اور مفید دوائیں بھی استعمال کرے تو شفا جلد حاصل ہوگی یہی وجہ ہے کہ مشائخ طریقت نے فرمایا ہے کہ مقامِ قرب تک رسائی کے حصول میں تقویٰ اور پورے مبالغے کے ساتھ، محرمات، مکروہات و مشتبہات سے پرہیز کو زیادہ دخل حاصل ہے۔ اگر کوئی شخص اس کے ساتھ فرائض و واجبات اور سننِ مؤکدہ پر اکتفا کرے اور تکثیرِ نوافل میں کوشش نہ کرے تو حصولِ مقصود کے لیے کافی ہے لیکن محرمات و منہیات کا ارتکاب کرتے ہوئے نوافل و مستحبات کی کثرت کوئی چیز نہیں ہے۔ انھوں نے یہ بھی کہا ہے کہ فرائض میں سستی اور نوافل میں چستی غرورِ نفس اور فریبِ شیطان کا اثر ہے۔

یہاں ایک اور پہلو قابلِ غور ہے۔ سوال یہ ہے کہ امتثالِ اوامر و اجتنابِ نواہی

٭ کو لکھا ہے اور اس میں پوری صراحت کے ساتھ ان کو دینِ حق کی حمایت کی ترغیب دی ہے۔ اس مختصر عبارت میں شیخ نے اپنے دینی جوش اور جذبۂ گرم کو ادبیت کے سانچے میں ڈھال دیا ہے یہ ان کے ادب پاروں میں ایک مؤثر ادب پارہ ہے۔ (مترجم)

کے لیے تعظیم امر اللہ کی تعبیر کیوں اختیار کی گئی۔ اس میں جو اشارہ مخفی ہے اسے سمجھنا چاہیے۔ اشارہ یہ ہے کہ مجرد احکام کی تعمیل اور منہیات سے پرہیز کافی نہیں ہے بلکہ مومن کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ احکامِ الٰہی کی عظمت اس کے دل میں ہو اور اس کی زبان اس کا اعتراف واظہار کرتی رہے۔ شریعت کے اصول وضوابط پر پورے جذبۂ احترام کے ساتھ نظر ڈالے۔ اہلِ دین کی عزت کرے اس لیے کہ وہ خدا کے مقبول بندے ہیں اور رسولِ خدا کی طرف منسوب ہیں۔ اہلِ بدعت وضلالت اور اہلِ الحاد و اباحت کو ذلیل سمجھے، ان کو آگے نہ بڑھائے، ان کی طرف التفات نہ کرے اور انھیں قابلِ اعتبار نہ سمجھے اس لیے کہ وہ خدا کی رحمت سے دور اور اس کے مردود بندے ہیں۔ ائمۂ دین نے فرمایا ہے کہ ملحدوں اور زندیقوں کو فنا کرنا فی الحقیقت انبیاء کرامؑ کو زندہ کرنا ہے اس لیے کہ دین و شریعت کو لانے والے وہی ہیں۔ جس شخص نے بھی ان ملحدوں اور زندیقوں میں سے کسی کو ذلیل کیا اس نے گویا انبیاءؑ کی عزت کی۔ یہ بات بالکل واضح ہے کہ کسی شخص کے دین و مذہب اور طریقہ وروش کے مخالف کی عزت وتعظیم درحقیقت اس شخص کی توہین وتحقیر کے مترادف ہے۔ اسی طرح کسی شخص کے طریقہ وروش کے پیرو کی تعظیم دراصل اس شخص کی تعظیم ہے۔ اسی لیے لوگوں نے کہا ہے کہ دوست کا دوست، دوست ہوتا ہے اور دوست کا دشمن، دشمن ہوتا ہے۔ مسلمانی یہی ہے اس کے علاوہ جو کچھ ہے دعویٰ بلا دلیل ہے[2]

حرام اور نامشروع چیزوں کے باب میں نیت دخل نہیں رکھتی۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ کسی کی نیت معلوم نہیں کہ کیا ہے۔ نیت نیک ہونی چاہیے۔ عمل کا اعتبار نہیں ہے۔ اس کا

---

[1] حضرت شیخ کا یہ پورا پیراگراف قابلِ غور ہے تھوڑے تامل کے بعد واضح ہو جاتا ہے کہ پہلے انھوں نے نواب فرید کو دینِ اسلام کی حمایت پر آمادہ کیا ہے اور اس پیراگراف میں ان کو اکبر شاہی دین کے خلاف صف آرا ہونے کی ترغیب دی ہے اور پورے زور کے ساتھ دی ہے۔

[2] "مسلمانی یہی ہے باقی جو کچھ ہے دعوےٰ، بلا دلیل ہے۔" مومنِ صادق کو جھنجھوڑ دینے والا جملہ ہے۔ (مترجم)

جواب یہ ہے کہ نیک نیتی اصل شے ہے لیکن اچھی نیت وہ ہوتی ہے جس سے اچھا کام کیا جائے۔ نیت اچھی اور کام برا۔ یہ کیا لغویت ہے، برا کام، اچھی نیت سے اچھا نہیں ہو سکتا۔ یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کرنی چاہیے کہ نیکی وبدی، حکم شریعت کے تابع ہے۔ شریعت نے جس کام کا حکم دیا ہے وہ نیک ہے اور جس سے روکا ہے وہ بد ہے۔ عقائد کی کتاب میں علماء نے لکھا ہے الحَسَن ماحسّنہ الشرع والقبح ماقبحہ الشرع (اچھا وہ ہے جسے شریعت نے اچھا قرار دیا ہو اور برا وہ ہے جسے شریعت نے برا کہا ہو) شریعت کے حکم کے بغیر کسی کام میں حسن وقبح نہیں ہوتا۔ عقل کسی کام کے نیک یا بد ہونے کا حکم نہیں لگا سکتی۔

یہاں ایک شبہ پیدا ہوتا ہے کہنے والا کہہ سکتا ہے کہ تم نے جو بات کہی وہ عقل کے خلاف ہے اور حقیقت نفس الامری سے متصادم ہے اس لیے کہ ہر شخص یہ جانتا ہے کہ مثلاً علم، عدل، جود وسخا اور تواضع اچھے صفات ہیں اسی طرح جہل، بخل، اور تکبر برے خصائل ہیں۔ یہ بات مجرد عقل سے معلوم ہوتی ہے اور عقل ان صفات کے اچھے اور برے ہونے کا حکم خود لگاتی ہے۔ بالفرض اگر شریعت نہ ہوتی جب بھی عقل یہ حکم لگاتی۔

اس شبہے کا جواب یہ ہے کہ سب سے پہلے یہ بات جان لینی چاہیے کہ اس مقام میں نیکی اور بدی کے معنیٰ کیا ہیں؛ تاکہ یہ واضح ہو جائے کہ نیکی اور بدی صرف شریعت کے حکم پر موقوف ہے۔ نیکی وبدی کے دو معنیٰ ہیں۔ ایک یہ کہ کوئی صفت بذاتِ خود موجبِ کمال ہو اور لوگ اس کی تعریف کریں یا کوئی صفت بذاتِ خود نقصان دہ ہو اور لوگ اس کی مذمت کریں۔ اس معنی کے لحاظ سے بے شک عقل کسی صفت پر نیکی یا بدی کا حکم لگا سکتی ہے اور اس معنیٰ کا ادراک شریعت پر موقوف نہیں ہے لیکن یہاں نیکی اور بدی کے ایک معنی اور ہیں اور وہ یہ کہ کونسی صفت آخرت میں موجب ثواب اور کونسی صفت وہاں موجب عذاب ہے۔ اس معنی کے لحاظ سے نیکی و بدی صرف شریعت کے حکم پر موقوف ہے۔ عقل کا یہاں دخل نہیں۔ اگر کوئی کام ایسا ہو کہ لوگ اس کی تعریف کرتے ہوں اور اُسے موجبِ کمال جان رہے ہوں لیکن شرع نے

اس سے روک دیا ہو تو وہ کام آخرت میں موجب عقاب ہوگا اور اس کے برعکس اگر لوگ کسی کام کو ناپسند کر رہے ہوں اور شریعت نے اس کا حکم دیا ہے تو آخرت میں وہ موجبِ ثواب ہوگا۔ اس معنی کے لحاظ سے یہ بات کہی جاتی ہے کہ حسن و قبح شریعت کے حکم پر موقوف ہے۔ اس بات کا اشارہ ذیل کی آیت میں موجود ہے:

عَسٰی اَنْ تَکْرَھُوْا شَیْئًا وَّھُوَخَیْرٌ لَّکُمْ وَعَسٰی اَنْ تُحِبُّوْا شَیْئًا وَّھُوَ شَرٌّ لَّکُمْ

ہو سکتا ہے کہ تم کسی چیز کو ناپسند کرو اور وہ تمھارے لیے خیر ہو اور تم کسی چیز کو پسند کرو اور وہ تمھارے لیے شر ہو۔

اگرچہ یہ آیت براہ راست اس مسئلے سے متعلق نہیں ہے لیکن اشارۃً اس میں یہ حقیقت موجود ہے۔

علم، عدل اور سخاوت پر ثواب اس لیے ملے گا کہ اللہ تعالےٰ نے ان کا حکم دیا ہے اور ان کے ضد پر عذاب اس لیے ہوگا کہ ان سے روکا گیا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو محض عقل کے اچھا یا برا کہنے سے نہ ثواب ملتا، نہ عذاب ہوتا۔ آخر عقل کیا سمجھ سکتی ہے کہ ۲۹ رمضان کو دن کے وقت اگر کھائیں تو گنہ گار ہوں اور دوسرے دن اگر عید ہو اور عید کے دن نہ کھائیں (یعنی روزہ رکھیں) تو گنہ گار ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ حکم، شریعت کا حکم ہے دوسری کوئی چیز نہیں ہے۔

یہاں ایک اور نکتہ ہے جس کی طرف تنبیہ کرنا ضروری ہے اور وہ یہ ہے کہ تمام کمالات و حسنات کا مبنیٰ و مدار دو چیزیں ہیں۔ نیتِ صحیح اور عمل صحیح۔ اگر یہ دونوں جمع ہوں (اور ان دونوں کا اکٹھا ہونا آسان نہیں ہے) تو کام مکمل ہوتا اور دین مسلمانی میں کمال آتا ہے۔ نیت صحیح یہ ہے کہ جو عمل کریں، خدا کے لیے کریں اور اس کا مقصود رضائے الٰہی اور ثواب آخرت کے سوا کچھ اور نہ ہو، اور عمل صحیح یہ ہے کہ وہ طریقہ، دین و شریعت، اور حکم شارع کے موافق ہو، اس کے خلاف نہ ہو ___ اگر اعمال صرف نیت صحیح کی بنیاد پر، اچھے اور موجب کمال ہوتے تو بہت سے گمراہ درویشوں، ملنگوں بلکہ برہنہ فقیروں کے اعمال و افعال بھی اچھے اور موجب کمال بن جاتے، اس لیے کہ یہ

سب اپنے اعتقادِ فاسد کی بنا پر بزعم خود نیت صادق رکھتے ہیں۔ راہِ حق کے مسافر ہیں اور خدا کا قرب چاہتے ہیں لیکن یہ قربِ حق سے محروم ہیں کیوں کہ ان کا عمل، عمل صحیح نہیں ہے۔ مرضیِ حق اور حکم شارع کے موافق نہیں ہے۔

یہاں ایسے مجاہدے اور ریاضت کی ضرورت ہے جو طریقِ حق اور مرضیاتِ الٰہی کے موافق ہوتا کہ اثر پیدا کرے اور قابلِ اعتبار ہو۔ مجاہدہ و ریاضت کا مفہوم ہی یہ ہے کہ انسان اپنے نفس کو، محنت و مشقت کر کے، شریعت کا مطیع و منقاد بنائے۔

جس طرح نیت صحیح، عملِ صحیح کے بغیر کارآمد نہیں۔ اسی طرح عملِ صحیح، نیتِ صحیح کے بغیر لاحاصل ہے۔ اگر کسی شخص کا ظاہری عمل شریعت کے موافق ہے لیکن نیت فاسد ہے۔ یعنی اس سے مقصود ریا و سُمعہ اور محض دکھاوا ہے تو یہ شخص ثوابِ آخرت اور رضائے الٰہی سے محروم رہے گا۔ انما الاعمال بالنیات اعمال، اچھی نیت سے لائقِ ثواب اور قابلِ اعتبار ہوتے ہیں۔

میں نے اوپر جو یہ بات کہی ہے کہ موافقتِ حق کے بغیر ریاضت و مجاہدے سے اثر پیدا نہیں ہوتا اس سے مراد اس اثر کی نفی ہے جو نورِ ایمان کی زیادتی، رضائے الٰہی کے حصول اور آخرت کی سُرخ روئی کا سبب بنتا ہے جو موجبِ اجر و ثواب اور باعثِ نجات ہوتا ہے۔ اس اثر کی نفی مقصود نہیں ہے جو بعض جوگیوں کو بھی ان کی مشقت و ریاضت سے حاصل ہو جاتا ہے۔ بعض امور کے کشف کسی خارقِ عادت شئے کے ظہور اور بعض ارواحِ خبیثہ کی تسخیر کے لیے ایمان و عمل شرط نہیں ہے۔ یہ چیز بے ایمانوں کو بھی حاصل ہو سکتی ہے۔ اس کو یوں سمجھو کہ چہرہ پانی میں بھی نظر آتا ہے اور پیشاب میں بھی، باوجود اس کے کہ پانی پاک ہے اور پیشاب ناپاک۔ اس فرق کو نہ جاننے کی وجہ سے ایک طرف بہتیرے کفار اپنے اعتقادِ فاسد پر مطمئن رہتے ہیں اور دوسری طرف بعض نادان، وسادہ لوح مسلمان اس طرح کے جوگیوں تک کے معتقد ہو جاتے اور ان کا احترام واکرام کرنے لگتے ہیں۔ ایسے لوگوں کا اعزاز دین سے غفلت کا نتیجہ ہے۔

اسی کے ساتھ یہ بھی ملحوظ رہے کہ مسلمان اگرچہ عاصی واسیرِ شہوت ہو وہ قابلِ عزت
ہے ۔ اس کے اسلام کی عزت اور اس کے ایمان کی حرمت ' ہاتھ سے جانے نہ دیں
یہ ٹھیک ہے کہ وہ جرم کرے تو اس پر شریعت کے حدود و احکام نافذ کیے جائیں
لیکن اس کی بے حرمتی صحیح نہیں ہے ۔ (مکتوب ۳۴)

ستمبر ۱۹۶۳ء

شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ کا ایک مکتوب

(گمراہ صوفیوں کی اصلاح)

مقصد تک پہنچنے کے لیے دو چیزیں ضروری ہیں۔ پہلی چیز یہ کہ انسان اس راستے کو جانتا پہچانتا ہو جس پر چل کر مقصد تک پہنچنا ہے۔ دوسری یہ کہ عملاً رہروی اختیار کرے اور اس راہ پر چل پڑے۔ رہروی کا طریقہ کیا ہو یہ بھی راہ دانی و راہ شناسی میں داخل ہے۔ اس لیے کہ جس نے راہ دکھائی ہے اس نے رہروی کا طریقہ بھی بتایا ہے سب سے پہلی بات یہ کہ مقصد تک پہنچانے والی راہ کو راہ راست ہونا چاہیے تاکہ وہ یقین کے ساتھ منزل مقصود تک پہنچائے اور بسرعت و بسہولت پہنچائے۔ ٹیڑھے راستے میں طرح طرح کی آفت و مصیبت بھی ہے اور یہ یقین بھی نہیں کہ وہ منزل تک پہنچا دے گا۔

راہِ راست، اللہ کی عبادت ہے

قرآن مجید کی نص نے بتا دیا ہے کہ راہِ راست عبادت ہے۔

إِنَّ اللّٰهَ رَبِّي وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوهُ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيمٌ ۝

اللہ میرا رب بھی ہے اور تمہارا رب بھی ہے لہٰذا اسی کی بندگی کرو یہی سیدھا راستہ ہے۔

اگر کوئی شخص عبادت کے سوا کسی اور چیز کو راہِ راست سمجھتا ہے تو غلط سمجھتا ہے اور اپنے آپ کو ضلالت و الحاد کے بھنور میں ڈالتا ہے۔ راہ دکھانے والے اور اس پر چلنے کا طریقہ بتانے والے اللہ کے رسولؐ ہیں۔ (ان کی پاک روح پر، ان کے مقدس

اہلِ بیت پر اور ان کے عالی قدر صحابہ پر سو ہزار درود و سلام) دوسرے تمام لوگ ان کی پیروی کرنے والے ہیں۔ جس نے ان کی پیروی کی اور ان کی ہدایات و تعلیمات پر چلا، وہ منزلِ مقصود تک پہنچا۔ باقی تمام چیزیں گمراہی اور محلِ خوف و خطر ہیں۔

کسانے کہ زیں راہ برگشتہ اند   برفتند و بسیار سرگشتہ اند

(جو لوگ اس راہ سے برگشتہ ہو گئے ہیں انھیں دوسری راہوں میں سرگشتگی و گمرہی کے سوا کچھ نہیں ملا ہے۔)

ہمارے زمانے کے صوفیوں کی اصل آفت

ہمارے زمانے کے سالکوں اور صوفیوں کی آفت یہ ہے کہ وہ راہ راست سے ناواقف ہیں۔ اتباعِ شریعت کی اصل راہ پر نہیں چل رہے ہیں، وہ نئے طریقوں پر عمل پیرا اور نئی نئی راہوں کے مسافر ہیں۔ اس کے کئی اسباب ہیں۔ ان میں کے بعض جہالت اور محض اپنے میلانِ طبع کی وجہ سے ایسا کر رہے ہیں۔ کچھ لوگ اشتباہ و التباس میں گرفتار ہیں کچھ لوگوں پر سُکر اور غلبۂ حال کی کیفیت طاری ہے اور بعضوں کے ساتھ معاملہ یہ ہے کہ اگلوں نے اپنے امراض کے علاج کے لیے کچھ طریقے جاری کیے تھے جو اسی وقت کے ساتھ مخصوص اور انہیں کے مناسب حال تھے لیکن پچھلوں نے ان طریقوں کی اتباع و پیروی کو لازم قرار دے کر یہ اعتقاد جما لیا کہ طاعات و عبادات اور شریعت کے احکام، ظاہر کے مشغلے اور اربابِ ظاہر کی عادتیں ہیں، درویشوں کی مشغولیاں دوسری ہیں بلکہ کہتے ہیں کہ یہ تمام عبادات و احکام عوام کی ہدایت کے لیے ہیں اور خواص کا طریقہ ان سے الگ ہے کہتے ہیں کہ نماز، روزہ بیوہ عورتوں کا کام ہے مردوں کا کام کچھ اور ہے۔ ان نادانوں کی غلطی اور غفلت کا سبب یہ ہے کہ یہ لوگ نہیں جانتے اور نہیں سمجھتے کہ یہ تمام شغلے اور یہ تمام کام کس کے بیان کردہ اور کس کے مقرر کردہ ہیں اور ان کے نتائج و فوائد کیا ہیں۔ یہ نہیں جانتے کہ انبیاء علیہم السلام بالخصوص سید المرسلین صلوٰت اللہ وسلامہ علیہ وعلیہم کی بعثت کا مقصد مکارمِ اخلاق کی تکمیل ہے۔ وہ اس لیے بھیجے گئے ہیں کہ خلقِ خدا کی ہدایت

کریں اور بندگانِ خدا کو صلاح و فلاح کی سیدھی راہ دکھائیں۔ ان حضرات نے جو افعال و اعمال کیے ہیں اور جو راستے دکھائے ہیں اگر وہ خدا تک پہنچانے والے اور اس سے قریب کرنے والے نہیں ہیں تو پھر دوسرا کون سا راستہ ایسا ہو سکتا ہے؟ ہاں یہ بات ضرور ہے کہ ایسے لوگ کہاں اور کتنے ہیں جو ان افعال و اعمال کو تمام شروط و حدود اور مشاہدہ و مراقبہ کے ساتھ انجام دیں جیسا کہ فرمایا گیا ہے۔ اَلْاِحْسَانُ اَنْ تَعْبُدَ رَبَّكَ كَاَنَّكَ تَرَاهُ فَاِنْ لَّمْ تَكُنْ تَرَاهُ فَاِنَّهٗ يَرَاكَ (احسان یہ ہے کہ تم اپنے رب کی اس طرح عبادت کرو جیسے اس کو دیکھ رہے ہو اور اگر تم اسے نہیں دیکھ رہے ہو تو وہ تم کو دیکھ رہا ہے) اس راہ کو ان کی تعلیم کے مطابق طے کرنے والے کتنے ہیں؟

عبادات سے اعراض کی ایک اور وجہ

اہل بطالت نے یہ عبادتیں شرائط و حدود کے ساتھ ادا نہ کیں اس لیے ان کے نتائج و ثمرات سے محروم رہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ انھوں نے ان عبادات ہی کے بارے میں سست اعتقادی، تردد اور انکار کی روش اختیار کر لی اور ابدی محرومی کے گڑھے میں جا گرے۔ ان کوتاہ نظروں کو چاہیے کہ اگر وہ اپنی کوتاہی کی وجہ سے اس دنیا میں عبادات کے انوار و تجلیات سے محروم رہ گئے ہیں تو کم سے کم دائرۂ ایمان سے خارج نہ ہوں، ان کو جاننا چاہیے کہ یہ عبادتیں کس کی مقرر کی ہوئی ہیں اور آخرت میں ان کا بدلہ اور نتیجہ کیا ہے۔ قرآن کہتا ہے:

تَتَجَافٰى جُنُوْبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ خَوْفًا وَّ طَمَعًا وَّ مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ۝ فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّاۤ اُخْفِيَ لَهُمْ مِّنْ قُرَّةِ اَعْيُنٍ جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوْا

(رات کو نماز کے لیے) ان کے پہلو بستروں سے الگ ہوتے ہیں وہ اپنے رب سے خوف و امید کے ساتھ دعا کرتے ہیں اور جو کچھ ہم نے انھیں دے رکھا ہے اس میں سے (راہِ خدا میں) خرچ کرتے ہیں تو کوئی بھی نہیں جانتا کہ لوگوں کے اعمال کے بدلے میں کیسی کیسی آنکھوں

يَعْمَلُوْنَ ○ (السجدة:) کی ٹھنڈک ان کے لیے پردۂ غیب میں موجود ہے۔

جنت کی تمام نعمتوں کو اللہ نے اپنے فضل وکرم سے اعمال ہی کی جزا قرار دیا ہے جَزَاءً بِمَا کَانُوْا یَعْمَلُوْنَ۔

ایک ایمان افروز نکتہ

عزیزِ من! اصل چیز ایمان وعمل ہے۔ یہی چیز اس دنیا میں فضائے دل کو روشن کرتی، عبادت گزاروں کو عبادتوں کا لذت شناس بناتی، اس کے سامنے بہشتی نعمتوں کے نمونے پیش کرتی۔ مولیٰ تعالیٰ کا مشاہدہ کراتی اور ذوق وشوق میں بصیرت پیدا کر کے ظلمت کفر کو محو کرتی ہے اور پھر یہی نور اس عالم (آخرت) میں مکمل تر، وسیع تر اور لطیف تر ہو کر وہاں کے ملک بے پایاں اور فضائے بیکراں پر محیط ہو جائے گا۔ عبادت گزار عیاناً نعیم جنت سے ہم کنار ہو کر خدائے بے مثل وبے نظیر کو سر کی آنکھوں سے دیکھے گا حجاب درمیانی اٹھ جائے گا اور کوئی پردہ باقی نہ رہے گا۔

دوسری غلطی

دوسری غلطی جو ان خطا کاروں نے کی وہ یہ ہے کہ انھوں نے آغاز عمل کو ایمان کامل پر موقوف کر دیا ہے۔ کہتے ہیں کہ جب تک یقین حاصل نہ ہو جائے کہ ان اعمال کی حقیقت کیا ہے ہم عمل نہیں کریں گے۔ جہل ونادانی کے دیو نے ان کی راہ مار دی ہے اور یہ ظلمت وبطالت کی قبر میں بے کار ومعطل پڑے ہوئے زندگی گزار رہے ہیں۔ اس صورت میں نہ عمل ہو گا اور نہ ایمان۔ خَسِرَ الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَۃَ ذٰلِکَ ھُوَ الْخُسْرَانُ الْمُبِیْنُ ○ (دنیا میں بھی گھاٹا اور آخرت میں بھی، یہ کھلا ہوا گھاٹا ہے) یہ نہیں جانتے کہ ایمان کی نورانیت عمل سے قوت حاصل کرتی ہے جس طرح توفیق عمل ایمان سے بڑھتی ہے۔ ہر دو نور، ایک دوسرے کے عکس گیر اور لازم وملزوم ہیں اور فی الحقیقت نور ایک ہی ہے۔ دل میں ہو تو تصدیق، زبان پر آئے تو اقرار اور اعضاء جوارح میں سرایت کرے تو عمل۔ نُوْرٌ عَلٰی نُوْرٍ یَھْدِی اللّٰہُ لِنُوْرِہٖ مَنْ یَّشَاءُ (نور بالائے

نور، اللہ جس کی چاہتا ہے اپنے نور کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔

صحیح طرزِ عمل

پہلے اسی اجمالی و تقلیدی ایمان کے ساتھ عمل شروع کرنا چاہیے اور بساطِ توفیق پر قدم رکھنا چاہیے تاکہ رفتہ رفتہ پورا وجود نورانی ہو جائے اور ظلمتِ تقلید نورِ تحقیق سے بدل جائے اور ایمان کی تفصیلی صورتیں پردۂ اجمال سے جلوہ گر ہو جائیں۔

بات ضبط سے باہر نکل گئی۔ مقصود بیان یہ ہے کہ اللہ کے رسولؐ ہادی و معلم ہیں۔ انھوں نے دینِ حق کی راہ دکھائی ہے اور احکامِ دین کی تلقین فرمائی ہے۔ ان کا علم حاصل کر کے ان پر عمل کرنا چاہیے۔ تعلیماتِ رسول کے علاوہ جو کچھ ہے اگر وہی ہے جو آپؐ نے فرمایا —— یا اگر کچھ باتیں ایسی ہیں جو تعلیماتِ نبوی کی شرح کرتی اور اس کی تقویت و ترویج اور افزائشِ حسن و جمال کا باعث بنتی ہیں تو مبارک ہیں، باقی تمام باتیں لغو، بے کار اور وبال ہیں۔

(شیخ عبدالحق محدث دہلوی کے مکتوب ۳۴ کے اقتباسات)

(ستمبر ۱۹۶۴ء)

مجدد الف ثانیؒ کا مکتوب

(ایک نوجوان کے نام)

اے فرزند، دنیا آزمائش و ابتلا کی جگہ ہے، اس کے ظاہر کو طرح طرح کی ملمع کاریوں سے مزین کیا گیا ہے۔ خیالی و وہمی خال و خط اور زلف و خد سے آراستہ ہے۔ دیکھنے میں شیریں اور تروتازہ لیکن حقیقت میں یہ دنیا ایک مردار ہے۔ عطر لگایا ہوا گندگیوں کا ایک ڈھیر ہے، مکھیوں اور کیڑوں سے بھرا ہوا ایک سراب ہے، آب نما اور ایک مٹھاس ہے زہریلی، اس کا باطن ظاہر کے برعکس خراب وابتر ہے اور مزا یہ ہے کہ ان گندگیوں کے باوجود اس کا معاملہ اپنے چاہنے والوں کے ساتھ نہایت برا ہے۔ اس کا فریفتہ دیوانہ و مسحور ہے اور اس کا گرفتار، فریب خوردہ و مجنون۔ جو بھی اس کے ظاہر پہ ریجھا نقصان ابدی اس کے پلّے پڑا اور جو بھی اس کی حلاوت و طراوت پہ مائل ہوا ندامت سرمدی اس کے حصے میں آئی۔ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے۔ دنیا اور آخرت سوکنیں ہیں اگر ایک راضی ہوئی تو دوسری ناخوش۔ لہٰذا جس نے دنیا کو راضی کیا آخرت اس سے ناراض ہوئی۔ آخرت میں اس کا کوئی حصہ نہیں، اللہ ہمیں اور تمھیں دنیا اور دنیا داروں سے پناہ میں رکھے۔

اے فرزند کیا تم جانتے ہو، دنیا کیا ہے؟ جو چیز بھی تمھیں اللہ سے غافل کردے وہ دنیا ہے! زن و فرزند، مال و متاع، جاہ و ریاست، لہو و لعب اور لایعنی باتوں میں مشغولیت، یہ سب داخل دنیا ہیں، وہ علوم و فنون بھی جو آخرت

میں کام آنے والے نہیں، دنیا میں داخل ہیں، علم نجوم، منطق، ہندسہ، حساب اور اسی طرح کے دوسرے علوم کی تحصیل اگر کارگر ہوتی تو فلاسفہ اہل نجات میں ہوتے۔ حضورؐ نے فرمایا ہے کسی بندے سے اللہ تعالیٰ کے اعراض کی علامت یہ ہے کہ وہ لایعنی غیر مفید چیزوں میں مشغول ہو۔ علم نجوم کے بارے میں یہ جو کہا گیا ہے کہ وہ اوقات صلوٰۃ جاننے کے کام آتا ہے وہ اس معنی میں نہیں ہے کہ نماز کے اوقات کی معرفت علم نجوم کے بغیر نہیں ہو سکتی بلکہ اس معنی میں ہے کہ علم نجوم بھی وقت جاننے کا ایک طریقہ ہے بہتیرے لوگ ایسے ہیں جو علم نجوم کی خبر نہیں رکھتے لیکن نماز کے اوقات نجومیوں سے بہتر جانتے ہیں۔ تقریباً یہی معاملہ علم منطق و حساب اور اسی طرح کے دوسرے ان علوم کا بھی ہے جن کی کچھ ضرورت بعض علوم شرعیہ میں پڑتی ہے اگر ان علوم کو علوم شرعیہ کی تحصیل و تائید کے لیے حاصل کیا جائے تو خیر ورنہ ان کا اشتغال جائز نہیں۔ انصاف کرنا چاہیے کہ ایسے امر مباح کا ارتکاب جو ضروری امور کے فوت و ترک کو مستلزم ہو حد جواز سے نکل جائے گا یا نہیں۔ بے شک ان علوم کے اشتغال سے ضروری علوم شرعیہ میں مشغولیت باقی نہیں رہتی ہے[1]

اے فرزند! اللہ تعالیٰ نے کمال مہربانی سے تجھے ابتدا ر جوانی میں توبہ کی توفیق عنایت کی تھی۔ مجھے معلوم نہیں کہ نفس و شیطان کے قبضے سے چھٹکارا پاکر تجھے توبہ پر ثبات و قرار میسر ہوا یا نہیں۔ بظاہر تو استقامت مشکل نظر آتی ہے کیوں کہ موسم عنفوان جوانی کا ہے دنیا کے اسباب میسر ہیں اور نامناسب دوستوں، ہم نشینوں کی کثرت ہے۔ کام یہ ہے کہ فضول مباحات سے بچا جائے اور بقدر ضرورت پر اکتفا کی جائے اور مباحات کا بقدر ضرورت استعمال بھی جمعیت خاطر کی نیت سے ہونا چاہیے۔ تاکہ وظائف بندگی ادا

---

[1] یہ اس صورت میں ہوتا ہے کہ حصول دنیا کے لیے اپنی تمام توجہ اور جدوجہد کا محور انھیں علوم کو بنا لیا جائے۔ حضرت مجدد کی تحریر کا مقصد بھی یہی ہے کہ قانونِ الٰہی کا علم اصل ہے اور دوسرے تمام علوم اس کے تابع، ایسا نہ ہو کہ کوئی کتاب و سنت کے علم کو تابع کی حیثیت دیدے یا اس سے بالکل قطع نظر کرے۔ (مترجم)

کرنے میں تشویش پیدا نہ ہو۔ مثلاً کھانے کی غرض یہ ہے کہ ادائے طاعات پر قوت و قدرت نصیب ہو اور لباس کا مقصد یہ ہے کہ اس سے ستر عورت اور سردی گرمی کے دفعیہ کا کام لیا جائے۔ اسی قیاس پر تمام ضروری مباحات کو سمجھنا چاہیئے۔ اکابر نقشبندیہ قدس سرہم نے عزیمت کا عمل اختیار کیا ہے اور حتی الامکان رخصت سے اجتناب کرتے رہے ہیں۔ عزیمتوں میں ایک عزیمت یہ بھی ہے کہ بقدر ضرورت پر اکتفا کی جائے اور اگر یہ دولت میسر نہ ہو تو مباحات کے دائرے سے نکل کر مشتبہ اور حرام چیزوں کی طرف ہرگز نہ جانا چاہیئے۔ اللہ تعالیٰ نے کمال کرم سے مباحات و تنعمات کا دائرہ خود ہی بہت وسیع کر دیا ہے۔ ان تنعمات سے قطع نظر کون سا عیش اس بات کے برابر ہے کہ بندے کا مولیٰ اس کے کردار سے راضی ہو اور کون سی جفا اس بات کے برابر ہوگی کہ اس کا آقا اس کے اعمال سے ناراض ہو، جنت میں اللہ کی رضا جنت سے بہتر ہے اور دوزخ میں اللہ کی ناراضی دوزخ سے بدتر ہے۔ اللہ نے انسان کو اپنا بیٹا نہیں بنایا اور نہ اس کو پوری چھوٹ دے دی ہے کہ جو چاہے کرے۔ سوچنا چاہیئے اور اپنی عقل دور اندیش کو کام میں لانا چاہیئے، کل قیامت میں ندامت و نقصان کے سوا کچھ ہاتھ نہ آئے گا۔ کام کا وقت موسم جوانی ہے۔ جواں مرد وہ ہے جو اس وقت کو ہاتھ سے نہ جانے دے اور فرصت کو غنیمت سمجھے، یہ بالکل ممکن ہے کہ بڑھاپے تک اسے زندگی ہی نہ ملے اور اگر بفرض بڑھاپے تک پہنچ گیا تو اطمینان میسر نہ ہو اور اگر یہ بھی ہو تو ضعف اور سستی کی وجہ سے کام نہ کر سکے۔

اس وقت اسباب اطمینان میسر ہیں۔ والدین کا وجود بھی اللہ کے انعامات میں سے ہے کہ اس نوجوان کی معیشت کی فکر بھی انہیں کے سر ہے، موسم فرصت ہے اور زمانہ، قوت و استطاعت پھر کس عذر کی بنا پر آج کو کل پر ٹالا جائے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے ہلک المسوفون (یعنی ادائے طاعات میں تاخیر کرنے والے اور "عنقریب کروں گا، عنقریب کروں گا" کہنے والے ہلاک ہوئے) ہاں اگر مہمات و معاملات دنیا کو کل پر چھوڑ دیں اور آج کو اعمال آخرت میں مشغول رکھیں تو کیا کہنا۔

عنفوانِ جوانی کے اس زمانے میں کہ دشمنانِ دین۔ نفس و شیطان کا غلبہ ہے تھوڑے عمل کا بھی اتنا اعتبار ہے کہ ان کا غلبہ نہ ہونے کی صورت میں اس سے دس گونے عمل کا بھی نہیں۔ فوجی قواعد میں بھی دشمنوں کے حملہ و غلبہ کے وقت کارگزار سپاہیوں کی بڑی قدر ہے اور اس وقت ان کی تھوڑی دوڑ دھوپ اور کارگزاری بھی لائقِ اعتبار و نمایاں ہوتی ہے۔ اے فرزند انسان جو موجودات کا خلاصہ ہے اس کی تخلیق کا مقصد نہ لہو و لعب ہے اور نہ کھانا اور سونا بلکہ اس کی تخلیق کا مقصد اللہ کی بندگی، تواضع و انکسار عجز، و افتقار اور بارگاہ قدس میں ہمیشہ التجا و تضرع ہے۔ اللہ کی بندگی و عبادت سے مراد وہ عبادتیں ہیں جن کی تعلیم شریعت محمدیؐ نے دی ہے۔ ان عبادتوں کی منفعتیں اور مصلحتیں خود بندوں کو حاصل ہوتی ہیں ان سے خدا کو کوئی فائدہ نہیں پہنچتا، اس لیے اوامر کی تعمیل اور نواہی سے پرہیز جان و دل کے جذبہ احسان مندی اور کامل اطاعت و انقیاد کے ساتھ ہونا چاہیئے اور اپنی پوری سعی صرف کر دینی چاہیئے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے استغنا تام کے باوجود صرف ہمارے فائدے کے لیے ہمیں اوامر و نواہی سے سرفراز فرمایا، ہم محتاجوں کو تو اس نعمت کا شکریہ پورے طور پر ادا کرنا چاہیئے۔

اے فرزند، تم جانتے ہو، اگر دنیا کا کوئی زبردست اپنے کسی زیر دست کو کسی خدمت پر سرفراز کرتا ہے تو اس حقیقت کے باوجود کہ اس خدمت کا نفع اس حاکم کو بھی ملنے والا ہے وہ زیر دست اس کے حکم کو کس قدر عزیز رکھتا ہے وہ سمجھتا ہے کہ ایک عظیم القدر شخص نے یہ خدمت اس کے سپرد کی ہے اس لیے کامل احسان مندی کے ساتھ اس کو بجا لانا چاہیئے۔ کیا مصیبت ہے رب ذوالجلال کی عظمت اس شخص کی عظمت سے بھی کم نظر آتی ہے کہ انسان اس کے احکام کی بجا آوری میں کوشش نہیں کرتا۔ شرم کرنی چاہیئے اور اپنے کو خواب خرگوش سے بیدار کرنا چاہیئے۔

احکامِ الٰہی کا عدم امتثال دو چیز سے خالی نہیں یا شریعت کی خبروں کو جھوٹ سمجھتا ہے اور باور نہیں کرتا یا دنیا والوں کی عظمت کے مقابلے میں اللہ کی عظمت حقیر نظر آتی ہے۔ اس بات کی شناعت اور خرابی پر اچھی طرح غور کرنا چاہیئے۔

اے فرزند، ایک ایسا شخص جس کی کذب بیانی کا بارہا تجربہ ہو چکا ہے، کہتا ہے کہ دشمنوں کی مسلح فوج فلاں قوم پر شب خون مارنے والی ہے۔ یہ سنتے ہی اس قوم کے عقل مند اپنی محافظت میں لگ جاتے ہیں اور اس بلا کو دفع کرنے کی فکر کرتے ہیں، حالانکہ وہ جانتے ہیں، خبر دینے والا جھوٹ بولنے کا عادی ہے مگر ان کی دلیل یہ ہوتی ہے کہ جہاں خطرے کا وہم بھی ہو وہاں عقل مندوں پر احتراز لازم ہے لیکن مخبر صادق علیہ الصلوٰۃ والسلام نے پوری تاکید کے ساتھ عذاب اُخروی سے خبردار کیا ہے اس کے باوجود وہ کچھ بھی متاثر نہیں ہوتے اور ہوتے بھی ہیں تو اس کے دفعیہ کی فکر نہیں کرتے حالانکہ اس کے دفعیہ کی تدبیر بھی مخبر صادق ؐ سے معلوم ہو چکی ہے۔ پس یہ کیسا ایمان ہے کہ سچے کی خبر جھوٹے کی خبر کے برابر بھی اعتبار نہیں رکھتی ـــــ

صورت اسلام نجات بخش نہیں یقین حاصل کرنا چاہیئے۔ یقین کہاں ہے ظن بھی نہیں بلکہ وہم بھی نہیں ہے کیوں کہ عقلا، محل خطر میں وہم کا بھی اعتبار کرتے ہیں۔ اسی طرح اللہ نے کلام مجید میں فرمایا ہے: وَاللّٰہُ بَصِیْرٌ بِمَا تَعْمَلُوْنَ۔ (اللہ تمھارے اعمال کو دیکھ رہا ہے) اس کے بعد لوگ برے اعمال میں مشغول ہیں اگر ان کو معلوم ہو کہ کوئی حقیر شخص بھی ان کے اعمال کو دیکھ رہا ہے تو یہ ہرگز عمل شنیع اس کی نظر کے سامنے نہیں کرتے۔ ان کا حال دوامر سے خالی نہیں۔ اللہ کی خبر کو باور نہیں کرتے یا اللہ کی اطلاع کا اعتبار نہیں کرتے اس قسم کا کردار، ایمان کی علامت ہے یا کفر کی نشانی ہے؟[۱]

---

[۱] یہ پورا پیراگراف ذہن نشین کرنے کے لائق ہے خصوصیت کے ساتھ ان لوگوں کو اسے بار بار پڑھنا چاہیے جو ایمان و عمل کی متکلمانہ بحثوں میں گرفتار ہیں اور یہ گرفتاری اس حد تک بڑھ چکی ہے کہ اس وقت مسلمانوں کو ان کی بے ایمانی و نفاق پر ڈرانا اور اسلام حقیقی کی طرف بلانا، ان کے نزدیک جرم بن گیا ہے۔ اہل السنۃ والجماعۃ کا یہ مسلک ضرور ہے کہ بے عمل مسلمان کے لیے بھی خلود فی النار ؒ

اے فرزند، تم پر لازم ہے کہ از سرِ نو تجدیدِ ایمان کرو۔ نبی علیہ السلام نے فرمایا ہے ؎ جَدِّدُوا اِیمانَکُم بِقَولِ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ" نامرضیاتِ حق سے توبہ نصوح کا از سرِ نو اعادہ کرو۔ جن امور کو حرام قرار دیا گیا ہے اور ان سے نہی فرمائی گئی ہے ان سے محترز و مجتنب رہو۔ پنج وقتہ نماز باجماعت ادا کرو، اگر قیام لیل، تہجد میسر ہو تو زہے سعادت، مال کی زکوٰۃ دینا بھی ارکانِ اسلام میں سے ہے اسے ضرور ادا کرو، زکوٰۃ ادا کرنے کا سب سے زیادہ آسان طریقہ یہ ہے کہ اپنے مال میں سے جو کچھ فقراء کا حق ہے ہر سال زکوٰۃ کی نیت سے الگ محفوظ کر دے اور پورے سال اس کو مصارف زکوٰۃ میں صرف کرتا رہے اس طرح ہر مرتبہ

---

* نہیں ہے لیکن یہ بات اس پر موقوف ہے کہ خاتمہ بالخیر ہوا ہو، لیکن کیا انتہائی بے حسی اور فرائض و واجبات سے بھی جان بوجھ کر اعراض خاتمہ بالخیر کی توقع پیدا کرتا ہے ؟ اس سلسلے میں حضرت مجدد نے ایک دوسرے مکتوب میں جو کچھ تحریر فرمایا ہے وہ اللہ کا کچھ بھی خوف رکھنے والے آدمی کے دل کو کپکپا دینے کے لیے کافی ہے۔ لکھتے ہیں: "آرے مطلق اہل اسلام را بر خیریت خاتمہ از رحمت نصیب است۔ اگرچہ بعد از ازمنہ متطاولہ از عذاب دوزخ نجات یابند اما ظلمات معاصی و عدم مبالات باحکام منزلہ سماوی کے بگذارد کہ نور ایمان را بسلامت ببرد علماء فرمودہ اند کہ اصرار بر صغیرہ بہ کبیرہ می رساند و اصرار بر کبیرہ مفضی بہ کفر است عیاذاً باللہ سبحانہ (مکتوبات جلد نمبر ۱ نمبر ۹۶)" ہاں، مطلق اہل اسلام کو، خاتمہ بالخیر ہونے کی صورت میں رحمت الٰہی کا حصہ ملے گا اگرچہ وہ طویل زمانے کے بعد دوزخ سے نجات پائیں لیکن گناہوں کی تاریکیاں اور احکام الٰہی سے بے پروائی، کب چھوڑتی ہے کہ ایسے لوگ نور ایمان سلامت لے جائیں۔ علماء نے فرمایا ہے کہ گناہ صغیرہ پر اصرار گناہ کبیرہ تک پہنچاتا ہے اور گناہ کبیرہ پر اصرار کفر تک پہنچا دیتا ہے۔ اللہ ہم سب کو اس سے پناہ میں رکھے"۔ اس تنبیہ کے باوجود اگر کوئی بے عمل و بے پروا مسلمان اس خیال خام میں مبتلا ہو کہ آخرکار وہ جنت حاصل کر کے رہے گا تو اسے نادانی اور کج فہمی کے سوا اور کیا کہا جائے۔

؎ کلمہ لا الٰہ الا اللہ کے ذریعہ اپنے ایمان کی تجدید کرتے رہو

ادائے زکوٰۃ کی نیت ضروری ولازم نہ رہے گی۔ یعنی ایک ہی دفعہ زکوٰۃ کی نیت کرکے اس کو علیحدہ کرنا کافی ہوگا۔[1] یہ تو معلوم ہے کہ بہتیرے لوگ سال میں خاصی رقم مستحقوں اور فقیروں پر صرف کرتے ہیں لیکن زکوٰۃ کی نیت نہ کرنے کی وجہ سے اس کا شمار زکوٰۃ میں نہیں ہوتا۔ میں نے جو صورت ابھی بتائی اس کا دوہرا فائدہ ہے ایک تو زکوٰۃ ادا ہوگی دوسرے یہ کہ تمام سال میں ایسے مواقع میں خرچ کرنے میں کوئی زحمت پیش نہ آئے گی۔ بالفرض اگر اتنی رقم سال بھر میں فقرار پر صرف نہ ہو جب بھی اس کو الگ محفوظ رکھیں اور ہر سال یہ عمل کرتے رہیں، اگر آج اس کے صرف کی توفیق نہیں ہوتی تو ممکن ہے کل اس کی توفیق مل جائے۔ چونکہ نفس بالذات بخیل اور احکام کی تعمیل میں سرکش ہے اس لیے ضرورتاً گفتگو تنگی اور کفالت کے ساتھ کی گئی ہے ورنہ تمام مال و دولت اللہ کی ملک ہے کسی کی کیا مجال کہ اس کو صرف کرنے میں تاخیر کرے لازم تو یہ ہے کہ جذبۂ احسان مندی کے ساتھ مستحقین پر اسے خرچ کیا جائے۔ اسی طرح تمام عبادتوں میں خیال رکھو، کسی عبادت کی ادائیگی میں اپنے نفس کو ڈھیل نہ دو۔ بندوں کے حقوق ادا کرنے میں بھی سعی بلیغ کرو تاکہ کسی کا حق تمہارے ذمہ باقی نہ رہ جائے۔ یہاں دنیا میں ان کا ادا کرنا آسان ہے کل قیامت میں یہ آسانی باقی نہ رہے گی، وہاں کی جوابدہی مشکل اور ناقابلِ علاج ہے۔ احکام شرعیہ علمائے آخرت سے پوچھنے چاہئیں۔ ان کی باتوں میں تاثیر ہی دوسری ہے۔ ممکن ہے کہ ان کے کلام کی برکت توفیق عمل دے دے۔ علمارِ دنیا سے۔ جنھوں نے علم کو مال اور جاہ و مرتبہ کے حصول کا ذریعہ و وسیلہ بنا لیا ہے، دور رہنا چاہیے۔ ہاں جہاں متقی علماء موجود نہ ہوں وہاں بقدرِ ضرورت ان سے مسئلہ

---

[1] تمام فرائض کی طرح زکوٰۃ کی ادائیگی کا بھی اصل طریقہ یہی ہے کہ اس کو اجتماعی طور پر ادا کیا جائے لیکن جہاں کہیں اجتماعی نظم موجود نہ ہو وہاں انفرادی طور پر ادا کرتے سے بھی زکوٰۃ ادا ہو جاتی ہے۔ (مترجم)

دریافت کر سکتے ہو۔

اے فرزند، یہ مسئلے اور نصیحتیں تمھیں پہلے سے معلوم ہوں گی لیکن مقصود عمل ہے نہ کہ صرف علم۔ جو بیمار اپنے مرض کی دوا جانتا ہے وہ جب تک اسے استعمال نہ کرے صحت یاب نہیں ہو سکتا۔

یہ مبالغہ و تاکید بھی عمل ہی کے لیے ہے ورنہ علم بے عمل کے بارے میں تو یہ حدیث آئی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "قیامت میں سخت ترین عذاب اس عالم پر ہوگا جس نے علم کے مطابق عمل نہیں کیا۔"

(مکتوبات امام ربانی جلد نمبر ۱ ۳۳)

(جولائی، اگست ۱۹۵۵ء)

حضرت مجددؒ کا مکتوب

(ایک خاتون کے نام)

یٰٓاَیُّھَا النَّبِیُّ اِذَا جَآءَکَ الْمُؤْمِنٰتُ یُبَایِعْنَکَ عَلٰٓی اَنْ لَّا یُشْرِکْنَ بِاللّٰہِ شَیْئًا وَّلَا یَسْرِقْنَ وَلَا یَزْنِیْنَ وَلَا یَقْتُلْنَ اَوْلَادَھُنَّ وَلَا یَاْتِیْنَ بِبُھْتَانٍ یَّفْتَرِیْنَہٗ بَیْنَ اَیْدِیْھِنَّ وَاَرْجُلِھِنَّ وَلَا یَعْصِیْنَکَ فِیْ مَعْرُوْفٍ فَبَایِعْھُنَّ وَاسْتَغْفِرْ لَھُنَّ اللّٰہَ ط اِنَّ اللّٰہَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ۝ (الممتحنہ: ۲)

اے نبی جب تمھارے پاس مسلمان عورتیں اس بات پر بیعت کرنے کو آئیں کہ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں اور چوری نہ کریں اور زنا نہ کریں اور اپنی اولاد کو قتل نہ کریں اور بہتان نہ باندھیں، اپنے ہاتھوں اور پاؤں کے درمیان اور کسی بھلے کام میں تیری نافرمانی نہ کریں تو ان کو بیعت کر اور ان کے لیے اللہ سے مغفرت طلب کر۔ بے شک اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔

یہ آیت کریمہ فتح مکہ کے دن نازل ہوئی ہے۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب مردوں کی بیعت سے فارغ ہوئے تو عورتوں کی بیعت لینی شروع کی۔ آپ عورتوں سے بیعت صرف الفاظ میں لیتے تھے، دست مبارک عورتوں کے ہاتھ سے کبھی مَس نہ ہوا۔ عورتوں میں چونکہ بُرے اخلاق مردوں کی بہ نسبت زیادہ پائے جاتے ہیں اس لیے اُن کی بیعت میں خصوصیت کے ساتھ چند شرطیں بڑھائی گئی ہیں۔ آپ نے امر الٰہی کی تعمیل میں عورتوں کی بیعت کے وقت ان چیزوں سے منع فرمایا ہے۔[1]

---

[1] اگرچہ یہ آیت عورتوں کی بیعت کے سلسلہ میں نازل ہوئی ہے لیکن نبی کریمؐ نے صحابہ کرامؓ سے بھی ان شرائط پر بیعت لی۔ (مترجم)

پہلی شرط : کسی چیز کو اللہ تعالیٰ کے ساتھ شریک نہ کریں ۔ عام ازیں کہ یہ شرک وجود میں ہو یا استحقاق عبادت میں ۔ اگر کسی کے اعمال ریا و سمعہ سے پاک نہ ہوں اور وہ غیر اللہ سے اپنے اعمالِ خیر کے اجر کی طلب میں مبتلا ہو، مثلاً وہ اپنے نیک عمل پر دوسروں سے مدح و ثنا کا طلب گار ہو تو ایسا شخص دائرہ شرک سے باہر نہ ہوگا اور نہ ایسا شخص مخلص و موحد ہوگا ۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے :

اَلشِّرْكُ فِیْ اُمَّتِیْ اَخْفٰی مِنْ دَبِیْبِ النَّمْلِ الَّتِیْ تَدُبُّ فِی لَیْلَۃٍ مُظْلِمَۃٍ عَلٰی صَخْرَۃٍ سَوْدَاءَ

شرک میری امت میں اس چیونٹی کی چال سے بھی زیادہ مخفی ہے جو اندھیری رات میں سیاہ پتھر پر چلتی ہے ۔

ایک فارسی شاعر نے اس حدیث کا یہ ترجمہ کیا ہے :

لاف بے شرکی مزن کاں از نشان پائے مور در شب تاریک بر سنگ سیہ پنہاں تر است

حضورؐ نے یہ بھی فرمایا ہے :

وَاتَّقُوْا الشِّرْكَ الْاَصْغَرَ قَالُوْا وَمَا الْاَصْغَرُ قَالَ عَلَیْہِ وَعَلٰی اٰلِہِ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ اَلرِّیَاءُ

اور شرکِ اصغر سے بچو، صحابہؓ نے پوچھا شرک اصغر کیا ہے حضورؐ نے ارشاد فرمایا وہ ریاء ہے ۔

توحید یہ ہے کہ شائبہ شرک سے بھی بیزاری ہو، بیماریوں کو دفع کرنے میں بتوں اور شیطانوں سے مدد طلب کرنا جیسا کہ اس وقت اسلام کے پردے میں رائج ہو گیا ہے عین شرک و گمراہی ہے اور تراشیدہ و ناتراشیدہ پتھروں سے اپنے حوائج و ضروریات مانگنا اللہ سے انکار اور کفر ہے ۔ اللہ تعالیٰ نے بعض گمراہوں کا حال بیان فرمایا ہے ۔

اَلَمْ تَرَ اِلَی الَّذِیْنَ یَزْعُمُوْنَ اَنَّھُمْ اٰمَنُوْا بِمَآ اُنْزِلَ اِلَیْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ یُرِیْدُوْنَ اَنْ یَّتَحَاکَمُوْٓا

اے نبی تم نے دیکھا نہیں ان لوگوں کو جو دعویٰ تو کرتے ہیں کہ ہم ایمان لائے اس کتاب پر جو تمہاری طرف نازل کی گئی ہے اور ان کتابوں پر جو تم سے پہلے نازل

اِلَى الطَّاغُوْتِ وَقَدْ اُمِرُوْٓا اَنْ يَّكْفُرُوْا بِهٖ وَيُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ اَنْ يُّضِلَّهُمْ ضَلٰلًاۢ بَعِيْدًا ○ (سورہ نسار ر ۹)

کی گئی تھیں مگر چاہتے یہ ہیں کہ اپنے معاملات کا فیصلہ کرانے کے لیے طاغوت کی طرف رجوع کریں حالانکہ انھیں طاغوت سے کفر کرنے کا حکم دیا گیا تھا۔ شیطان انہیں بھٹکا کر راہ راست سے بہت دور لے جانا چاہتا ہے۔

اکثر عورتیں انتہائی جہل و نادانی کی وجہ سے اس طرح کے حرام اعمال میں مبتلا ہیں اور مراسم شرک و اہلِ شرک کے ادا کرنے میں گرفتار ہیں۔ خصوصیت کے ساتھ یہ بات اس وقت دیکھی جاتی ہے جب چیچک کی بیماری پیدا ہوتی ہے، اس وقت کم ایسی عورتیں ہوں گی جو اس شرک سے محفوظ رہتی ہوں گی اور اس مرض کو دور کرنے کے لیے رسوم شرک میں سے کوئی رسم نہ ادا کرتی ہوں گی اِلّا ماشاء اللہ۔ کفار و مشرکین جن ایام کی تعظیم کرتے ہیں اور وہ جو مراسم ادا کرتے ہیں انھیں ادا کرنا شرک و کفر تک پہنچا دیتا ہے۔ جیسا کہ دیوالی کے دنوں میں جاہل مسلمان خصوصًا ان کی عورتیں اہل کفر کی رسمیں ادا کرتی ہیں اور اس دن کو عید کے دن کی طرح مناتی ہیں جس طرح اہل کفر اس دن اپنی بیٹیوں اور بہنوں کو تحفے اور ہدیے بھیجتے ہیں اسی طرح وہ بھی بھیجتی ہیں، ان دنوں میں اپنے برتنوں کو کفّار کی طرح رنگتی ہیں اور اس میں سُرخ چاول بھر کر تحفۃً بھیجتی ہیں یعنی ان دنوں کو وہ بھی ویسا ہی سمجھتی ہیں جیسا کفار سمجھتے ہیں۔ یہ سب شرک و کفر ہے۔ اسی طرح کے اسلام کے متعلق اللہ نے کہا ہے: وَمَا يُؤْمِنُ اَكْثَرُهُمْ بِاللّٰهِ اِلَّا وَهُمْ مُّشْرِكُوْنَ۔

ایک عملِ حرام یہ بھی رائج ہے کہ جانوروں کو مشائخ کے نام پر نذر کرتے اور ان کی قبروں پر جا کر ان کو ذبح کرتے ہیں۔ فقہ کی کتابوں میں اس عمل کو بھی شرک میں داخل کیا ہے اور پوری تاکید سے کیا ہے فقہا نے اس ذبیحہ کو ذبائحِ جن کی جنس سے سمجھا ہے (ذبائحِ جن وہ جانور ہیں جنھیں مشرکین جنوں کے نام پر ذبح کرتے تھے) اس لیے اس عمل سے بھی اجتناب کرنا

چاہیے کہ اس میں شرک کا شائبہ ہے۔ نذر کے طریقے بہت ہیں، کیا ضروری ہے کہ کسی جانور کو ذبح کرنے کی نذر مانیں، اس کو ذبائح جن کے ساتھ ملحق کریں اور اپنے کو عبدۃ الجن (جنوں کے پجاری) کے ساتھ مشابہ کریں۔ یہی حال عورتوں کے ان روزوں کا بھی ہے جو وہ پیروں اور بیبیوں کے نام پر رکھتی ہیں۔ اکثر ان ناموں کو خود انھوں نے تراشا ہے اور انہیں ناموں پر اپنے روزوں کی نیت کرتی ہیں اور افطار کے وقت پر روزہ کے لیے خاص وضع متعین کرتی ہیں اور ان کے لیے مخصوص ایام کا تعین بھی کرتی ہیں۔ اپنے مطالب و مقاصد کو ان روزوں کے ساتھ جوڑتی ہیں اور ان کے توسل سے مقصد برآری چاہتی ہیں۔ یہ عبادت میں شرک ہے۔ اس طرح وہ غیر اللہ کی عبادت کے توسل سے اپنا مقصد حاصل کرنا چاہتی ہیں۔ اس فعل کی قباحت پر اچھی طرح سوچنا چاہیے حالانکہ حدیث قدسی میں آیا ہے "اَلصَّوْمُ لِیْ وَاَنَا اَجْزِیْ بِہٖ" یعنی روزہ میرے لیے مخصوص ہے اور میرے سوا کسی کی عبادتِ صوم میں شرکت نہیں۔ ہر چند کہ کسی عبادت میں بھی غیر اللہ کی شرکت جائز نہیں لیکن روزہ کی تخصیص محض اس اہتمام کے لیے ہے کہ اس عبادت میں نفیِ غیر کی نیت بہ تاکید کرنی چاہیے۔

بعض عورتیں اپنے ایجاد کیے ہوئے روزوں کے حیلے میں یہ کہتی ہیں کہ ہم روزہ اللہ ہی کے لیے رکھتے ہیں صرف اس کا ثواب پیروں کی روحوں کو بخشتی ہیں۔ اگر وہ اپنے اس معاملے میں سچی ہیں تو پھر روزوں کے لیے مخصوص ایام کی تعیین کا کیا کام ہے اور پھر افطار میں مخصوص کھانوں اور مخصوص وضع و ہیئت کا التزام کیوں ہے۔ بسا اوقات دیکھا جاتا ہے کہ افطار کے وقت حرام چیزوں کا ارتکاب کرتی ہیں۔ بے ضرورت بھیک مانگتی ہیں اور اسی بھیک مانگی ہوئی چیز سے افطار کرتی ہیں اور اپنے مقصد کے حصول کو اسی امرِ حرام کے ارتکاب کے ساتھ موقوف سمجھتی ہیں۔ حقیقت میں یہ عین گمراہی اور شیطان کا فریب ہے۔

دوسری شرط: عورتوں کی بیعت کے وقت دوسری شرط یہ لگائی گئی ہے کہ وہ چوری نہ کریں۔ اس گناہ کبیرہ میں چونکہ اکثر عورتیں مبتلا ہوتی ہیں اس لیے مخصوص طور پر ان کو روکا گیا ہے۔ کم ایسی عورتیں ہوں گی جو اس برائی سے بالکل

بچی ہوئی ہوں گی۔ جو عورتیں اپنے شوہروں کے اموال میں ان کی اجازت کے بغیر صرف کرتی ہیں بے تحاشا خرچ کر کے مال کو ضائع کرتی ہیں وہ چوروں کے گروہ میں داخل ہیں اور یہ گناہ ان کے اندر ثابت و متحقق ہے۔ یہ بات عام طور پر عورتوں میں پائی جاتی ہے اور اس خیانت میں تقریباً تمام عورتیں مبتلا ہیں۔ کاش وہ اس بات کو برائی سمجھیں۔ اگرچہ حال یہ ہے کہ وہ اپنے اس تصرف بے جا کو حلال سمجھتی ہیں اور یہ نہایت خطرناک بات ہے کیوں کہ کسی ثابت شدہ برائی کو حلال سمجھنا کفر تک پہنچا دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حکیم مطلق جلّ شانہٗ نے شرک کے بعد عورتوں کو چوری سے منع فرمایا۔ اپنے شوہروں کے اموال میں بے جا تصرف کرتے کرتے ان میں خیانت اور چوری جڑ پکڑ جاتی ہے اور پھر دوسروں کے اموال میں بھی چوری اور خیانت کرنے لگتی ہیں، دوسروں کے اموال کو بلا اجازت حاصل کرنے کی برائی ان کے ذہن سے نکل جاتی ہے اور چوری ان کی عادت میں داخل ہو جاتی ہے۔ ان تمام باتوں کے مشاہدے کے بعد یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ عورتوں کے لیے شرک کے بعد چوری کو کیوں اہمیت دی گئی۔

(تنبیہ) اموال میں سرقہ و خیانت کے سلسلے میں یہاں ایک اور قسم کی چوری کا ذکر بھی مناسب ہے۔ ایک دن ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اصحاب سے پوچھا کہ بدترین قسم کا چور کون ہے؟ صحابہ نے عرض کیا، ہم نہیں جانتے ہیں۔ آپؐ نے فرمایا۔ بدترین قسم کا چور وہ ہے جو اپنی نماز میں چوری کرتا ہے اور ارکان نماز کو تمام و کمال ادا نہیں کرتا اس لیے اس قسم کی چوری سے بھی بچنا ضروری ہے تاکہ انسان بدترین قسم کے چوروں میں داخل نہ ہو۔ حضور قلب کے ساتھ نماز کی نیت کرنی چاہیئے۔ کیوں کہ نیت کے بغیر عمل صحیح نہیں ہوتا۔ پھر قرأت درست طریقے پر کرنی چاہیئے۔ رکوع و سجود اطمینان کے ساتھ کرنا چاہیئے۔ اسی طرح قومہ (رکوع کے بعد کا قیام) اور جلسہ (دونوں سجدوں کے درمیان کی نشست) بھی اطمینان سے بجا لانا چاہیئے۔ یعنی رکوع سے اٹھنے کے بعد سیدھا کھڑا ہونا چاہیئے اور اتنی دیر تک کھڑا رہنا چاہیئے جس میں ایک بار سبحان اللہ کہا جا سکے تب سجدے میں جانا چاہیئے۔ اسی طرح دو سجدوں کے درمیان اطمینان سے

بیٹھنا چاہیے۔ جو شخص ایسا نہیں کرتا ہے وہ اپنے کو چوروں کے گروہ میں داخل کرتا ہے۔

تیسری شرط: عورتوں کی بیعت کے لیے تیسری شرط یہ لگائی گئی ہے کہ وہ زنا نہ کریں۔ عورتوں کی بیعت میں خصوصیت کے ساتھ اس کبیرہ گناہ سے ممانعت کی وجہ بھی یہی ہے کہ اکثر اوقات زنا عورت کی رضا پر موقوف ہوتا ہے نیز یہ کہ اکثر اس عمل بد کی علت یہ ہوتی ہے کہ عورتیں اپنے آپ کو مردوں کے سامنے پیش کرتی ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ قرآن میں زانیہ عورت کو زانی مرد پر ذیل کی آیت میں مقدم رکھا گیا ہے۔

اَلزَّانِیَۃُ وَالزَّانِیْ فَاجْلِدُوْا کُلَّ وَاحِدٍ مِّنْھُمَا مِائَۃَ جَلْدَۃٍ (زنا کرنے والی عورت اور زنا کرنے والے مرد میں سے ہر ایک کو سو کوڑے مارو) یہ گناہ دنیا و آخرت میں انسان کو برباد کرنے والا اور تمام ادیان میں قبیح اور منکر ہے۔ ابو حذیفہ رضی اللہ عنہ نے آں حضرت علیہ وعلیٰ آلہ الصلوٰۃ والسّلام سے روایت کی ہے۔ آپ نے فرمایا۔ اے لوگو! زنا سے بچو کہ اس میں چھ برائیاں ہیں۔ تین دنیا میں اور تین آخرت میں۔ دنیا کی تین برائیاں یہ ہیں:۔ (۱) زانی کے دل سے نورانیت اور اس کے چہرے سے رونق غائب ہو جاتی ہے۔ (۲) اس سے فقر و افلاس آتا ہے۔ (۳) عمر میں کمی ہوتی ہے۔ آخرت میں اس کی برائیاں یہ ہوتی ہیں:۔ (۱) اللہ کا غضب (۲) حساب کی سختی۔ (۳) دوزخ کا عذاب۔

حدیث میں یہ بھی آیا ہے کہ آنکھوں کا زنا محرمات (حرام عورتوں) کو بری نظر سے دیکھنا ہاتھوں کا زنا محرمات کو بری نیت سے پکڑنا اور قدموں کا زنا محرمات کی طرف بری نیت سے جانا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:۔

قُلْ لِّلْمُؤْمِنِیْنَ یَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِھِمْ وَیَحْفَظُوْا فُرُوْجَھُمْ ذٰلِكَ اَزْکٰی لَھُمْ اِنَّ اللّٰہَ خَبِیْرٌ بِمَا یَصْنَعُوْنَ ○ وَقُلْ لِّلْمُؤْمِنٰتِ یَغْضُضْنَ مِنْ اَبْصَارِھِنَّ وَیَحْفَظْنَ فُرُوْجَھُنَّ۔

کہو! اے محمد مسلمانوں سے کہ اپنی نظریں نیچی رکھیں اور اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کریں۔ یہ ان کے لیے زیادہ صفائی کی بات ہے۔ بیشک اللہ تعالیٰ کو سب خبر ہے جو کچھ لوگ کیا کرتے ہیں۔ اور کہو مسلمان عورتوں سے کہ اپنی نگاہیں نیچی رکھیں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں۔

جاننا چاہیے کہ دل آنکھوں کا تابع ہے جب تک محرمات سے آنکھوں کو نہ بچایا جائے دل کی حفاظت مشکل ہے اور جب دل گرفتار ہو جائے تو شرمگاہ کی حفاظت بہت مشکل ہے لہٰذا آنکھوں کو بدنظری سے بچانا ضروری ہے تاکہ شرمگاہ کی حفاظت ہو سکے اور انسان دنیا و آخرت کے گھاٹے سے محفوظ رہے۔ قرآن میں اس کی بھی ممانعت آئی ہے کہ عورتیں اجنبی مردوں سے نرم و نازک گفتگو کریں کیونکہ اس سے بدکار مردوں کے دل میں وسوسۂ زنا پیدا ہوتا ہے۔ اگر عورتوں کو اجنبی مردوں سے بہ ضرورت گفتگو کرنی پڑے تو اس انداز سے بولنا چاہیئے کہ اس کے دل میں اس قسم کا کوئی وسوسہ پیدا نہ ہو سکے۔ قرآن میں اس سے بھی روکا گیا ہے کہ عورتیں اپنی زینت کا اظہار غیر مردوں کے سامنے کریں اور ان کے دل میں خواہش پیدا کریں۔ اسی طرح عورتوں کو پازیب و خلخال پہن کر زمین پر اس طرح پاؤں مارنے سے بھی روکا گیا ہے کہ اس کی آواز پیدا ہو۔ کیوں کہ اس سے بھی ان کی طرف میلان پیدا ہوتا ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ ہر وہ بات جو فسق اور گناہ کی طرف لیجانے والی ہو، قبیح اور ممنوع ہے۔ احتیاط کرنی چاہیئے کہ حرام چیزوں کے مقدمات اور مبادی سے بھی پرہیز کیا جائے یعنی ایسی چیزوں سے بھی بچا جائے جو کسی حرام کا ذریعہ بنتی ہوں تاکہ خود ان چیزوں سے بچاؤ آسان ہو۔

یہ بات بھی پوشیدہ نہ رہنی چاہیئے کہ ایک عورت کے لیے دوسری اجنبی عورت بھی شہوت سے اس کو دیکھنے اور چھونے میں اجنبی مرد کے حکم میں داخل ہے۔ جائز نہیں ہے کہ عورت اپنے آپ کو شوہر کے علاوہ کسی اور کے لیے آراستہ و مزین کرے۔ نیز یہ کہ جس طرح مردوں کے لیے مردوں کو شہوت سے دیکھنا اور امردوں کو شہوت سے دیکھنا حرام ہے اسی طرح عورتوں کے لیے عورتوں کو شہوت سے دیکھنا یا چھونا حرام ہے۔ اس بات کی بڑی نگہداشت کرنی چاہیئے۔ کیوں کہ عورت کا مرد تک پہنچنا اختلافِ صنف کی وجہ سے مشکل ہے۔ بہت سے موانع درمیان میں ہوتے ہیں لیکن عورت کا عورت تک پہنچنا اتحادِ صنف کی وجہ سے نہایت آسان ہے اس لیے یہاں زیادہ احتیاط کی ضرورت ہے اور اس قبیح فعل سے بچانے کے لیے بڑی تاکید و تبلیغ کرنی چاہیئے۔

چوتھی شرط: عورتوں کی بیعت میں چوتھی شرط یہ ہے کہ وہ اپنی اولاد کو قتل

نہ کریں۔ فقر و احتیاج سے ڈر کر بچوں کو مار ڈالنا نہ صرف یہ کہ قتل ناحق ہے بلکہ قطع رحم کے گناہ کو بھی متضمن ہے اس لیے ایک کبیرہ میں دو کبائر کا ارتکاب ہے۔

پانچویں شرط: عورتوں کی بیعت کے وقت پانچویں شرط یہ لگائی گئی ہے کہ وہ افترار اور بہتان نہ باندھیں، یہ وصف بھی عورتوں میں بہت پایا جاتا ہے اس لیے خصوصیت سے منع کیا گیا۔ یہ وصف بہت بری صفتوں میں سے ایک ہے۔ یہ جھوٹ ہے اور جھوٹ تمام دین و مذہب میں حرام، قبیح اور بری چیز ہے۔ اس میں مومن کو ایذار پہنچانا بھی ہے اور مسلمان کو اذیت پہنچانا حرام ہے۔ نیز اس میں فساد فی الارض (زمین میں فساد مچانا) بھی ہے جو قرآن کی نص کے اعتبار سے ممنوع اور قبیح ہے۔

آخر میں چھٹی اور جامع شرط یہ لگائی گئی ہے کہ وہ معروف میں پیغمبر کی نافرمانی نہ کریں یہ شرط تمام اوامر شرعیہ کے امتثال اور تمام نواہی شرعیہ سے اجتناب پر مشتمل ہے۔

نماز پنج گانہ بے کسل و فتور پوری خوش دلی اور کوشش کے ساتھ ادا کرنی چاہیے۔ مال کی زکوٰۃ مصارفِ زکوٰۃ میں بہ رغبت تمام صرف کرنی چاہیے۔ رمضان کا روزہ، جو سال بھر کے چھوٹے گناہوں کا کفارہ ہے، پوری احتیاط سے رکھنا چاہیے۔ حجِ بیت اللہ جس کی شان میں حضورؐ نے فرمایا ہے کہ "حج گزشتہ گناہوں کو ختم کر دیتا ہے۔" ادا کرنا چاہیے۔ اسی طرح ورع و تقویٰ سے بھی چارہ نہیں ہے۔ اعتقاد میں بھی اور عمل میں بھی۔

دسمبر ۱۹۶۰ء

خواجہ محمد معصوم کے چند مختصر خطوط

ان خطوط میں پہلا خط خصوصیت کے ساتھ اس لائق ہے کہ بار بار اسے پڑھا جائے، خواب، کشف، بشارتیں، یہ تین چیزیں ایسی ہیں کہ ان کی حقیقت اور صحیح حیثیت نہ جاننے کی وجہ سے بڑی خرابیاں پیدا ہوئی ہیں، انھوں نے نہ صرف یہ کہ علم تصوف کو متاثر کیا ہے بلکہ صوفیائے کرام کے بہت سارے افعال و اعمال کے لیے یہ چیزیں سند اور حجت بن گئی ہیں، تمام علمائے امت اور اہل علم و اہل حق صوفیہ و مشائخ کا متفقہ فیصلہ ہے کہ غیر نبی کے خواب، کشف اور بشارتوں سے کوئی شرعی حکم ثابت نہیں ہو سکتا لیکن حیرت ہے کہ اس متفقہ فیصلے کے باوجود خوابوں، بشارتوں اور اولیاء کے کشف کو بطور سند پیش کیا جاتا ہے اور آج بھی ہزاروں افراد ایسے موجود ہیں جو کسی ولی کے خواب، کشف اور بشارت کو شرعی حجت سے کم درجہ نہیں دیتے۔ خواجہ محمد معصوم رحمۃ اللہ علیہ نے ان کی حقیقت بتا کر یہ بھی واضح کر دیا ہے کہ سیر و سلوک کا اصل مقصد کیا ہے۔ (مؤلف)

لائق اعتماد صرف کتاب و سنّت ہے

میرے مخدوم! کشف، خواب، بشارتیں صحیح بھی ہوتی ہیں، غلط بھی ہوتی ہیں اور چونکہ صحیح و غلط کے درمیان تفرقہ دشوار ہے اس لیے ان پر اعتماد نہ کرنا چاہیے۔ کیوں کہ کمال ان چیزوں کے ساتھ متعلق و مربوط نہیں ہے، لائق اعتماد اور نجات دہندہ صرف کتاب و سنت ہے اس لیے اپنی ساری ہمت اسی چیز پر صرف کرنی چاہیے کہ

مقتضائے کتاب وسنت کے مطابق عمل میسّر ہو، ذکر ماموراتِ شرعیہ میں داخل ہے اس لیے دوامِ ذکر کو ہاتھ سے جانے نہ دیں اور اپنے تمام اوقات اس میں مستغرق رکھیں، اللہ والوں کے یہاں کمال، اللہ تعالیٰ کی معرفت اور اس میں فنا ہو جانا ہے۔ فنا سے مقصود یہ ہے کہ ماسوی اللہ کی گرفتاری سے عام ازیں کہ وہ آفاقی ہو یا انفسی چھٹکارا حاصل کیا جائے، ایمان میں روشنی پیدا کی جائے، کامل طور پر احکامِ شرعیہ کی اطاعت کی جائے، امتثالِ اوامر اور اجتنابِ نواہی میں آسانی وسہولت میسّر ہو، حصولِ اخلاص کے لیے عجب وریا کو دفع کر دیا جائے، نفسِ امارہ کو — جو بالذات احکامِ الٰہی کا دشمن ہے مطمئن کر لیا جائے اور اسلامِ حقیقی کا درجہ حاصل ہو، خلاصۂ کلام یہ ہے کہ سیر وسلوک اور فنا وبقا کا اصل مقصود، تحصیلِ بندگی ہے تاکہ احکام ولوازمِ احکام کو بقدرِ امکان اس طرح ادا کیا جائے جس طرح ادا کرنا چاہیے۔ سیر وسلوک اور فنا وبقا کا ہرگز یہ مقصد نہیں ہے کہ بندہ حلقۂ بندگی سے، باہر نکال کر دعوائے خواجگی وخود مختاری کرنے لگے اور نہ غیبی صور وانوار کا مشاہدہ وتماشا اس کی غرض ہے۔ محسوس صور وانوار ہی کیا کم ہیں کہ کوئی اسے چھوڑ کر غیبی صور وانوار کی ہوس کرے، آخر دونوں ہی مخلوق ہیں اور داغِ حدوث سے داغدار۔ رویت ومشاہدۂ حق کا تعلق آخرت سے ہے جیسا کہ علمائے کرام وصوفیۂ عظام کا اس پر اجماع ہے۔ دنیاوی زندگی میں جو کچھ ہمارے لیے ضروری ہے وہ حصول الیقان ہے۔ لہٰذا دنیا میں صوفیۂ عظام کے طریقہ کا نتیجہ احکامِ شرعیہ کا اکمال اور ان کی تعمیل ہے۔ مشاہدہ وقرب وہ نتیجہ ہے جس کا تعلق آخرت سے ہے۔ آپ کو چاہیے کہ کمرِ ہمت احکامِ شرعیہ کی تعمیل کے لیے چست باندھیے اور امر بالمعروف ونہی عن المنکر کو اپنا شیوہ بنائیے۔ نیز متروک سنتوں کے احیاء کو بھی اہم امور میں شمار کیجیے، خواب اور واقعہ (واقعہ تصوف کی ایک اصطلاح ہے) پر اعتماد نہ کیجیے اگر کوئی شخص خواب میں بادشاہ یا قطبِ وقت ہو جائے تو اس سے کیا ہوتا ہے بلند ہمت لوگ اس قسم کی باتوں پر توجہ نہیں کرتے۔ وہ اللہ تعالیٰ کی مرضیات پوری کرنے میں لگے رہتے ہیں۔ والسلام

(مکتوب ۱۷۲)

علوم شرعیہ کی تحصیل اور احیائے سنّت

برادرم! چونکہ اب آخری زمانہ ہے، دین کمزور ہوگیا ہے۔ سنت متروک اور بدعت رائج ہوگئی ہے اس لیے علوم شرعیہ کی تحصیل و نشر و اشاعت اس عہد تاریک کا اہم ترین کام اور سنتِ محمدیہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کا احیاء عظیم ترین مقصد ہے، کر ہمت علوم شرعیہ کی تحصیل و اشاعت اور سنت محمدی کے احیار کے لیے چست باندھ لو، دوسری بات یہ کہ احوال و مواجید کی کچھ فکر نہ کرو، کیوں کہ اس کا کمال آخرت سے تعلق رکھتا ہے، یاد رکھو وہ امور جن سے وقت کے صوفی خوش ہیں یا تو سراب کی حیثیت رکھتے ہیں یا ان کی تسلی کے لیے ہزار میں سے ایک ظاہر کیے گئے ہیں۔ کسی نے کیا خوب کہا ہے کہ احوال و مواجید وہ خیالات ہیں جن سے اطفالِ طریقت کی تربیت کی جاتی ہے، یہ دنیا عمل کا گھر ہے، مردانہ وار ادائے طاعات میں مشغول ہو۔

(مکتوب ۱۸۱) -

قرب قیامت کا وقت ہے، دنیا تاریکیوں کے بھنور میں غوطے لگا رہی ہے، ایک ایسے جوان مرد کی ضرورت ہے جو اس زمانے میں سنت کو زندہ اور بدعت کو ختم کرے۔ انوارِ سنن نبوی کے بغیر راہ پانا محال اور اطوار نبوت کے التزام کے بغیر تلاش نجات محض خیال ہے، اتباع سنت کے بغیر نہ تو طریق صوفیہ میں سلوک ہی درست ہے اور نہ محبت ذاتی تک وصول ہی ممکن ہے آیہ کریمہ، قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِیْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ اس پر شاہد عدل ہے۔ بنا بریں اپنی سعادت اس میں سمجھئے کہ عادات عبادات، معاملات ہر شے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے مناسبت حاصل ہو، کمالات صوری و معنوی حضورؐ ہی کی محبت سے متعلق و مربوط ہیں، ہر عمل اسوۂ نبویؐ کی ترازو میں تل کر ہی باوزن ہوتا ہے۔ مکتوب ۲۲

جہنم سے نجات، جنت میں داخلہ۔ اللہ کی رضا، یہ ساری چیزیں پیروئ رسول

کے ساتھ مشروط ہیں۔ جوانان سعادت اور طالبان ہوشمند پر لازم ہے کہ ظاہراً و باطناً اتباع نبوی میں کوشاں ہوں اور جو کچھ اس کے منافی ہو اس سے اپنی آنکھیں بند کرلیں یقین رکھیں کہ اگر کسی شخص کے پاس ہزاروں ہزار فضائل و خوارق ہوں لیکن وہ اتباع سنت میں سست و بے پروا ہو تو اس کی صحبت و محبت سمّ قاتل ہے اور اگر کسی شخص کے پاس ان فضائل و خوارق میں سے کچھ نہ ہو لیکن اتباع سنت پر اس کا قدم جما ہوا ہو تو اس کی صحبت و محبت تریاق کا حکم رکھتی ہے۔ ؎

محال ست سعدی کہ راہِ صفا
تواں رفت جز در پئے مصطفا

(مکتوب ۲۰۱)

فروری ۱۹۵۶ء

باب چہارم

غیر اسلامی تصوّف

غیر اسلامی تصوّف[1]

تمہید

ایک طرف مختلف فلسفہ ہائے حیات رکھنے والے ممالک اور قومیں دائرۂ اسلام میں داخل ہوئیں اور دوسری طرف یونانی فلسفہ عربی میں منتقل ہوا اور اسلامی مملکت کی حدود میں پھیلا۔ اس نے اسلامی عقائد میں نئے مباحث کا دروازہ کھول دیا۔ ان مباحث کا مرکزی نقطہ اللہ تعالیٰ کی ذات اور اس کی صفات تھیں۔ اس فلسفہ کا سب سے مہلک اثر یہ پڑا کہ عقائد کے اثبات کے لیے بھی صرف انسانی عقل کو محور بنا لیا گیا۔ شرعی دلائل کی اہمیت کم ہوگئی اور ہر چیز عقل انسانی کی ترازو میں تولی جانے لگی خواہ وہ عقل کے محدود دائرے میں آتی ہو یا نہ آتی ہو۔ جو چیزیں انسانی حواس و ادراک سے ماوراء ہیں۔ ان کے بارے میں بھی عقلی تیر تکّے چلائے جانے لگے۔ اس کے نتیجے میں قیاسات اور ظن و تخمین کا ایک بازار گرم ہوگیا۔ عقائد کی دنیا میں شکوک و

---

[1] مولانا مرحوم "اسلامی تصوف" کی اشاعت کے بعد "غیر اسلامی تصوف" کے نام سے بھی ایک کتاب تصنیف کرنا چاہتے تھے تاکہ کتب تصوف میں جو غلط، قابل اعتراض اور غیر اسلامی چیزیں شامل ہوگئی ہیں ان کی نشان دہی ہوسکے۔ مولانا نے اس کا مقدمہ بھی تحریر کر لیا تھا جو ماہنامہ زندگی نومبر دسمبر ۱۹۶۰ء اور جنوری ۱۹۶۱ء کی تین قسطوں میں شائع ہوا تھا۔ لیکن اپنی گوناگوں مصروفیات کے سبب مولانا مرحوم یہ کتاب نہ لکھ سکے یہ مقدمہ اپنے موضوع پر خود ایک مستقل چیز ہے۔ اس لیے اس کی افادیت کے پیش نظر اسے ہم اس مجموعہ میں شامل کر رہے ہیں۔ (مرتب)

شبہات کی آندھیاں چلنے لگیں اور الحاد نے پر پرزے نکالے، فلسفہ یونان اور اس کے اثر سے پیدا شدہ الحاد کا مقابلہ کرنے کے لیے علماءِ اسلام نے علم کلام کی داغ بیل ڈالی اور فلسفہ کا جواب فلسفہ سے دینے کی کوشش شروع کی۔ اس کا اتنا فائدہ ضرور ہوا کہ الحاد کا جو سیلاب طوفان کی طرح آگے بڑھ رہا تھا، تھم گیا۔ اس کی رفتار کم ہو گئی لیکن اس نے اسلامی عقائد کی جڑیں ہلا دی تھیں اور کتاب و سنت کے دلائل کو پیچھے ڈال چکا تھا۔ علم کلام نے اصل مرض کی تشخیص نہیں کی اور وہ بھی دراصل عقل ہی کے آگے پیچھے دوڑتا رہا۔

خلافت، منہاج نبوت سے بہت پہلے ہٹ چکی تھی۔ مادیت اور دنیا پرستی چھائی ہوئی تھی۔ دین اسلام کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا تھا۔ ایک حصہ سیاست و حکومت کا تھا جو خلفاء، سلاطین اور امراء و وزراء کے لیے مخصوص تھا اور دوسرا حصہ عبادات اور فقہی احکام کا تھا جو علماء اور فقہاء کے لیے خاص تھا۔ یہ ماحول تھا جس میں تصوف کی ابتدا ہوئی۔ وہ مادہ پرستی کے خلاف عملاً دنیا پر آخرت کی ترجیح کے نیک جذبے سے شروع ہوا اور ایک عرصہ تک اس کی سادگی برقرار رہی لیکن آگے چل کر مختلف نظریات، یونانی فلسفے اور علم کلام نے تصوف کے گوشوں پر بھی چھاپا مارا اور اس میں اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات پر گفتگو شروع ہو گئی۔ غیر اسلامی نظریات اس میں گھس آئے اور رفتہ رفتہ انسان کا مقصد حیات ہی بدل کر رہ گیا۔ سیاست و حکومت کو دنیا داری کے خانہ میں ڈال دیا گیا۔ اللہ کی صرف پرستش اور اس کے عشق اور اس کے وصل و وصال کو زندگی کا مقصد قرار دیا گیا اور یہی چیز حقیقی دین سمجھی جانے لگی، اس میں مشغول لوگ "اللہ والے" کہے گئے اور "اولیاء" کا ایک مستقل طبقہ پیدا کر دیا گیا۔ وحدۃ الوجود، وحدۃ الشہود، فنا و بقا، فانی فی اللہ، باقی باللہ، واصل بحق، خدارسیدہ اور اسی طرح کی دوسری اصطلاحیں وجود میں آئیں شریعت، طریقت، حقیقت، دین کے تین درجات بن گئے۔ اگرچہ صوفیہ کرام یہ کہتے رہے کہ طریقت اور حقیقت، شریعت سے الگ نہیں ہیں لیکن اپنی کتابوں

میں "حقیقت" کی جو تشریحات انھوں نے کی ہیں اور تصوف کا جو فن انھوں نے مرتب کیا ہے وہ شریعت سے الگ ہے۔ شریعت پر تو کم ہمت اور سطحی قسم کے لوگ اکتفا کرتے ہیں۔ شریعت اور حقیقت کے اسی تصادم کا نتیجہ ہے کہ تصوف کی کتابیں تضاد بیانی سے بھری ہوئی ہیں۔ "اولیا" کو اس کائنات میں متصرف اور صاحب اختیار قرار دے کر گویا "توحید حقیقی" کے دعوے کا ثبوت مہیا کیا گیا۔ "طبقہ اولیاء" کے جو مقامات و درجات مقرر کیے گئے ہیں اس نے ان کو انبیاء کرام سے افضل قرار دینے کی راہ ہموار کی اور یہ چیز علم التصوف میں ایک مستقل بحث کی طرح داخل ہو گئی۔

"حقیقت" کی تشریح "اولیاء" کے لیے وضع کردہ اوصاف اور ان کے مخصوص مراتب و مقامات کے لیے قرآن کریم اور صحیح احادیث میں دلائل موجود نہ تھے اور مسلمانوں کو مطمئن کرنے کے لیے ضرورت تھی کہ قرآن و حدیث سے دلائل پیش کیے جائیں اس لیے ایک طرف قرآن کریم کی آیات اور صحیح احادیث کی ایسی تاویلیں کی گئیں جن سے عربی لغت، کتاب و سنت کی تعلیمات اور صحابہؓ و تابعینؒ نا آشنا ہیں، اور دوسری طرف اس کام کے لیے احادیث وضع کی گئیں اور انھیں تصوف کی کتابوں میں پھیلا دیا گیا۔ ایک اور کام جس نے دین کو بے حد نقصان پہنچایا یہ کیا گیا کہ دین کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ "ظاہر اور باطن" یعنی شریعت اور حقیقت۔ بعض صوفیہ نے ظاہر کے لیے علم الاحکام اور باطن کے لیے علم الاسرار کی اصطلاح وضع کی۔ جس مسئلے کا ظاہر سے تعلق ہو اس کا فیصلہ ائمہ فقہ کے حوالے کیا گیا اور جس مسئلے کا تعلق باطن سے ہو اس کا فیصلہ ائمہ تصوف کے سپرد کیا گیا اور باطنی مسائل کے لیے ائمہ تصوف کے الہامات، مکشوفات اور مشاہدات کو اصل دلائل کی حیثیت دی گئی حالانکہ دین کی اس تقسیم کا کسی بڑے سے بڑے عالم یا صوفی کو بھی حق نہیں ہے کیوں کہ نبوت و رسالت ختم ہو چکی ہے۔ ان باتوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ تصوف کی کتابیں ایک آمیزہ اور مخلوط بن گئیں۔ کچھ چیزیں اسلامی اور کچھ چیزیں غیر اسلامی۔

فلسفیانہ تصوف نے صوفیوں میں دو گروہ پیدا کیے۔ ایک گروہ نے "حقیقت

تک پہنچ جانے والوں کے لیے شریعت کے احکام پر عمل کرنا یہاں تک کہ نماز ادا کرنا بھی غیر ضروری قرار دے دیا اور وہ الحاد کی راہ پر جا پڑا اور دوسرے گروہ نے ہر حال میں شریعت کی پابندی کو ضروری کہا اور اپنی کتابوں میں ملحدین اور ملحدانہ تصوف کی پر زور تردید بھی کی۔ ان دونوں گروہوں میں بس یہی فرق ہے ورنہ جہاں تک فلسفیانہ تصوف کا تعلق ہے دونوں اس کے قائل ہیں۔

۲۔ تصوف کی چند قدیم عربی کتابوں کا تعارف

ضرورت اس بات کی ہے کہ کتبِ تصوف میں جو غلط، قابل اعتراض اور غیر اسلامی چیزیں مخلوط ہو گئی ہیں ان کو سامنے لایا جائے اور لوگوں کو بتایا جائے کہ یہ غلط اور غیر اسلامی چیزیں ہیں۔ میرا احساس یہ ہے کہ کتب تصوف کی غیر اسلامی باتوں نے مسلم معاشرے کو بہت نقصان پہنچایا ہے۔ یہاں تک کہ وہ خود غیر اسلامی چیزوں کو اسلامی سمجھنے لگے ہیں۔ ان کتابوں کی جو باتیں دین اسلام کے مطابق ہیں ان کو مثبت انداز میں اس حقیر نے اپنی کتاب "اسلامی تصوف" میں جمع کرنے کی کوشش کی ہے اسی طرح "تصوف کی تین اہم کتابیں" کے نام سے ایک کتاب مرتب کی ہے جس میں تین کتابوں کو سامنے رکھ کر ان کے اسلامی اور غیر اسلامی حصوں کو الگ الگ نمایاں کیا گیا ہے۔ پیش نظر موضوع پر گفتگو کرنے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ تصوف کی چند قدیم عربی کتابوں کا مختصر تعارف پیش کر دیا جائے۔

تصوف کا آغاز دوسری صدی ہجری کے وسط تک ہو چکا تھا لیکن تصوف پر کوئی کتاب ۲۰۰ھ تک نہیں لکھی گئی تھی۔

۱۔ کتاب الرعایۃ فی التصوف

تصوف کی سب سے پہلی کتاب غالباً ابو عبداللہ الحارث المحاسبیؒ (۱۶۵-۲۴۳ھ) کی کتاب الرعایۃ فی التصوف ہے۔ اسی کتاب نے محدثین کرام اور علمائے شریعت کو چوکنا کیا۔ انھوں نے محسوس کر لیا کہ مسلم معاشرے میں ایک خلاف سنت طریقِ زندگی پھیل

رہا ہے ۔ حارث محاسبی نے اس کتاب کے علاوہ دوسری کتابیں بھی لکھی ہیں مگر کتاب الرعایۃ ان کی سب سے مشہور اور ضخیم کتاب ہے ۔ وہ اپنے زمانے کے مشہور متکلم (علم الکلام کے ماہر) بھی تھے اور انہیں نے تصوف میں علم کلام کے مسائل داخل کرنے کی ابتدا کی ۔ کہا جاسکتا ہے کہ "احسان" کو فلسفیانہ تصوف بنانے کا آغاز انہیں بزرگ نے کیا تھا ۔ بعد کو تصوف پر جو کتابیں لکھی گئیں ان میں اس کتاب سے استفادہ کیا گیا ہے اور غالباً حضرت محاسبی ہی نے سب سے پہلے "اخلاص" کا اعلیٰ درجہ یہ بتایا کہ عمل جنت کے حصول کے لیے نہ کیا جائے بلکہ صرف اللہ کے لیے کیا جائے ۔ یہ لے بڑھتی گئی ۔ یہاں تک کہ جنت کی تحقیر کی جانے لگی خطیب بغدادی نے روایت کی ہے کہ ابو زرعہ (وقت کے ایک بڑے محدث) سے حارث محاسبی اور ان کی کتابوں کے بارے میں پوچھا گیا :۔

فقال ایاك وهذه الكتب، هذه كتب بدع وضلالات، عليك بالاثر فانك تجد فيه ما يغنيك عن هذه الكتب قيل له في هذه الكتب عبرة قال من لم يكن له في كتاب الله عبرة فليس له في هذه الكتب عبرة ۔	(ابو زرعہ) نے کہا کہ ان کتابوں سے بچو یہ بدعتوں اور گمراہیوں کی کتابیں ہیں ۔ تم احادیث کو پکڑو ۔ ان میں تم ایسی باتیں پاؤ گے جو تمھیں ان کتابوں سے بے نیاز کر دیں گی ۔ ان سے کہا گیا کہ ان کتابوں میں عبرت انگیز باتیں ہیں جواب میں انھوں نے کہا ۔ جس شخص نے کتاب اللہ سے عبرت حاصل نہیں کی اس کے لیے ان کتابوں میں بھی کوئی عبرت نہیں ہے ۔

انھوں نے یہ بھی کہا ۔ کیا مالک بن انس، سفیان ثوری، اوزاعی اور ائمہ متقدمین نے بھی اس طرح کی کتابیں لکھی ہیں ۔ جو لوگ تصوف کے قائل ہیں انھوں نے اہل علم کی مخالفت کی ہے ۔ یہ لوگ سند میں کبھی حارث محاسبی کو پیش کرتے ہیں کبھی عبدالرحیم دیبلی کو، کبھی حاتم اصم کو اور کبھی شقیق بلخی کو ۔ پھر انھوں نے بڑے افسوس کے ساتھ فرمایا : لوگ بدعتوں کی طرف کس تیزی سے لپکتے ہیں ۔ امام احمد بن حنبلؒ

نے بھی لوگوں کو حارث محاسبی کی طرف میلان سے متنبہ فرمایا تھا۔ مثلاً حارث محاسبی کا یہ قول کہ "اللہ نے بغیر آواز کے تکلم فرمایا"۔ انھوں نے اس قول کے قائل کا انکار کیا اور اس کو بدعتی قرار دیا۔ حافظ ابن کثیر نے "البدایۃ والنہایۃ" میں امام احمد کے جو حالات لکھے ہیں اس میں انھوں نے امام بیہقی کے حوالے سے لکھا ہے کہ امام احمد منصور بن عمار اور ان جیسے لوگوں کی صحبت کو ناپسند کرتے تھے اس لیے کہ حارث محاسبی اپنے زہد کے باوجود علم کلام سے اشتغال رکھتے تھے اور امام احمد علم کلام کو ناپسند کرتے تھے اسی پر ابن کثیر نے یہ اضافہ کیا ہے کہ امام احمد ان صوفیوں کی صحبت کو اس لیے ناپسند کرتے تھے کہ حارث محاسبی وغیرہ نے تقشف اور سلوک پر جو باتیں لکھی ہیں ان کا کوئی ثبوت شریعت میں نہیں ہے۔ ابوزرعہ رازی نے بھی حارث محاسبی کی تصنیف کتاب الرعایۃ کو بدعت کہا تھا۔ محاسبی کے زمانے میں چونکہ مسلم معاشرے پر علماء، فقہاء اور محدثین کے اثرات بہت زیادہ تھے۔ اس لیے ان کو مقبولیت حاصل نہیں ہوئی ان کی جب وفات ہوئی تو ان کے جنازے کے ساتھ صرف چار آدمی تھے۔ کتب تصوف میں ضعیف احادیث بے سند اور عجیب وغریب واقعات لکھنے کی ابتدا بھی اسی کتاب سے ہوئی۔ اس کتاب کے بارے میں اگر یہ کہا جائے تو شاید غلط نہ ہو۔

خشت اول چوں نہد معمار کج　　تا ثریا می رود دیوار کج

۲۔ کتاب الصدق:

یہ کتاب حضرت ابوسعید احمد بن عیسیٰ الخراز (م ۲۸۶ھ) کی تصنیف ہے۔ اور کتاب الرعایۃ کے بعد تصوف کی قدیم ترین کتاب ہے۔ اس کتاب میں صدق کو محور بنا کر مقامات کی تشریح کی گئی ہے۔ مثلاً "صدق فی الاخلاص" "صدق فی الانابۃ" "صدق فی المحبۃ" وغیرہا۔

اس کتاب میں بھی ایسی باتیں لکھی گئی ہیں جو بے سند ہیں۔ مثلاً حضرت صدیق رضؓ کے بارے میں لکھا گیا ہے:۔

(۱) ان کا لباس صرف ایک چادر تھا جسے اوڑھ کر ببول کے دو کانٹے لگا لیا کرتے

تھے اور اسی وجہ سے ان کا لقب "ذو الخلالتین" پڑ گیا تھا۔

(پروفیسر یوسف سلیم تاریخ تصوف)

(۲) احادیث میں وارد ہے کہ اصحاب محمد صلی اللہ علیہ وسلم نہ تو حصول لذت کے لیے کھاتے تھے اور نہ حصول مسرت کے لیے پہنتے تھے۔ (ایضاً)

اس کے علاوہ شرعی اصطلاحات (مثلاً زہد) کی مبالغہ آمیز تشریحات بھی اس کتاب میں موجود ہیں۔

۳۔ رسائل جنید :

پروفیسر یوسف سلیم چشتی نے اپنی کتاب تاریخ تصوف میں سید الطائفہ حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ کے حالات بھی تحقیق و تفصیل سے لکھے ہیں۔ انھوں نے اس کتاب میں رسائل جنید کا بھی مفصل تعارف کرایا ہے۔ ہم اس کے چند اقتباسات یہاں پیش کرتے ہیں۔ انھوں نے لکھا ہے :۔

رسائل جنید میں جو ۱۹۶۲ء میں لندن سے شائع ہوئے ہیں حسب ذیل رسائل شامل ہیں :۔

(۱) رسالہ الی بعض اخوانہ (۲) رسالہ الی یحیی بن معاذ الرازی (۳) رسالہ الی بعض اخوانہ (۴) رسالہ الی ابی بکر الکسائی الدینوری (۵) رسالہ بغیر عنوان (۶) رسالہ الی عمرو بن عثمان المکی (۷) رسالہ الی یوسف بن حسین الرازی (۸) دوار الارواح (۹) کتاب الفناء (۱۰) کتاب المیثاق (۱۱) کتاب فی الالوہیۃ (۱۲) کتاب فی الفرق بین الاخلاص والصدق (۱۳) باب آخر فی التوحید ۱۵ تا ۱۹ بھی اسی موضوع پر ہیں۔ (۲۰) آخر مسئلہ (۲۱) ادب المفتقر الی اللہ۔

ان عنوانات سے دو باتیں سامنے آتی ہیں۔ ایک یہ کہ تصوف میں مکاتیب و رسائل کا جو سلسلہ جاری ہوا اس کی ابتدا حضرت جنید نے کی تھی۔ دوسری یہ کہ توحید پر بحث کا آغاز حضرت جنید ہی کے وقت میں ہو گیا تھا۔

پروفیسر یوسف سلیم صاحب نے ان کے رسائل سے ان کی جو تعلیمات مرتب کی

ہیں ان میں سے بعض یہ ہیں :

حضرت ہجویری نے حضرت جنید کے ایک قول کا مطلب یہ بیان کیا ہے :

"حقیقی توحید میں انسانی صفات باقی ہی نہیں رہتیں کیوں کہ انسانی صفات قائم بالذات اور مستقل نہیں محض رسوم ہیں سراسر غیر مستقل اور عارضی ہیں جیسے آئینے میں عکس۔ فاعل حقیقی حضرت خدا ہے اس لیے وہ دراصل صفات باری ہیں۔" (تاریخ تصوف ص ۲۲۳)

ایک دفعہ لوگوں نے ان سے توحید کا مطلب پوچھا تو انھوں نے کہا :

"توحید وہ معنے ہے جس کی تعریف نہیں ہو سکتی۔ حالانکہ توحید کے معنے میں مکمل علم پوشیدہ ہے۔"

راقم الحروف عرض کرتا ہے کہ جس توحید کی تعریف نہیں ہو سکتی وہ قرآنی توحید نہیں ہے اس لیے کہ قرآن تو توحید کی تشریح سے بھرا پڑا ہے اور دین اسلام کا اصل الاصول توحید ہی ہے۔ پروفیسر صاحب لکھتے ہیں :-

جنید نے اس امر کی صراحت بھی کی ہے کہ اللہ کی صفات اور اس کے افعال سب اس کی ذات میں مندرج ہیں۔ یعنی اس طرح داخل ذات ہیں کہ ان میں کوئی امتیاز نہیں ہے اور جب سالک توحید کے اس مقام پر فائز ہوتا ہے تو اسے معلوم ہو جاتا ہے کہ صفات اور افعال سب ذات میں مندرج ہیں اور اس وقت وہ خود بھی بالکلیہ ذات میں جذب ہو جاتا ہے۔ "من تو شدم تو من شدی" والا معاملہ ہو جاتا ہے۔

پروفیسر صاحب نے لکھا ہے کہ حضرت جنید نے توحید کے چار مراتب بیان کیے ہیں توحید عوام۔ توحید علماء۔ توحید خواص اور توحید اخص خواص۔ حضرت جنید نے یہ بھی کہا ہے۔

"تصوف کی ماہیت یہ ہے کہ خدا بندے پر بندے کی حیثیت سے موت طاری کر دے اور پھر اپنی ذات میں ان کو دوبارہ زندہ کر دے۔" (تاریخ تصوف ۲۳۷)

یہ حقیر عرض کرتا ہے کہ رسائل جنید اگر واقعی حضرت جنید ہی کے رسائل ہیں تو پھر اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ رسائل ہی نظریۂ وحدۃ الوجود کی بنیاد ہیں۔ یہ حضرت جنید

کے تصوف کا وہ رُخ ہے جو اب تک مجھ سے مخفی تھا۔

۴۔ کتاب اللمع :

یہ کتاب طاؤس الفقرا ابو نصر عبداللہ بن علی بن محمد بن یحییٰ السراج طوسی (م ۳۷۸) کی تصنیف ہے۔ یہ تصوف کی ایک جامع کتاب ہے۔ مصنف کے عہد تک تصوف پر جو کچھ لکھا گیا ہے وہ سب اس میں جمع کر دیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ جو غلط باتیں تصوف میں داخل کر دی گئی تھیں ان کی تردید بھی کی گئی ہے۔ پروفیسر یوسف سلیم صاحب نے لکھا ہے :

سراج نے اس کتاب میں ان تمام غیر اسلامی عقائد مثلاً حلول اور اتحاد کی بڑی شدت کے ساتھ تردید کی ہے جو چوتھی صدی ہجری میں اسماعیلیہ، قرامطہ، باطنیہ اور زنادقہ کے ذریعے داخل ہو گئے تھے۔" (تاریخ تصوف ۳۳۰)

یہ حقیر عرض کرتا ہے کہ جس طرح حلول اور اتحاد غیر اسلامی عقیدے ہیں اسی طرح وحدۃ الوجود بھی غیر اسلامی عقیدہ ہے۔ افسوس یہ ہے کہ پروفیسر صاحب حلول و اتحاد کی تغلیط اور وحدۃ الوجود کی تصویب کرتے ہیں جس میں اثنینیت یعنی دوئی حرام ہے۔ جب اللہ کے سوا دوسرا کوئی موجود ہی نہیں تو ظاہر ہے کہ حلول اور اتحاد کو غلط ہونا ہی چاہیئے۔ کیوں کہ حلول بھی دوئی کے بغیر ممکن نہیں اور اتحاد بھی دوئی کے بغیر ممکن نہیں۔

۵۔ قوت القلوب

یہ کتاب ابو طالب محمد بن علی بن عطیۃ الحارثی المکی (م ۳۸۶) کی تصنیف ہے۔ ابو طالب مکی نے ابو نصر سراج کی وفات سے آٹھ سال بعد وفات پائی ہے۔ قوت القلوب بھی تصوف کی ایک جامع اور ضخیم کتاب ہے۔ متعدد علماء، مورخین اور صوفیہ نے اس کتاب کو تصوف کی بے نظیر کتاب قرار دیا ہے۔ افسوس ہے کہ اس کتاب میں بھی ضعیف اور باطل احادیث موجود ہیں اور توحید کے بارے میں ایسی باتیں بھی پائی جاتی ہیں جو نہ کتاب و سنت کے مطابق ہیں اور نہ صحابہ و تابعین کا علم ان سے آشنا ہے۔ میں صرف ایک عبارت یہاں نقل کرتا ہوں۔

" اور بعض عارفوں نے یوں کہا ہے کہ ربوبیت کا ایک سر (راز) ہے۔

اگر وہ ظاہر ہو جائے تو نبوت باطل ہو جائے گی اور نبوت کا بھی ایک سر ہے اگر وہ ظاہر ہو جائے تو علم باطل ہو جائے گا اور اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں علماء کا بھی ایک سر ہے اگر وہ ظاہر ہو جائے تو احکام باطل ہو جائیں گے۔ پس قوام ایمان اور استقامت شرع کے لیے اسرار کو پوشیدہ رکھنا ہی بہتر ہے۔"

(پروفیسر یوسف سلیم چشتی تاریخ تصوف)

اس کتاب میں ظاہر و باطن اور اہل ظاہر و اہل باطن کی تقسیم بھی موجود ہے۔

۶۔ رسالہ قشیریہ

یہ کتاب امام زین الاسلام ابوالقاسم عبدالکریم بن ہوازن بن عبدالملک بن طلحہ بن محمد القشیری الشافعی (م ۴۶۵ھ) کی تصنیف ہے۔ یہ کتاب ۴۳۷ھ میں تصنیف کی گئی تھی اس نے بڑی مقبولیت حاصل کی ہے[1]

یہ چھ ۶ کتابیں تصوف کی امہات کتب ہیں۔ ان کتابوں نے فلسفیانہ تصوف کے جو بیج بوئے تھے وہ آگے چل کر تناور درخت بن گئے ہیں۔

(۳) قرآن اور حدیث کو صحیح طور پر سمجھنے کے مسلمہ اصول

یہ بات بہت اہمیت رکھتی ہے کہ قرآن کریم کی کسی آیت یا کسی صحیح حدیث کو سمجھنے اور اس سے کوئی حکم مستنبط کرنے یا کوئی نتیجہ نکالنے کے لیے ان مسلمہ اصول پر عمل کیا جائے جو قرآن اور حدیث کو صحیح طور پر سمجھنے اور ان سے احکام و نتائج اخذ کرنے کے لیے ضروری قرار دیئے گئے ہیں۔ مذاہب، نظریات و خیالات کی پوری تاریخ اس پر گواہ ہے کہ غلط مذاہب اور غلط نظریات و خیالات پر قرآن و حدیث سے جو استدلالات کیے گئے ہیں ان سب میں مسلمہ اصولوں کی خلاف ورزی کی گئی ہے۔ کیوں کہ مسلمہ اصولوں کی خلاف ورزی کیے

---

[1] میں نے اپنی کتاب "اسلامی تصوف" میں اس کتاب سے استفادہ کیا ہے اور اخیر میں امام قشیری کے حالات بھی لکھے ہیں۔ (مصنف)

بغیر قرآن وحدیث سے کسی غلط مذہب یا غلط نظریہ وخیال پر استدلال کیا ہی نہیں جا سکتا۔ وہ اصولِ مسلمہ یہ ہیں:

۱۔ قرآن اور حدیث سے کوئی ایسی بات نکالنا غلط ہے جو عربی لغت اور کتاب وسنت کی اصطلاحات کے خلاف ہو۔ قرآن وحدیث سے مستنبط کسی بات میں صحت اسی وقت آسکتی ہے جب اس کی خلاف ورزی نہ کی گئی ہو۔

۲۔ جو بات اخذ کی گئی ہو وہ دینی مسلّمات کے خلاف نہ ہو۔

۳۔ کسی آیت کو اس کے سیاق وسباق سے کاٹ کر ایسی بات نکالنا جس سے قرآن وحدیث کی تعلیمات میل نہ کھاتی ہوں غلط ہوگی۔

۴۔ کسی آیت کی ایسی تفسیر یا تاویل جس سے فی الواقع اس کی معنوی تحریف ہوتی ہو، مردود اور بالکل غلط ہوگی۔

۵۔ کسی آیت سے کوئی ایسا خیال پیدا کرنا یا کوئی ایسا عمل اخذ کرنا جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایات، آپ کی سیرت طیبہ واسوۂ حسنہ اور صحابہ کرامؓ کی سیرتِ محمودہ سے مطابقت نہ رکھتا ہو، غلط ہے۔

ان پانچ نکات میں کوئی نکتہ ایسا نہیں ہے جو تمام علمائے امت کے نزدیک تسلیم شدہ نہ ہو۔ اسلامی اور غیر اسلامی تصوف کو سمجھنے کے لیے بھی ان مسلّم اصولوں کو سامنے رکھنا ضروری ہے۔

۴۔ نقطۂ انحراف۔ ذات وصفات کے فلسفیانہ مباحث

اللہ رب العزت کی ذات وصفات کے بارے میں انسان جو کچھ اور جتنا کچھ جان سکتا تھا وہ سب قرآن کریم اور صحیح احادیث میں بتا دیا گیا ہے۔ دین اسلام کو اللہ تعالیٰ نے مکمل کر دیا ہے۔ اب نہ کوئی کتاب اترنے والی ہے اور نہ کوئی نبی آنے والا ہے۔

اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ — آج میں نے تمہارے دین کو مکمل کر دیا ہے

وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ — اور اپنی نعمت تم پر تمام کر دی ہے اور تمہارے

وَ رَضِیۡتُ لَکُمُ الۡاِسۡلَامَ دِیۡنًا ۔ (المائدہ : ۳)
لیے اسلام کو تمھارے دین کی حیثیت سے قبول کر لیا ہے ۔

اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات کے بارے میں قرآن کریم اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دی ہوئی تعلیمات کے مطابق صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی ایک ایسی بلند مرتبہ جماعت تیار ہوئی جس سے زیادہ بلند مرتبہ کوئی جماعت، قیامت تک زمین کی سطح پر پیدا نہیں ہوگی ۔ اس جماعت کو دنیا و دین کی کسی کامیابی کے لیے ذات وصفات کے بارے میں ان مباحث کی ضرورت نہیں پڑی جو بعد کو پیدا ہوئیں ۔ فلسفہ اور علم کلام جب تصوف میں بھی داخل ہوا تو صوفیہ کے درمیان بھی اللہ تعالیٰ کی ذات صفات اور عقیدہ توحید کے بارے میں وہ بحثیں شروع ہوئیں جو نہ قرآن میں تھیں اور نہ احادیث میں ۔ صوفیہ نے خدا کی ذات وصفات کے بارے میں وہ کچھ جاننا چاہا جو نہ خدا نے بتایا تھا، نہ اس کے رسولؐ نے اور نہ رسول کے مقدس ساتھیوں نے ــــ اسلامی تصوف میں یہی وہ نقطۂ انحراف تھا جس نے تصوف کو اسلامی اور غیر اسلامی افکار و اعمال کا ایک مخلوطہ بنا کر رکھ دیا اور یہی نقطۂ انحراف تھا جس نے صوفیوں کی ایک جماعت کو الحاد کے راستہ پر ڈال دیا ۔

(۱) کیا خدا کی صفات اس کی ذات میں داخل یعنی عین ذات ہیں ؟ (۲) کیا خدا کی صفات اس کی ذات سے الگ یعنی غیر ذات ہیں ؟ (۳) کیا خدا کی صفات لا عین و لا غیر ہیں یعنی نہ وہ ذات میں داخل ہیں اور نہ ذات سے الگ ہیں ؟ (۴) کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ خدا کی ذات کسی صفت سے متصف نہ ہو ؟

متکلمین نے یہ موقف اختیار کیا کہ صفات الٰہی لا عین و لا غیر ہیں (اور یہی بات عقائد کی کتابوں میں داخل ہو گئی) یعنی نہ وہ ذات الٰہی کے اندر داخل ہیں اور نہ اس سے الگ ہیں ۔ لیکن یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب وہ لا عین و لا غیر ہیں تو پھر ذات الٰہی سے ان کے ربط کی نوعیت کیا ہے ؟ اس سوال کا جواب شاید متکلمین نہیں دے سکے ہیں ۔
معتزلہ نے صفات کی نفی کر دی اور اپنے کو اصحاب التوحید کہنا شروع کر دیا ۔ اب

یہ سوال اٹھ کھڑا ہوا کہ توحید کیا ہے؟ جس چیز کو واضح کرنے کے لیے قرآن نازل ہوا اور لوگوں کو شرک سے پھیر کر توحید کی طرف لانے میں رسول نے اپنی جان کھپائی وہی چیز مجہول قرار پائی اور اس کی حقیقت پر لمبی چوڑی بحثیں شروع کر دی گئیں۔ یہ مباحث چوں کہ کتاب و سنت کے مباحث نہ تھے اس لیے ان میں ان سوالات کے جوابات نہیں مل سکتے تھے اس لیے متکلمین اور صوفیہ دونوں مجبور تھے کہ جوابات کسی اور چیز سے حاصل کریں۔ متکلمین نے عقل سے جوابات حاصل کیے اور صوفیہ نے الہامات و قیاسات و تشبیہات سے۔ ذات و صفات اور توحید کی فلسفیانہ بحث تصوف میں اس طرح داخل ہوئی ہے کہ حارث محاسبی کے عہد سے عہدِ حاضر تک اس سے پیچھا نہیں چھوٹا ہے۔ اس سلسلے میں اگلوں نے جو کچھ کہا تھا پچھلے اس کو دہراتے چلے آرہے ہیں۔ میں یہاں ان مباحث کو تفصیل سے پیش کرنا بیکار سمجھتا ہوں البتہ نمونہ کے طور پر مولانا حسین احمد مدنی مرحوم و مغفور کی ایک تحریر نقل کرتا ہوں۔

جناب باری عز اسمہ ہماری عقل و ادراک سے نہایت ہی زیادہ بلند اور بالا ہے

لیس کمثلہ شیئٌ

اے برتر از خیال و قیاس و گمان و وہم　　　　وز ہر چہ گفتہ اند و شنیدیم و خواندہ ایم

مگر تقریب و تفہیم کے لیے مندرجہ ذیل مثال پیش کرتا ہوں:۔

ہر انسان میں ایک مرتبہ ذات کا ہے، اس درجہ میں وہ سب سے بے پروا و غیر متعلق ہے۔ دوسرا درجہ صفات کا ہے جو کہ تمام تعلقات خارجہ کا سبب ہے۔ اس کا وصف کرم اس کو داد و دہش پر آمادہ کرتا ہے، اسی پر وہ غریبوں اور فقراء، ارباب حاجات کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور یہ وصف اس کو مجبور کرتا ہے کہ وہ اس کی حاجت مندیوں پر بے چین ہو جائے اور اپنے مال و زر کو ان تک پہنچانے میں دریغ نہ کرے، وصف شجاعت قتل و قتال، قہر و غلبہ پر مجبور کرتا ہے و علی ہذا القیاس تمام اوصاف یہی معاملہ رکھتے ہیں۔ تیسرا مرتبہ جوارح کا ہے جس کے وسیلے سے وہ مقتضیات صفات کو خارج میں انجام دیتا ہے کریم شخص میں داد و دہش کی نوبت آتی اور ظہور پذیر ہوتی ہے۔ شجاع میں قتل و قتال قہر و غلبہ کی خارج میں صورت بنتی ہے۔ اگر یہ جوارح نہ ہوتے تو مقتضیات صفات کے ظہور کی صورت نہ بنتی۔ اسی طرح

بلا تشبیہ تمام ذاتِ باری عزاسمہٗ تمام خلائق سے مستغنی اور غیر متعلق ہے۔ اسی کی صفات کاملہ جو کہ لاغیر ولاعین ہیں، واسطہ بین القدیم والحادث ہیں، وہی تعلقات پیدا کرنے والی ہیں اس کے بعد مرتبہ اسمار کا ہے۔ یہ اسمائے عالیہ اپنے اپنے اقتضارات کے موافق تمام عالم میں تصرف کرتے ہیں جیسے کہ انسان کے جوارح اپنی اپنی قابلیت کے موافق تصرف کرتے ہیں۔ اسم رزاق مخلوقات کو رزق پہنچاتا ہے جیسے کہ انسان کا ہاتھ داد و دہش کا کام انجام دیتا ہے۔ اسم خلاق، ماہیات معلومہ بالعلم الازلی کو نعمت وجود بخشتا ہے اور اسی طرح تمام اسمائے مقدسہ کے تصرفات ہیں۔ اسمار باری عزّ اسمہ ہمارے اسمار کی طرح تاثیر وقوت سے خالی نہیں ہیں۔ لاعین ولاغیر از ذاتِ مقدسہ ہیں ان میں وہ قدرت جو کہ صفاتیہ ذاتیہ میں سے ہے، ظہور پذیر ہے جس سے اس کے تصرفات عالم میں جاری ہیں جیسے کہ ہمارے جوارح ہماری صفات کے منظاہر ہیں۔ اسمار باری تعالیٰ کا تعلق ہر انسان کے ساتھ علیحدہ علیحدہ ہے۔ کسی شخص کا مربی اسم علیم ہے کسی کا مربی اسم قدیر ہے کسی کا دوسرا اسم ہے۔ اہل اللہ کا ارشاد ہے۔ طرق الموصل الی اللہ بعدد انفاس الخلائق اس کا راز بھی یہی ہے جو اسم کسی کا مربی ہے اس اسم کے ذکر اور تصور دائم سے اس کو جلد ترقی ہو سکتی ہے مگر اس کا تمیز کرنا ماہرین کو بھی مشکل ہے اس لیے اسم جامع اللہ سالک کو تعلیم دیا جاتا ہے۔ سالک کی ترقی اس کے اسم مربی تک ہو سکتی ہے۔[1]

اس مکتوب کو پڑھ کر ذہن میں پہلی بات یہ آتی ہے کہ ایک طرف باری عزاسمہٗ کو لیس کمثلہ شیٔ کہنا (جیسا کہ قرآن میں ہے) اور اس کو بجا طور پر انسانی عقل وادراک، خیال وقیاس وگمان ووہم سے بالاتر قرار دینا اور دوسری طرف انسان کی مثال دے کر اس کو سمجھانے کی کوشش کرنا دو متناقض ومتضاد باتیں ہیں۔ انسان کے پاس کسی چیز کو سمجھنے کے جتنے ذرائع ہیں جب وہ ان سب سے ماورا ہے تو پھر اس کی ذات وصفات اور ان کے باہمی ربط کو سمجھنے سمجھانے کی ہر سعی لاحاصل ہے

---

[1] مولانا حسین احمد مدنی۔ مکتوبات ج ۲۔ مکتوب ۱۷ ص ۶۹

دوسری بات یہ ذہن میں آتی ہے کہ انسان کا

وجود، مرتبۂ ذات میں محض ذہنی اور وہمی ہے، خارج میں اس کا کہیں وجود نہیں اور نہ ہو سکتا ہے تو کیا ذاتِ باری عز اسمہ کا وجود بھی مرتبۂ ذات میں محض ذہنی اور وہمی ہے؟ پھر یہ کہ اللہ تعالیٰ کے اسمار مقدسہ میں سے ہر اسم کو ایک مستقل متصرف وجود قرار دینا. یونانی اور ہندوستانی فلسفے کے لحاظ سے جو اوثان و اصنام کے چکر سے نکل نہیں سکا ہے صحیح ہو تو اسلامی عقیدہ، توحید کے لحاظ سے بالکل غلط اور گمراہ کن ہے. اللہ رب العزت کو اپنی صفت تخلیق کے ظہور کے لیے کسی جارحہ کی ضرورت نہیں ہے۔

قرآن کریم کی متعدد آیتوں میں اس کی صراحت موجود ہے۔ مثال کے طور پر سورۂ یٰسین کی دو آیتیں ۸۱ - ۸۲ پڑھیے۔

> کیا وہ جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اس پر قادر نہیں ہے کہ ان جیسوں کو پیدا کر سکے؟ کیوں نہیں جبکہ وہ ماہر خلاق ہے۔ وہ تو جب کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے تو اس کا کام بس یہ ہے کہ اسے حکم دے کہ ہو جا اور وہ ہو جاتی ہے۔

اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات کے بارے میں جو بحثیں کتب تصوف میں بھری پڑی ہیں اوپر کا مکتوب اس کا ایک محض معمولی نمونہ ہے۔

۵ - وحدۃ الوجود

ذات وصفات اور ان کے درمیان باہمی ربط کی جو بحثیں شروع ہوئیں ان کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ صوفیہ وحدۃ الوجود تک پہنچیں جو اصلاً یونانی فلسفے اور ہندی ویدانت کا نظریہ ہے۔ تصوف میں اس کی داغ بیل سید الطائفہ حضرت جنید بغدادیؒ (۲۱۵-۲۹۸) کے عہد ہی میں پڑ گئی تھی اور ان کے شاگرد حسین بن منصور الحلاج (المصلوب ۳۰۹ ھ)

نے علانیہ انا الحق کا نعرہ لگایا تھا اور اسی جرم میں ان کو سولی دی گئی تھی ۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس وقت تک حکومت میں بھی اسلامی عقائد کا رکھ رکھاؤ باقی تھا۔ ـــــــــــ

ـــــــــــ عدالتوں میں اسلامی شریعت نافذ تھی اور عوام بھی کافرانہ ومشرکانہ نعرے برداشت نہیں کرتے تھے لیکن حالات میں بایزید بسطامی تک پہنچتے پہنچتے اتنی بڑی تبدیلی واقع ہو چکی تھی کہ جب انھوں نے سبحانی ما اعظم شانی اور لیس فی جبتی سوی اللہ کے نعرے لگائے تو کسی کے کانوں پر جوں بھی نہیں رینگی۔

حلاج کی تصنیف کتاب الطواسین صوفیہ کے حلقوں میں برابر متداول رہی ہے پروفیسر یوسف سلیم چشتی نے اپنی کتاب تاریخ تصوف میں حلاج کا یہ قول نقل کیا ہے :

> میں وہی تو ہوں جسے میں چاہتا ہوں یا محبت کرتا ہوں اور وہ جس سے میں محبت کرتا ہوں، میں ہے ہم دو روحیں ہیں جو ایک ہی جسم میں رہتی ہیں ۔ اگر تو مجھے دیکھتا ہے تو گویا اسے دیکھتا ہے اور اگر تو اسے دیکھتا ہے تو گویا ہم دونوں کو دیکھتا ہے۔ (ص ۲۶۵)

اس قول پر پروفیسر صاحب نے یہ حاشیہ دیا ہے :

" قارئین دھوکا نہ کھا جائیں ۔ یہ وحدۃ الوجود نہیں ہے بلکہ حلول یا اتحاد ہے کیونکہ حلاج بار بار دوئی کا اعلان واعتراف کر رہا ہے ۔ وحدۃ الوجود کی رو سے دوئی محال ہے کیونکہ لاموجود فی الحقیقۃ الا اللہ ۔ یہ کائنات اس کی تجلیات کا دوسرا نام ہے ۔ دگر ہیچ "

تصوف کی کتابوں میں حلول، اتحاد اور وحدۃ الوجود کی اصطلاحیں بکثرت مستعمل ہیں ۔ اس لیے مناسب ہے کہ ان تینوں کے مفاہیم یہاں بتا دیئے جائیں ۔ پروفیسر یوسف سلیم صاحب ہی نے ایک حاشیہ میں لکھا ہے :

" حلول کا مطلب ہے خدا کا کسی انسان کے جسم عنصری یا جسد مادی میں داخل

ہو جانا۔ اسے انگریزی میں (INCARATION) اِن کریشن کہتے ہیں۔ نصاریٰ بالعموم حلول کے قائل ہیں۔ اتحاد کا مطلب ہے خدا اور بندے کا متحد فی الذات ہو جانا اسے (FUSION) کہتے ہیں۔ حلول میں خدا اور انسان دونوں مل کر ایک شئے ہو جاتے ہیں جیسے پانی اور شکر مل کر ایک تیسری شئے شربت بن جاتے ہیں۔ اتحاد میں دونوں اپنی اپنی حالت ذاتی پر برقرار رہتے ہیں۔ اسلام کی رو سے حلول اور اتحاد دونوں کفر ہیں۔ وحدۃ الوجود کا عقیدہ ان دونوں عقیدوں سے مختلف ہے اور اسلام کی رو سے کفر نہیں ہے۔ (ص ۲۵)

پروفیسر صاحب نہ صرف تصوف بلکہ وحدۃ الوجود کے بھی زبردست حامی ہیں۔ انھوں نے یہاں اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ یہ کوئی اسلامی عقیدہ نہیں ہے بلکہ صرف یہ کہ اسلام کی رو سے کفر نہیں ہے۔ ہم بھی یہی کہتے ہیں کہ وحدۃ الوجود کا نظریہ اسلام سے نہیں بلکہ باہر سے تصوف میں داخل ہوا ہے۔ عہد حاضر ہی کے ایک بزرگ جناب عارف لاہوری صاحب نے اپنی کتاب "اصول تصوف" میں لکھا ہے:

> "جاننا چاہیے کہ دائرہ ثانی قلب کی رسائی سے پہلے (کہ وہ توحید کے ظاہر ہونے کا مقام ہے) توحید کی بات کرنا اور وحدۃ الوجود کا اعتقاد رکھنا شریعت کے بالکل برخلاف ہے۔ کیا تم دیکھتے نہیں کہ انبیاء علیہم السلام نے توحید وجود کے لیے دعوت نہیں دی ہے بلکہ احکام شریعت کے لیے جو کتاب و سنت پر موقوف ہیں اور باطل معبودوں کی نفی بھی کرتے ہیں اور عبادت کے لیے صرف معبود حقیقی کو یگانہ قرار دیتے ہیں۔" (ص ۶۴)

ہم صرف اتنا اضافہ کرتے ہیں کہ جس چیز کی انبیائے کرام علیہم السّلام نے دعوت نہیں دی وہ جس طرح عوام کے لیے غلط ہے اسی طرح خواص کے لیے بھی غلط ہے۔ انبیاء کرام خواص کے لیے الگ دین اور عوام کے لیے الگ دین نہیں لائے تھے۔ ایک ہی دین ہے جو عوام کے لیے بھی ہے بلکہ اخص الخواص کے لیے بھی۔

وحدۃ الوجود کی مختلف تشریحیں کی گئی ہیں لیکن اس نظریہ کے ماہرین اس بات پر متفق ہیں کہ اس کائنات میں صرف اللہ موجود ہے اور دوسری تمام چیزوں کا وجود محض خیالی اور وہمی

ہے۔ صوفیہ نے اس مسئلے پر ہزاروں صفحات سیاہ کیے ہیں۔ اس نظریے نے جو اثرات پیدا کیے اس کے بارے میں ہم یہاں صرف ایک عبرت ناک واقعہ نقل کرتے ہیں۔

شہر بھڑوچ میں ایک درویش تھے جو ہر چیز کو "اللہ" کہتے تھے۔ شاہ عبدالرزاق ان سے ملاقات کو گئے جب ان کے مکان پر پہنچے تو انھوں نے کہا۔ بیا (آؤ اللہ) وہ ان کے پاس جاکر بیٹھ گئے تو انھوں نے کہا۔ ملامت از اللہ انداز" یعنی گھوڑے سے زین الگ کردو۔ شاہ عبدالرزاق نے زین اتار کر گھوڑے کو چھوڑ دیا کہ گھاس کھائے۔ وہ گھاس کھانے اور اچھلنے کودنے لگا تو درویش نے کہا۔" اللہ، اللہ را خورد و سرکشی و جہیدن را خواہد۔" اللہ نے اللہ کو کھایا اور اب اچھلنا کودنا چاہتا ہے۔ درویش نے شیخ قدس سرہٗ سے کہا کہ تم بھی کہو۔ "ہمہ اللہ، سب اللہ" حضرت شیخ نے یہ فرمایا کہ میرا یہ حال نہیں ہے۔ یہ سن کر درویش نے چاہا کہ بددعا دیں۔ شیخ نے فرمایا۔ حضرت غوث اعظم رحمۃ اللہ علیہ کی برکت سے میرا کچھ نہ بگڑے گا۔ یہ سن کر درویش کو سکون ہو گیا۔ پھر تو وہ حضرت شیخ پر بہت مہربان ہو گئے اور ان کے لیے کھانا لائے۔ چند دن حضرت شیخ ان کی صحبت میں رہے۔ درویش نے ان سے کہا کہ اب میری زندگی کے آخری ایام ہیں۔ میں اب اس دنیا سے منتقل ہو جاؤں گا اور تم جہاں کہیں بھی ہو گے تمھیں خبر کروں گا۔ چند دن کے بعد حضرت شیخ نے اپنے جلسۂ ملکوتیہ میں درویش کو دیکھا کہ مسرت ان کی پیشانی سے ظاہر ہو رہی ہے اور اسی نشست میں دیکھا کہ ان کا سر اُن کے ہاتھ میں ہے۔ یہ دیکھ کر حضرت شیخ غمزدہ ہو گئے۔ اس کے بعد بھڑوچ سے کچھ لوگ آئے اور خبر دی کہ لوگوں نے فلاں درویش کو اللہ کے حق کا دعویٰ کرتے ہوئے قتل کر دیا اور وہ اللہ کے جوار میں پہنچ گئے۔[1]

ایک دوسری کتاب ملفوظ رزاقی میں اتنا اضافہ ہے کہ درویش نے حضرت شیخ سے کہا تھا۔ اللہ، اللہ را کشتند۔ اللہ نے اللہ کو مار ڈالا۔[2]

---

[1] مناقب رزاقیہ بزبان فارسی۔ مرتبہ مولانا نظام الدین محمد انصاری فرنگی محلی لکھنویؒ۔ مطبوعہ: مجتبائی لکھنؤ

[2] ملفوظات رزاقی

ابن عربی اور شیخ احمد سرہندی رحمہا اللہ نے اس مسئلے پر جو کچھ لکھا ہے اگر صرف اسی کو جمع کیا جائے تو ایک ضخیم کتاب تیار ہو جائے گی۔ اوپر جو عبرت ناک واقعہ ہم نے نقل کیا ہے وہ اس مسئلے کی ایک عملی تشریح ہے۔ ہمارا موقف یہ ہے کہ یہ نظریہ اسلامی نہیں ہے اس لیے جس تصوف کی بنیاد وحدۃ الوجود پر ہو یا جس میں اس کو ایک اعلیٰ مقام دیا گیا ہو وہ اسلامی نہیں ہو سکتا۔

۶۔ مقصدِ حیات اور انسان کی حیثیت میں تبدیلی

اگر مٹی کا کوئی ڈھیلا زور لگا کر اوپر دور تک اچھال دیا جائے تو دو صورتیں ہو سکتی ہیں۔ ایک یہ کہ اوپر اس کو کوئی روکنے والا موجود نہ ہو تو وہ بلا تاخیر زمین کی طرف واپس آئے گا اس کا اضطراب جاری رہے گا یہاں تک کہ زمین پر آگرے۔ زمین پر گر کر وہ ساکن ہو جائے گا اور اس کا اضطراب ختم ہو جائے گا اور اگر اس کو اوپر کوئی روکنے والا روک لے تو رکاوٹ ختم ہوتے ہی وہ زمین کی طرف لوٹے گا۔ رُکی ہوئی حالت میں اگر اس سے پوچھا جائے کہ اس کی زندگی کا مقصد کیا ہے تو جواب دے گا زمین پر پہنچ جانا۔ زمین ہی اس کی محبوبہ ہوگی اور وہ اس کے درد فراق میں آہ و نالہ بھی کرے گا اور چیخیں بھی مارے گا اس لیے کہ زمین ہی اس کی اصل ہے جس سے زبردستی اس کو الگ کر دیا گیا ہے۔ زمین کا عشق اور آکر اس میں جذب ہو جانا ہی اس کا مقصد حیات قرار پائے گا۔ اسی طرح انسان کا اپنے بارے میں اگر یہ تصور ہو کہ وہ ذاتِ الٰہی میں جمع اور آسودہ تھا اور دنیا میں بھیج کر اس کو اس کی اصل سے علیحدہ کر دیا گیا ہے تو لازمی طور پر ذاتِ الٰہی کا عشق اور اس کا وصل ہی اس کا مقصدِ حیات ہوگا اور جب تک وہ ذاتِ الٰہی میں دوبارہ ہی سہی گم نہ ہو جائے اسے چین نہیں آئے گا۔ فلسفہ جب تصوف میں داخل ہوا اور بات وحدۃ الوجود تک پہنچی تو اس نے صوفیہ کو زندگی کا یہی تصور دیا اور اس کو انھوں نے شرح صدر کے ساتھ قبول کر لیا۔ جب زندگی ہی کا تصور بدل گیا تو مقصدِ زندگی کی تبدیلی لازمی تھی۔ انھوں نے خدا کی عبادت کے

بجائے اس کے عشق اور وصل کو مقصدِ حیات بنا ڈالا۔ یہاں تک کہ بہت سے صوفیہ کو اپنا وجود بھی گناہ نظر آنے لگا۔ وجودک ذنب لا یقاس بہ ذنب (تیرا وجود اتنا بڑا گناہ ہے کہ اس پر کسی دوسرے گناہ کو ناپا نہیں جا سکتا۔)

عشق کی سرمستی اتنی بڑھی کہ عطار کہہ گزرے۔

کافر عشقم مسلمانی مرا درکار نیست — ہر رگ من تار گشتہ حاجت زنار نیست

(میں کافر عشق ہوں مسلمانی سے مجھے کام نہیں، میری ہر رگ تار بن گئی ہے مجھے زنار پہننے کی ضرورت نہیں ہے۔)

ایک اور شاعر نے کہا:

نہ تنہا من دریں میخانہ مستم — جنید و شبلی و عطار ہم مست

سلطان المشائخ حضرت نظام الدین اولیاء رحمۃ اللہ علیہ نے تخلیق بشر کے مقصد کے بارے میں اپنے ایک مرید مولانا فخر الدین مروزی کو اپنے دست مبارک سے لکھے ہوئے ایک خط میں لکھا ہے:

اتفاق اصحاب طریقت و ارباب حقیقت بر آن است کہ اہم مطلوب و اعظم مقصود از خلقت بشر محبت رب العٰلمین است [1]	اصحاب طریقت اور ارباب حقیقت کا اس پر اتفاق ہے کہ انسان کی تخلیق کا اہم مطلوب اور سب سے بڑا مقصد رب العٰلمین کی محبت ہے۔

شیخ ہجوری لاہوری نے کشف المحجوب میں جن وانس کی تخلیق کا مقصد معرفتِ الٰہی قرار دیا ہے اور ان کے نزدیک معرفت کا حاصل محبت ہے لہٰذا محبت الٰہی تخلیق جن وانس کا مقصد قرار پائی۔ یہاں یہ اشارہ کر دینا ضروری ہے کہ کتاب وسنت میں محبت الٰہی کا تصور کچھ اور ہے اور تصوف میں کچھ اور ہے۔ دونوں کے درمیان آسمان وزمین کی دوری ہے۔ تصوف میں اس کا تصور یہ ہے کہ انسان اپنے معشوق

---

[1] شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ اخبار الاخیار مطبوعہ مجتبائی دہلی ص ۹۳

کی ذات میں گم ہو جائے۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے اپنی کتاب ہمعات میں تصوف کے چار دور قرار دیئے ہیں۔ تیسرے دور کی تفصیل بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"دراصل ان بزرگوں کی اصل غایت یہ تھی کہ ذات الٰہی میں اپنے وجود کو گم کر کے اس مقام کی کیفیات سے لذت اندوز ہوں۔"

عہد حاضر کے ایک بزرگ نے لکھا ہے:

"اعلیٰ درجہ کی محبت یہ ہے کہ

تو در و گم شو وصال اینست و بس — گم شدن گم کن کمال اینست و بس[1]

یہ شعر صدیوں سے زیر استعمال ہے جو صوفیہ کی منزل مقصود کی نشان دہی کرتا ہے۔

بزرگان دین کے نزدیک سلوک و طریقت کی بنیاد عشق و محبت پر ہے۔ جس سلوک و طریقت میں محبت الٰہی کی آگ نہ سلگتی ہو اور حب الٰہی کی آتش شعلہ زن نہ ہو، اور جس کے اثرات ظاہر و باطن پر عیاں نہ ہوں وہ طریقت، طریقت ہے اور نہ ایسا سلوک کوئی سلوک۔ ایسی طریقت کے پجاریوں کو اپنے انجام کی فکر کرنی چاہیئے۔[2]

اصحاب شریعت اور اصحاب طریقت کے درمیان فرق کی صراحت کرتے ہوئے پروفیسر یوسف سلیم چشتی نے لکھا ہے:

"اس تصریح سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ ہر صوفی دراصل عاشق ہوتا ہے۔ عشق اور تصوف مترادف الفاظ ہیں۔"[3]

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں ویدانتی تصوف اور یونانی تصوف کے بھی چند اقوال نقل کیے جائیں۔ اپنشدوں میں جو تصوف ہے اس کے چند اقوال یہ ہیں:

(۱) گیان اور دھیان کا اصل مقصد یہ ہے کہ خدا سے وصل نصیب ہو جائے۔

(۲) مقصدِ حیات دیدار ہے جسے دیدار حاصل نہ ہو سکا اس کا جیون اکارت ہو گیا۔

(۳) مقصدِ حیات برہمن کو پانا ہے یعنی اس سے ذاتی اتصال پیدا کرنا اس کیفیت اتصال

---

[1] اصول تصوف ص ۸۴ [2] ایضاً [3] تاریخ تصوف ص ۳

کو بذریعہ الفاظ بیان نہیں کر سکتے، واصل ہو کر دیکھ لو سب کچھ معلوم ہو جائے گا۔ (۴) خدا سے ملنے کے آرزومند ہو؟ خدا کے عاشقوں کی محبت اختیار کرو اس سے ملنے کا دوسرا طریقہ نہیں ہے۔ (۵) عرفانِ حق نہ کتابوں سے حاصل ہو سکتا ہے نہ عقل سے، نہ استدلال سے نہ گفتگو سے نہ مناظرے سے۔ یہ نعمت تو صرف عشق سے حاصل ہوتی ہے۔ (۶) خدا اپنے آپ کو صرف اپنے عاشقوں پر ظاہر کرتا ہے[1]

شنکراچاریہ کا قول یہ ہے:

"دھیان (مراقبہ) یعنی اب دل کی آنکھ سے اس کے درشن کرو۔ کیوں کہ مقصود حیات محض علم خدا نہیں ہے بلکہ دیدارِ خدا ہے یعنی سالک کو براہ راست مشاہدہ ہو جائے کہ کائنات میں اس کے سوا کوئی موجود نہیں ہے[2]

گیتا کہتی ہے کہ یہ عارف ہی انسان کامل کا مصداق ہے اسے مختلف القاب سے یاد کیا گیا ہے۔ مثلاً جوگی (واصل باللہ) بھگت (طالب مولیٰ) جنانی (عارف)[3]

یونانی تصوف بھی کہتا ہے:

(۱) غایت حیات اور کمال مقصود مبدءِ اصلی کی طرف بازگشت ہے اور اس بازگشت کا طریقہ عشق ہے۔ (۲) خدا سے واصل ہونے کا طریقہ عشق ہے[4]

جب زندگی کا تصور اور اس کا مقصد بدل گیا تو لازماً دنیا میں انسان کی حیثیت بھی بدل گئی۔ اس کی حیثیت اللہ کے بندے اور اس کے خلیفہ کی نہ رہی بلکہ اس کے عاشق کی ہو گئی اور خدا اور بندے کے درمیان اصل نسبت عاشق و معشوق کی قرار پا گئی، اس کا نتیجہ یہی نکل سکتا تھا اور یہی نکلا کہ اللہ کی بھیجی ہوئی شریعت زندگی کے چند مخصوص گوشوں میں سمٹ کر رہ گئی۔

قرآن کریم نے جن و انس کی تخلیق کا جو مقصد بتایا ہے اور تمام انبیائے کرام علیہم السلام

---

[1] یوسف سلیم چشتی تاریخ تصوف صـ ۲۲-۲۳ [2] یوسف سلیم چشتی تاریخ تصوف ص ۵۲
[3] ایضاً ص ۶۰-۶۱ [4] ایضاً ص ۸۵

نے جس کی دعوت دی ہے وہ اللہ کا عشق نہیں، بلکہ اس کی عبادت (بندگی) ہے جس کے دائرے سے زندگی کا کوئی شعبہ خارج نہیں ہے اور قرآن نے دنیا میں انسان کی جو حیثیت بتائی ہے وہ اللہ کے عاشق کی نہیں بلکہ اس کے خلیفہ کی ہے جس کا فرض یہ ہے کہ اپنی پوری زندگی میں اپنے مالک کی ہدایات و مرضیات کی پیروی اور دنیا کو ان پر چلانے کی سعی کرے۔ خدا کے بھیجے ہوئے دین پر خود چلے اور دنیا میں اس کو قائم رکھنے یا قائم کرنے کی جدوجہد میں اپنی جان کھپا دے۔ خدا کی طرف بازگشت ہر انسان کی ہوگی خواہ وہ مومن اور خدا کا وفادار ہو یا کافر اور خدا کا باغی ہو۔ اس نے اپنے وفاداروں کے لیے جنت اور باغیوں کے لیے دوزخ تیار کر رکھی ہے۔ یہ ہے دین کا وہ تصور جو قرآن نے ہمیں دیا ہے اور جسے انبیائے کرام نے اپنے قول و عمل سے ہمیں سمجھایا ہے اس لیے جو تصوف اس تصور دین کے مطابق نہیں وہ غیر اسلامی ہے۔

۷۔ مومن اور کافر کے درمیان امتیاز غلط ہے

جس خدا نے تمام انسانوں کو پیدا کیا ہے اور جو سب کا خالق، مالک اور حاکم ہے اور جو رب العلمین، ارحم الراحمین اور احکم الحاکمین ہے اس نے تو انسانوں کے درمیان ایمان و کفر کے لحاظ سے توحید اور شرک کے لحاظ سے، نیکی اور بدی کے لحاظ سے، وفاداری اور غداری کے لحاظ سے اور ظلم و عدل کے لحاظ سے، فرق و امتیاز کیا ہے۔ مومنوں، موحدوں، نیکوں، فرماں برداروں اور منصفوں سے اپنی دوستی کا۔ اور کافروں، مشرکوں، بدوں، نافرمانوں اور ظالموں سے اپنی دشمنی کا اعلان کیا ہے۔ پہلے گروہ کو اولیاء اللہ اور دوسرے گروہ کو اولیاء الشیطان قرار دیا ہے۔ اس نے اپنے آخری نبی و رسول اور ان پر ایمان لانے والوں کو ہدایت دی ہے کہ وہ کافروں اور باغیوں کے سامنے حق پیش کریں۔ دعوتِ حق کو فروغ دینے اور دین حق کو تمام ادیان باطلہ پر غالب کرنے کے لیے جان کھپا دیں، اور جان و مال کی کسی قربانی سے دریغ نہ کریں۔ لیکن وحدۃ الوجود کے حامی اور قائل صوفیہ کہتے ہیں کہ مومن و کافر کے درمیان اس طرح کا امتیاز کرنا غلط ہے۔ کیوں کہ سارے انسان

مظہر ذاتِ الٰہی ہیں۔ ایک ہی باغ کے سب پھول ہیں۔ کوئی صوفی مومن اور کافر کو دو نظروں سے دیکھنے کی تنگ نظری برداشت نہیں کرسکتا۔ وحدۃ الوجود کے حامی و قائل ایک پروفیسر صاحب لکھتے ہیں:

چونکہ ہر شے میں اسی کا جلوہ ہے، ساری کائنات اس کی جلوہ گاہ ہے۔ ہر شے سے وہی ظاہر ہو رہا ہے اس لیے ہر انسان مظہر ذات وصفات ہے اگر ہندو میں اس کا جلوہ ہے تو مسلمان میں بھی وہی جلوہ گر ہے اس لیے صوفی جملہ افراد انسانی کو مظاہر ذات سمجھ کر سب سے یکساں محبت کرتا ہے۔ اسی لیے وہ مسجد کے علاوہ گرجے اور صومعے اور مندر کو بھی عزت کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ اس کے بعد ایک دوہا نقل کرکے اس کی یہ تشریح کی ہے۔

یعنی اے طالب حق! اس بات پر یقین رکھ اور اپنے کو انتشار سے محفوظ رکھ کر کعبے، دیر، ٹھاکر دوارے، مندر اور مسجد۔ ہر معبد میں وہی ایک نور جلوہ گر ہے۔ یعنی لوگوں نے مکانوں کے نام تو ضرور مختلف رکھ لیے ہیں مگر مدعو یا مسجود یا مطلوب یا مقصود یا محبوب سب کا ایک ہی ہے۔[1]

گویا وحدۃ الوجود، وحدت ادیان کی بھی دعوت دیتا ہے۔ پتھر کے بت کو سجدہ کرو یا سورج اور چاند کو، سب سجدے خدا ہی کے ہیں۔ ایک دوسرے پروفیسر صاحب نے اپنے ایک مضمون میں لکھا ہے:

گنگوہ کے شیخ عبدالقدوس ؒ نے اعلان کیا۔ انسانوں کے درمیان اہل ایمان و کافر گنہگار و دیندار، گمراہ و راستی پسند، پاک و ناپاک وغیرہ کی تقسیم بے معنی کیوں ہے؟ سب ایک ہی باغ کے پھول ہیں۔[2]

مولانا روم نے بھی اسی طرح کی بات لکھی ہے۔ "افکار رومی" کے فاضل مولف نے حوالوں کے ساتھ لکھا ہے:

"مولانا مذاہب و ملل کے اختلاف کو محض رستوں کا اختلاف مانتے تھے۔ فرماتے ہیں:

---

[1] یوسف سلیم تاریخ تصوف [2] خلیق نظامی ماہنامہ دارالعلوم دیوبند جنوری ۱۹۸۲ء

کہ ازاں سو جملہ ملت یکے است　　صد ہزاراں سال و یک ساعت یکے است[1]

"افکارِ رومی" میں مولانا روم کے ملفوظات "فیہ ما فیہ" کے حوالے سے لکھا ہے:

"ایمان و کفر کا تفرقہ بھی رستوں تک ہے، منزل پر نہیں۔ سب بحثیں، جھگڑے۔ یہ رستہ غلط، وہ رستہ صحیح، یہ حق پر، وہ باطل پر۔ جب منزل پر پہنچے تو معلوم ہوا کہ سب اختلافات رستے کے تھے اور بس۔ منزلِ مقصود سب کی ایک تھی"[2]

قرآن کریم کی چند آیات

اوپر کے اقوال آپ نے پڑھ لیے۔ اب قرآن کریم کی چند آیات اور بعض احادیث بھی پڑھ لیجیے ــــ میں آیات کے ترجمے دے رہا ہوں۔ آپ قرآن میں الفاظ کی تلاوت بھی کر لیں۔

(الف) کافروں سے دشمنی کا اعلان

قرآن کریم میں متعدد آیتیں ہیں جن میں اعلان کیا گیا ہے کہ خدا اور کافروں کے درمیان دشمنی کی نسبت ہے۔ کفار خدا کے دشمن ہیں اور خدا کفار کا دشمن ہے۔

(۱) جو اللہ، اس کے فرشتوں، اس کے رسولوں اور جبرئیل و میکائیل کے دشمن ہیں ان کافروں کا اللہ دشمن ہے۔　(البقرہ: ۹۸)

(۲) اور ذرا اس وقت کا خیال کرو جب اللہ کے یہ دشمن دوزخ کی طرف لے جانے کے لیے گھیر لائے جائیں گے ان کے اگلوں کو پچھلوں کے آنے تک روک رکھا جائے گا۔

(۳) وہ دوزخ ہے جو اللہ کے دشمنوں کو بدلے میں ملے گی۔ اسی میں ہمیشہ کے لیے ان کا گھر ہوگا۔ یہ ہے سزا اس جرم کی کہ ہماری آیات کا انکار کرتے رہے۔

یہ دونوں آیتیں حٰم السجدہ کی آیت ۱۹ اور ۲۸ ہیں۔ ان دونوں میں کافروں،

---

[1] مولانا عبدالسلام رام پوری، افکارِ رومی ص ۲۰۶۔　[2] ایضاً

مشرکوں کو اَعْدَاءُ اللّٰہِ (خدا کے دشمن) کہا گیا ہے۔

(ب) کون لوگ کس کے دوست ہیں؟

قرآن میں عدو کے مقابلے میں ولی اور اَعداء کے مقابلہ میں اولیاء کے الفاظ آئے ہیں۔ اللہ مومنوں کا دوست ہے اور مومن اللہ کے دوست ہیں۔ شیطان کفار کا دوست ہے اور کفار شیطان کے دوست ہیں۔

(۱) جو لوگ ایمان لائے ہیں ان کا دوست اللہ ہے اور وہ ان کو تاریکیوں سے روشنی میں نکال لاتا ہے اور جو لوگ کفر کی راہ اختیار کرتے ہیں ان کے دوست شیطان ہیں اور وہ انہیں روشنی سے تاریکیوں کی طرف کھینچ لے جاتے ہیں۔ یہ آگ میں جانے والے لوگ ہیں جہاں یہ ہمیشہ رہیں گے۔
(البقرہ: ۲۵۷)

(۲) سنو، اللہ کے اولیاء کے لیے کسی خوف و رنج کا موقع نہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو ایمان لائے اور تقویٰ کا رویہ اختیار کیا (یونس: ۶۲-۶۳)

(ج) کافروں کو دوست اور رفیق بنانے کی ممانعت

(۱) اے لوگو! جو ایمان لائے ہو، میرے اور اپنے دشمنوں کو دوست نہ بناؤ تم ان کے ساتھ دوستی کی طرح ڈالتے ہو، حالانکہ جو حق تمہارے پاس آیا ہے اس کو ماننے سے وہ انکار کر چکے ہیں۔ (الممتحنہ: ۱)

(۲) تم لوگوں کے لیے ابراہیم اور اس کے ساتھیوں میں ایک اچھا نمونہ ہے کہ انھوں نے اپنی قوم سے صاف کہہ دیا۔ ہم تم سے اور تمہارے ان معبودوں سے جن کو تم خدا کو چھوڑ کر پوجتے ہو قطعی بیزار ہیں۔ ہم نے تمہارا انکار کیا اور ہمارے اور تمہارے درمیان ہمیشہ کے لیے عداوت ہو گئی اور بیر پڑ گیا جب تک تم اللہ واحد پر ایمان نہ لاؤ۔ (ایضاً-۴)

(د) شیطان کے دوستوں سے قتال کا حکم

(۱) جن لوگوں نے ایمان کا راستہ اختیار کیا ہے وہ اللہ کی راہ میں لڑتے ہیں اور جنھوں

نے کفر کا راستہ اختیار کیا ہے وہ طاغوت کی راہ میں لڑتے ہیں پس شیطان کے رفیقوں اور دوستوں سے لڑو اور یقین جانو کہ شیطان کی چالیں حقیقت میں نہایت کمزور ہیں۔ (النسار: ۷۶)

(۲) اے نبی! کفار اور منافقین سے جہاد کرو اور ان کے ساتھ سختی سے پیش آؤ۔ ان کا ٹھکانا جہنم ہے اور وہ بہت برا ٹھکانا ہے۔ (التحریم: ۹)

(۵) مومن اور کافر برابر نہیں

(۱) جہنمی اور جنتی کبھی یکساں نہیں ہو سکتے۔ جنت میں جانے والے ہی اصل میں کامیاب ہیں۔ (الحشر)

جیسا کہ اوپر گزرا اللہ سے بغاوت کرنے والوں اور کفر و شرک کی راہ اختیار کرنے والوں کے ناقابل معافی جرم کی وجہ سے اللہ ان کا دشمن ہے اور وہ بھی اللہ کے دشمن ہیں۔ اس لیے اللہ نے ان کے لیے دوزخ تیار کر رکھی ہے جس میں ہمیشہ وہ جلتے رہیں گے اس کے برعکس اللہ نے اپنے مومن وفاداروں کے لیے جنت تیار کر رکھی ہے جس میں ہمیشہ وہ رہیں گے۔ مومن اور کافر کے درمیان یہ سب سے بڑا فرق ہے۔ اس فرق کو کون مٹا سکتا ہے؟

(۲) بھلا کہیں یہ ہو سکتا ہے کہ جو شخص مومن ہو وہ اس شخص کی طرح ہو جائے جو فاسق ہو؟ یہ دونوں برابر نہیں ہو سکتے۔ (السجدہ: ۱۸)

(۳) کیا وہ لوگ جنھوں نے برائیوں کا ارتکاب کیا ہے یہ سمجھے بیٹھے ہیں کہ ہم انھیں اور ایمان لانے والوں اور نیک عمل کرنے والوں کو ایک جیسا کر دیں گے کہ ان کا جینا اور مرنا یکساں ہو جائے بہت برے حکم ہیں جو یہ لوگ لگاتے ہیں۔ (جاثیہ: ۲۱)

کسے خبر تھی کہ مسلمانوں میں بھی اس طرح کا خیال پیدا ہوگا اور وہ بھی ایسے برے حکم لگانے میں کوئی تامل نہیں کریں گے۔ مومن اور کافر کے درمیان عقیدہ و عمل کے لحاظ سے یہ تقسیم اللہ تعالیٰ نے کی ہے اور گنگوہ کے شیخ فرماتے ہیں کہ مومن اور کافر میں یہ تقسیم کیوں؟ سب

ایک ہی باغ کے پھول ہیں۔ گویا ان لوگوں نے اس خدا کو بھی سبق پڑھایا ہے جس کے عشق کا دعویٰ کرتے ہیں۔ مولانا روم اور شیخ گنگوہ وغیرہما کے اقوال نہ صرف یہ کہ غیر اسلامی ہیں بلکہ اسلامی شریعت کے مخالف اور معاند ہیں۔ اخیر میں صرف ایک حدیث کا ترجمہ پیش کرتا ہوں

حضرت امامہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس شخص نے اللہ کے لیے محبت کی اور اللہ کے لیے نفرت کی اللہ کے لیے دیا اور اللہ کے لیے روکا اس نے اپنا ایمان مکمل کر لیا۔ (ابوداؤد و ترمذی)

یہاں موقع بحث کی جہت سے صرف یہ بتانا ہے کہ اللہ کی مخلوق سے جس طرح اللہ ہی کے لیے محبت کی جاتی ہے اسی طرح اللہ ہی کے لیے کسی سے نفرت بھی کی جاتی ہے اور جس طرح کسی کو اللہ کے لیے کچھ دیا جاتا ہے اسی طرح کسی سے اللہ ہی کے لیے کوئی چیز روکی بھی جاتی ہے۔ یہ حدیث بتاتی ہے کہ جب تک مومن میں یہ چاروں باتیں نفسانیت سے ہٹ کر خالصۃً للہ جمع نہ ہو جائیں ایمان کی تکمیل نہیں ہوتی اور جس مومن میں یہ چاروں باتیں جمع ہو جائیں اس نے اپنے ایمان کو مکمل کر لیا۔ اگر کوئی بزرگ یہ فرماتے ہیں کہ اللہ کی مخلوق سے صرف محبت ہی کرنی چاہیئے کسی سے نفرت نہیں کی جانی چاہیئے تو یہ ان کے اپنے ذہن کی خیالی بات ہے۔ اسلام سے اس کا تعلق نہیں ہے۔ اسلام دین فطرت ہے، مصنوعی دین نہیں ہے۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ نفرت برائی سے ہونی چاہیئے بُرے لوگوں سے نہیں۔ اس قول میں جزوی صداقت موجود ہے۔ صحیح بات یہ ہے کہ برے لوگوں سے نفرت ان کی برائی ہی کی وجہ سے ہونی چاہیئے۔ کسی ذاتی مخالفت یا نفسانیت کی بنا پر نفرت نہیں ہونی چاہیئے یہی وجہ ہے کہ کسی شخص سے برائی دور ہو جائے تو نفرت محبت میں بدل سکتی ہے اور بدل جاتی ہے لیکن برے لوگ چونکہ برائی سے متصف ہوتے ہیں اس لیے نفرت کا تعلق ان سے ہو جاتا ہے اور سزا کا تعلق بھی ان کی ذات سے ہو جاتا ہے جو برائی سے متصف ہے۔ دوزخ میں برے لوگ جلائے جائیں گے۔ دنیا میں بھی سزا برے لوگوں کو دی جاتی ہے ان کی برائی کو نہیں۔ مثال کے طور پر زانی کو سزا دی جاتی ہے۔ زنا کو نہیں۔ آپ قرآن کریم کی آیتوں میں

پڑھ آئے کہ اللہ تعالیٰ کافروں کا دشمن ہے اور اس نے اپنے آخری رسولؐ کو کافروں اور منافقوں پر سختی کا حکم دیا تھا۔ کوئی بیٹا اگر اپنے باپ سے گستاخی کرے، اس کو اذیت پہنچائے، اس کی مخالفت پر تل جائے اور اس کی عزت پر حملہ آور ہو تو باپ کو اپنے اس بیٹے سے نفرت ہو جاتی ہے اور بعض اوقات وہ اس کو اپنے ہاتھ سے قتل کر دیتا ہے۔ انسان کی فطرت میں محبت اور نفرت دونوں داخل ہیں جو لوگ صرف محبت کی بات کرتے ہیں وہ اپنے آپ کو اور دوسروں کو فریب خیال میں مبتلا کرتے ہیں۔

۸۔ کائنات میں اولیاء کا تصرف

جس خیال نے مسلم عوام و خواص کو "انسان پرستی" میں مبتلا کیا وہ یہ ہے کہ اولیاء کاملین کو کائنات میں تصرف کا اختیار دے دیا گیا ہے اور دنیا کا نظم و نسق ان کے حوالے کر دیا گیا ہے۔ اس بے دلیل خیال کو کسی نے مجمل اور کسی نے مفصل طور پر لکھا ہے۔ سیدنا الشیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ نے فتوح الغیب میں مجملاً لکھا ہے:

"انسان اللہ کی اطاعت کرتے کرتے اس مقام پر پہنچ جاتا ہے کہ تکوین اس کے سپرد کر دی جاتی ہے"۔ انھوں نے اس کی یہ دلیل پیش کی ہے:

وھو قولہ فی بعض کتبہ یا ابن اٰدم انا اللہ لا الٰہ الا انا اقول لشیئ کن فیکون اطعنی تقول لشیئ کن فیکون۔[1]	اور یہ اللہ کا فرمان ہے اپنی بعض کتابوں میں اے ابن آدم میں اللہ ہوں۔ میرے سوا کوئی الٰہ نہیں ہے۔ میں کسی شے سے کہتا ہوں "ہو جا"، تو وہ ہو جاتی ہے۔ تو میری اطاعت کر پھر تو بھی کسی شے سے کہے گا ہو جا تو وہ ہو جائے گی۔

اس جملے کی شرح میں شیخ عبدالحق رحؒ نے لکھا ہے:

---

[1] فتوح الغیب مع شرح فارسی شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ ۔ مطبوعہ مطبع نامی منشی نول کشور مقالہ ۲۶ ص ۲۷۲

ایں رد تکوین و اعطار تصرف در کائنات و مذکور است بقول حق سبحانہٗ و تعالیٰ در بعض کتابہائے وے کہ بر پیغمبران خود فرستادہ اے فرزند آدم منم خدا، نیست خدا جز من۔ من می گویم چیزے را پیدا شو پس پیدا می شود آں چیز۔ اطاعت و فرماں برداری کن مرا۔ می گوئی تو ہر چیزے را شو پس می شود۔

اور یہ تکوین کا حوالہ کیا جانا اور کائنات میں تصرف کا اختیار دیا جانا ثابت اور مذکور ہے حق سبحانہٗ و تعالیٰ کی بعض ان کتابوں میں جو اس نے اپنے پیغمبروں پر نازل کی ہیں ان میں کہا ہے۔ اے فرزند آدم، میں ہی خدا ہوں، میرے سوا کوئی خدا نہیں ہے میں کسی چیز سے کہتا ہوں، ہو جا تو وہ چیز ہو جاتی ہے میری اطاعت اور فرمانبرداری کر، تو بھی کسی چیز سے کہے گا کہ ہو جا تو وہ ہو جائے گی۔

فتوح الغیب کی عبارت سے اتنا تو معلوم ہوا کہ کسی انسان کو تکوینی اختیارات دینے کا ثبوت قرآن کریم اور احادیث نبوی میں نہیں ہے ورنہ اس کو چھوڑ کر کسی مجہول آسمانی کتاب کا حوالہ نہ دیا جاتا۔ اس کے بعد سوال یہ ہے کہ اتنے اہم معاملہ میں جس کا تعلق توحید و شرک سے ہو کسی مجہول کتاب کی عبارت دلیل بن سکتی ہے؟ خود حضرت شیخ کے اپنے اقوال کی بنا پر بھی نہیں بن سکتی۔ اس میں تو اس کتاب کا حوالہ بھی نہیں ہے جس سے یہ عبارت اخذ کی گئی ہے۔

اس طرح کے بے دلیل خیالات نے ہزاروں لاکھوں مسلمانوں کو توحید کی صراطِ مستقیم سے ہٹا دیا ہے۔ قبر پرستی، اولیاء کے ناموں کی دہائی اور بہت سے مشرکانہ اعمال اسی غلوئے عقیدت کے کڑوے کسیلے پھل ہیں۔ شیخ ہجویری لاہوری (م ۴۶۵ھ) نے یہ وہم و خیال کچھ تفصیل سے پیش کیا ہے۔

خداوند تعالیٰ را اولیاء اند کہ ایشاں را بدوستی و ولایت مخصوص گردانیدہ است و

خداوند تعالیٰ کے اولیاء ہیں جن کو اس نے دوستی اور ولایت کے ساتھ خاص کیا ہے۔ وہ ملک کے والی (حاکم) ہیں جنھیں اس نے

والیان ملک وے اند کہ برگزیدہ است شان را و نشانہ افعال خود گردانیدہ است و بانواع کرامات مخصوص کردہ و آفات طبیعی از ایشاں پاک گردانیدہ و از متابعت نفس و ہوا شان را برہانیدہ تا ہمت شاں جز وے نیست و انس شاں بجز باوے نہ[1]

منتخب کیا ہے اور اپنے فعل کے اظہار کا نشانہ بنایا ہے اور انواع واقسام کی کرامتوں سے ان کو مخصوص کیا ہے اور ان کو طبیعی آفتوں سے پاک کر دیا ہے اور نفس وخواہش کی متابعت سے رہائی دے دی ہے۔ یہاں تک کہ ان کی ہمت صرف اسی کے ساتھ وابستہ ہو گئی ہے اور اس کے سوا کسی دوسرے سے ان کو کوئی انس باقی نہیں رہا ہے۔

یعنی وہ زمینی نہیں بلکہ آسمانی مخلوق بن گئے ہیں۔ آگے اولیاء کی شان میں مزید فرمایا گیا ہے:

"آسمان سے پانی ان کے قدموں کی برکت سے برستا ہے اور زمین سے نباتات ان کے احوال کی صفائی سے اُگتے ہیں اور مسلمانوں نے کافروں پر فتح انہیں کی ہمت سے پائی ہے۔"[2]

ابھی بات پوری نہیں ہوئی اس لیے مزید ارشاد ہے:

اولیاء حق تعالیٰ مدبران ملک اندو مشرفان عالم و خداوند تعالیٰ مرایشاں را والیان عالم گردانیدہ است و حل و عقد آں بدیشاں بازبستہ واحکام عالم را موصول ہمت ایشاں گردانیدہ است[3]

خداوند تعالیٰ کے اولیاء ملک کے مدبر ہیں اور عالم کے نگراں اور خداوند تعالیٰ نے خاص طور پر ان کو عالم کا والی (حاکم) گردانا ہے اور عالم کا حل وعقد ان کے ساتھ وابستہ کر دیا ہے اور احکام عالم کو ان ہی کی ہمت کے ساتھ جوڑ دیا ہے۔

قرآن کہتا ہے کہ مشرکین عرب اللہ ہی کو ملک کا مدبر سمجھتے اور مانتے تھے کسی اور

---

(۱) تصوف کی تین اہم کتابیں، بحوالہ کشف المحجوب ص ۱۵۷، (۲) ایضاً ص ۱۵۸ (۳) ایضاً ص ۱۷۵

کو نہیں، ان کا جرم یہ تھا کہ فرشتوں اور دوسروں کو انھوں نے خدا کی بارگاہ میں پر زور شفاعت کا حق دار تسلیم کر لیا تھا اور اسی لیے ان کو پوجتے تھے۔ فلسفیانہ تصوف کہتا ہے کہ اولیاء سلطنتِ الٰہی کے مدبر ہیں اور عالم کا حل و عقد اللہ نے انہیں کے حوالے کر دیا ہے۔ (نعوذ باللہ من ذالک) اب اگر لوگ اولیاء کی دہائی دے رہے ہیں اور ان کی قبروں کو پوج رہے ہیں تو ان کے اس شرک کا سبب کیا ہے اور کون ہے؟ جب اولیاء کا مقام یہ ہے تو ان کی معصومیت کا خیال تو کم درجے کی چیز ہے کیوں کہ مدبر کائنات ہونے کا مقام تو انبیاء کرام علیہم السلام کو بھی حاصل نہ تھا۔

مخدوم شیخ شرف الدین یحییٰ منیری رحمۃ اللہ علیہ (۷۸۲ھ) نے لکھا ہے:

"اب ان ایمان والے صدیقوں کا حال سنو، اور اپنی ناقص عقل سے ان کے متعلق رائے زنی نہ کرو۔ کیوں کہ یہ وہ بزرگانِ دین ہیں کہ دنیا کا نظم و نسق انہیں کے قدموں کے نیچے ہے اور دین کا استحکام ان کے قبضۂ اختیار میں ہے۔ مغربی و مشرقی دنیا ان کے حکم و فرمان کے تابع ہے۔"[۱]

شیخ احمد سرہندی رحمۃ اللہ علیہ (م ۱۰۳۵ھ) نے علماء راسخین یا بلند درجہ صوفیہ کے مراتب و مقامات بہت تفصیل سے لکھے ہیں۔ ان میں شاید سب سے اونچا مقام "قیومیت" کا ہے۔ انسان کو اللہ تعالیٰ کی جو خلافت ملی اور اس نے جو بار امانت قبول کیا وہ ان کے نزدیک تمام اشیاء کی قیومیت ہے۔ ان کے خیال میں سب سے پہلے حضرت آدم علیہ السلام مقام قیومیت پر فائز ہوئے تھے۔ قیومیت کا یہ مقام کیا ہے؟ یہ خود حضرت شیخ سرہندی کے الفاظ میں پڑھیے۔

وآں امانت بزعم ایں حقیر	اور وہ امانت اس حقیر کے گمان میں
قیومیت جمیع اشیاء است بر سبیل	تمام اشیاء کی قیومیت ہے جو بر سبیل نیابت
نیابت کہ مخصوص بہ کمل افراد	انسان کے کامل افراد کے ساتھ مخصوص ہے

---

[۱] مکتوبات صدی مکتوب ۸۰، ص ۵۲۶

انسان است یعنی معاملۂ انسان بجائے می رسد کہ اورا قیوم جمیع اشیاء بحکم خلافت می سازند وہمہ را افاضۂ وجود و بقائے سائر کمالات ظاہری و باطنی بتوسط او رسانند اگر ملک ست باو متوسل است و اگر جن وانس است باو متشبث و فی الحقیقت توجہ جمیع اشیاء بجانب او است وہمہ نگران اواند[1]

یعنی انسان کامل کا معاملہ اس مقام تک پہنچ جاتا ہے کہ بحکم خلافت اس کو تمام اشیاء کا قیوم بنا دیتے ہیں اور سب کو وجود کا فیض اور تمام ظاہری و باطنی کمالات کی بقا اسی کے توسط سے پہنچاتے ہیں۔ اگر فرشتہ ہے تو اسی سے متوسل ہے اور اگر جن و انس ہے تو اسی کا دامن تھامے ہوئے ہے اور فی الحقیقت تمام اشیاء کی توجہ اسی کی طرف ہے اور سب اسی کو دیکھ رہے ہیں۔

شیخ احمد سرہندیؒ نے اس کو اپنا "زعم" قرار دیا ہے۔ افسوس ہے کہ یہ زعم قرآن کے خلاف ہے۔ یہ محض تخیل کی پرواز ہے جس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

"قیومیت" وہی چیز ہے جس کو پہلے کے صوفیہ "غوثیت" کہتے آئے ہیں۔

"سید احمد کبیر رحمۃ اللہ علیہ نے شیخ عبداللہ مطریؒ سے استفسار کیا کہ فرمائیے۔ افراد، ابدال، غوث، قطب وغیرہ کے مدارج میں کیا فرق ہے اور ان کی تعداد کس قدر ہوا کرتی ہے۔ شیخ نے فرمایا۔ بھائی جان ہر ایک زمانہ میں دنیا بھر کا غوث صرف ایک ہوتا ہے۔ عرش سے لے کر فرش تک تمام مخلوق پر خداوند کریم اسے تصرف عطا کرتا ہے اور تمام اولیاء قطب، اخیار، نجیب، نقیب، ابدال، اوتار وغیرہ کو اس غوث کی خدمت و اطاعت کا ارشاد ہوتا ہے، ان کا عزل و نصب، ترقی اور تنزل محض اس کے تصرف میں ہوتا ہے۔ غوث زماں ان کی تعلیم و ارشاد میں کوتاہی نہیں کرتا اور یہ سب موخر الذکر بزرگوار اسی سے شریعت و طریقت

---

[1] ماہنامہ زندگی جنوری ۱۹۸۰ بحوالہ مکتوب ۳، ج ۲ مکتوبات امام ربانی

اور "حقیقت" کا علم حاصل کرتے ہیں۔ اسی غوث کی وجہ سے تمام برکات، اور رحمتوں کا نزول ہوتا ہے۔ بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ نظام کائنات اسی غوث کے دم قدم سے ہے[۱]

یہ افترا د علی اللہ کی وہ قسم ہے جس سے مشرکین عرب بھی واقف نہ تھے۔ قُلْ هَاتُوا بُرْهَانَكُمْ إِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ○

بہتر معلوم ہوتا ہے کہ کائنات میں تصرف کے اس زعم باطل کی تردید کے لیے وہ عبارتیں پیش کر دی جائیں جو شاہ اسمٰعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب "تقویۃ الایمان" میں لکھی ہیں۔ ایک جگہ وہ لکھتے ہیں:۔

"پھر اگر کوئی سمجھانے والا ان لوگوں سے کہے کہ تم دعوی ایمان کا رکھتے ہو اور افعال شرک کے کرتے ہو، سو یہ دونوں راہیں ملائے دیتے ہو تو اس کا جواب یہ دیتے ہیں کہ ہم تو شرک نہیں کرتے بلکہ اپنا عقیدہ انبیاء و اولیاء کی جناب میں ظاہر کرتے ہیں۔ شرک جب ہوتا ہے کہ ہم ان انبیاء و اولیاء کو، پیروں و شہیدوں کو اللہ کے برابر سمجھتے، سو یوں تو ہم نہیں سمجھتے بلکہ ہم ان کو اللہ ہی کا بندہ جانتے ہیں اور اس کی مخلوق، اور یہ قدرت تصرف اسی نے ان کو بخشی ہے۔ اس کی مرضی سے عالم میں تصرف کرتے ہیں اور ان کا پکارنا عین اللہ ہی کا پکارنا ہے اور ان سے مدد مانگنی عین اسی سے مدد مانگنی ہے اور وہ لوگ اللہ کے پیارے ہیں جو چاہیں سو کریں اور اس کی جناب میں ہمارے سفارشی ہیں اور وکیل، ان کے ملنے سے خدا ملتا ہے اور ان کے پکارنے سے اللہ کا قرب حاصل ہوتا ہے اور جتنا ہم ان کو جانتے ہیں اتنا ہم اللہ سے نزدیک ہوتے ہیں اور اسی طرح کی خرافاتیں بکتے ہیں اور ان باتوں کا سبب یہ

---

[۱] تذکرہ حضرت بہاءالدین زکریا ملتانی ص ۱۹-۲۰

ہے کہ خدا اور رسولؐ کے کلام کو چھوڑ کر اپنی عقل کو دخل دیا اور جھوٹی کہانیوں کے پیچھے پڑے اور غلط غلط رسموں کی سند پکڑی اور اگر اللہ و رسول کا کلام تحقیق کرتے تو سمجھ لیتے کہ پیغمبرِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے بھی کافر لوگ ایسی باتیں کرتے تھے۔ اللہ صاحب نے ایک نہ مانی اور ان پر غصہ کیا اور ان کو جھوٹا بتایا۔[1]

اس عبارت میں تقریباً وہ تمام دلائل آگئے ہیں جو کائنات میں اولیاء کے تصرف کے بارے میں دیئے جاتے ہیں۔

اب آیت قرآنی کی تفسیر کے طور پر ان کی عبارتیں پڑھیے۔ سورۂ المؤمنون کی آیت پیش کر کے لکھا ہے:

قُلْ مَنْ بِیَدِهٖ مَلَکُوْتُ کُلِّ شَیْءٍ وَّهُوَ یُجِیْرُ وَلَا یُجَارُ عَلَیْهِ اِنْ کُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝ سَیَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ ؕ قُلْ فَاَنّٰی تُسْحَرُوْنَ ۝

کہہ کون ہے وہ شخص جس کے ہاتھ میں ہے تصرف ہر چیز کا اور وہ حمایت کرتا ہے اور اس کے مقابل کوئی حمایت نہیں کر سکتا جو تم جانتے ہو سو وہی کہہ دیں گے کہ اللہ ہے۔ کہہ پھر کہاں سے خبطی ہو جاتے ہو۔

ف یعنی جب کافروں سے بھی پوچھیے کہ سارے عالم میں تصرف کس کا ہے اور اس کے مقابل کوئی حمایتی کھڑا نہ ہو سکے تو وہ بھی یہی کہیں گے کہ یہ اللہ ہی کی شان ہے پھر اوروں کو ماننا محض خبط ہے۔

ف۔ اس آیت سے معلوم ہوا کہ اللہ صاحب نے کسی کو عالم میں تصرف کرنے کی قدرت نہیں دی اور کوئی کسی کی حمایت نہیں کر سکتا اور یہ بھی معلوم ہوا کہ پیغمبر خدا کے وقت میں کافر بھی اپنے بتوں کو اللہ کے برابر نہیں جانتے تھے بلکہ اسی کا مخلوق اور بندہ سمجھتے تھے۔

---

[1] تقویۃ الایمان مع تذکیر الاخوان، ناشر راشد کمپنی دیوبند ص ۱

اوران کو اس کے مقابل کی طاقت ثابت نہیں کرتے تھے مگر یہی پکارنا اور منتیں ماننی اور نذر و نیاز کرنی اور ان کو اپنا وکیل اور سفارشی سمجھنا یہی ان کا کفر و شرک تھا سو جو بھی کوئی کسی سے یہ معاملہ کرے گو کہ اس کو اللہ کا بندہ اور مخلوق ہی سمجھے سو ابوجہل اور وہ شرک میں برابر ہے۔ سو سمجھنا چاہیئے کہ شرک اسی پر موقوف نہیں کہ کسی کو اللہ کے برابر سمجھے اور اس کے مقابل جانے بلکہ شرک یہ بھی ہے کہ جو چیزیں اللہ نے اپنے واسطے خاص کی ہیں اور اپنے بندوں کے ذمے نشان بندگی کے ٹھیرائے ہیں وہ چیزیں کسی اور کے واسطے کرنی جیسے سجدہ کرنا اور اس کے نام کا جانور کرنا اور اس کی منت ماننی اور مشکل کے وقت پکارنا اور ہر جگہ حاضر و ناظر سمجھنا اور قدرت تصرف کی ثابت کرنا سو ان باتوں سے شرک ثابت ہو جاتا ہے گو کہ پھر اللہ ہی سے چھوٹا سمجھے اور اس کا مخلوق اور اسی کا بندہ اور اس بات میں اولیاء و انبیاء میں اور جن و شیطان میں اور بھوت و پری میں کچھ فرق نہیں یعنی جس سے کوئی یہ معاملہ کرے گا مشرک ہو جاوے گا۔ خواہ انبیاء و اولیاء سے خواہ پیروں و شہیدوں سے خواہ بھوت و پری سے[1]

وہ آگے لکھتے ہیں :-

"دوسری بات یہ کہ عالم میں ارادہ سے تصرف کرنا اور اپنا حکم جاری کرنا اور اپنی خواہش سے مارنا اور جلانا، روزی کی کشائش اور تنگی کرنی اور تندرست و بیمار کر دینا، فتح و شکست دینی، اقبال و ادبار دینا، مرادیں پوری کرنی، حاجتیں بر لانی، بلائیں ٹالنی، مشکل میں دستگیری کرنی، برے وقت میں پہنچنا، یہ سب اللہ کی شان ہے اور کسی انبیاء و اولیاء کی، پیر و شہید کی، بھوت و پری کی یہ شان نہیں۔ جو کوئی کسی کا ایسا تصرف ثابت کرے اور اس سے مرادیں مانگے اور اس توقع پر نذر و نیاز کرے اور اس کی منتیں مانگے اور اس کو مصیبت کے وقت پکارے، سو وہ مشرک ہو جاتا ہے

---

[1] ایضاً ص ۷-۸

اور اس کو اشراک فی التصرف کہتے ہیں یعنی اللہ کا سا تصرف ثابت کرنا محض شرک ہے پھر خواہ یوں سمجھے کہ ان کاموں کی طاقت ان کو خود بخود ہے یا یوں سمجھے کہ اللہ نے ان کو ایسی طاقت بخشی ہے ہر طرح شرک ثابت ہوجاتا ہے [۱]

سورۂ النحل کی ایک آیت

وَيَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللّٰهِ مَا لَا يَمْلِكُ لَهُمْ رِزْقًا مِّنَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ شَيْئًا وَّلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ

اور پوجتے ہیں وے اللہ کے ایسوں کو کہ نہیں اختیار رکھتے ان کی روزی کا آسمانوں سے اور نہ زمین سے کچھ اور نہیں طاقت رکھتے ۔

ف ۔ یعنی اللہ کی سی تعظیم کرتے ہیں ایسے لوگوں کی کہ ان کا کچھ اختیار نہیں اور ان کی روزی پہنچانے میں کوئی دخل نہیں رکھتے، نہ آسمانوں سے مینھ برساویں، نہ زمین سے کچھ اگادیں اور ان کو کسی نوع کی قدرت نہیں ۔ اس آیت سے معلوم ہوا کہ یہ جو بعضے عوام الناس کہتے ہیں کہ انبیاء و اولیاء یا امام و شہیدوں کو عالم میں تصرف کرنے کی قدرت تو ہے لیکن اللہ کی تقدیر پر وہ شاکر ہیں اور اس کے ادب سے دم نہیں مارتے ۔ اگر چاہیں تو ایک دم میں الٹ پلٹ کر دیں لیکن شرع کی تعظیم کرکے چپ بیٹھے ہیں سو یہ بات سب غلط ہے بلکہ کسی کام میں نہ بالفعل ان کو دخل ہے نہ اس کی طاقت رکھتے ہیں [۲]

قرآن کریم کی آیتوں کے بعد دو حدیثیں اور ان کی تشریح بھی پڑھ لیجیے ۔

اخرج الترمذی عن انس رضی اللہ عنہ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لیسئل احدکم ربہ حاجتہ کلھا حتی یسئل الملح وحتی یسئلہ شسع نعلہ اذا انقطع

مشکوٰۃ کی کتاب الدعوات میں لکھا ہے کہ ترمذی نے ذکر کیا کہ انس نے نقل کیا کہ پیغمبر خدا نے فرمایا کہ ہر کسی کو چاہیے کہ اپنی سب حاجت کی چیزیں اپنے رب سے مانگے حتیٰ کہ نمک اسی سے مانگے اور جوتے کا تسمہ جب ٹوٹ جائے تو اسی سے مانگے ۔

---

[۱] ایضاً ص ۹ [۲] ایضاً ص ۲۵

ف۔ یعنی اللہ صاحب کو دنیا کے بادشاہوں کی طرح نہ سمجھے کہ بڑے بڑے کام تو آپ کرتے ہیں اور چھوٹے چھوٹے کام اور نوکروں اور چاکروں کو حوالے کر دیتے ہیں سو لوگوں کو چھوٹے چھوٹے کام اور ان کی التجا کرنی ضرور پڑتی ہے۔ سو اللہ کے یہاں کارخانہ یوں نہیں بلکہ وہ ایسا قادر مطلق ہے کہ ایک ہی آن میں کروڑوں کام چھوٹے اور بڑے درست کر سکتا ہے اور اس کی سلطنت میں کسی کی قدرت نہیں۔ سو چھوٹی چیز بھی اسی سے مانگنی چاہیے کیوں کہ اور کوئی نہ چھوٹی چیز دے سکتا ہے نہ بڑی ۔[1]

اخرج الشیخان عن عمر قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لا تطرونی کما اطرت النصاریٰ عیسی بن مریم فانما انا عبدہٗ فقولوا عبد اللہ ورسولہٗ ۔

مشکوٰۃ کے باب المفاخر میں لکھا ہے کہ بخاری و مسلم نے ذکر کیا کہ پیغمبر خدا نے فرمایا کہ مجھ کو حد سے مت بڑھاؤ جیسا کہ عیسیٰ بن مریم کو نصاریٰ نے حد سے بڑھا دیا۔ سو میں تو اس کا بندہ ہی ہوں یہی کہو کہ اللہ کا بندہ ہے اور اس کا رسول ۔

ف۔ جو خوبیاں اور کمالات اللہ نے مجھ کو بخشے ہیں سو بیان کرو وہ سب رسول کہہ دینے میں آجاتے ہیں کیوں کہ بشر کے حق میں رسالت سے بڑا کوئی مرتبہ نہیں اور سارے مراتب اس سے نیچے ہیں مگر آدمی رسول ہو کر آدمی ہی رہتا ہے اور بندہ ہی ہونا اس کا فخر ہے کچھ اس میں خدا کی شان نہیں آجاتی اور خدا کی ذات میں نہیں مل جاتا۔ سو یہ بات کسی بندہ کے حق میں نہ کہنا چاہیے کہ نصاریٰ ایسی ہی باتیں حضرت عیسیٰ کے حق میں کہہ کر کافر ہو گئے اور اللہ کی درگاہ سے راندے گئے سو اسی لیے پیغمبر خدا نے اپنی امت کو فرمایا کہ تم نصاریٰ کی چال نہ چلو اور اپنے پیغمبر کی تعریف میں حد سے مت بڑھو کہ کہیں نصاریٰ کی طرح مردود نہ ہو جاؤ لیکن افسوس کہ ان کی امت کے بے ادب لوگوں نے ان کا حکم نہ مانا اور آخر نصاریٰ کی سی باتیں کہنے لگے کیوں کہ نصاریٰ بھی حضرت عیسیٰ کو یہی کہتے تھے کہ اللہ ان کے بھیس میں ظاہر ہوا اور وہ ایک طرح سے انسان ہیں اور ایک طرح

---

[1] ایضاً ص ۳۱

سے خدا۔ سو بعینہٖ یہی بات بعضوں نے حضرت کی شان میں کہہ ڈالی۔[۱]

ایک اور جگہ لکھتے ہیں :۔

" بلکہ بعض جھوٹے دغابازوں نے اس بات کو خود پیغمبرِ خدا کی طرف نسبت کیا ہے کہ انھوں نے خود فرمایا ہے۔ انا احمد بلا میم اور اسی طرح ایک بڑی سی عبارت بنا کر اور اس میں ایسی خرافاتیں جمع کر کے اس کا نام خطبہ " الافتخار رکھا ہے اور اس کو حضرت علیؓ کی طرف نسبت کیا ہے۔ سبحٰنک ھذا بھتان عظیم۔ اللہ سارے جھوٹوں کا منھ کالا کرے۔"[۲]

میں نے بالقصد یہ طویل اقتباسات دیے ہیں اس لیے کہ ان میں توحید کی وہ تعلیم پیش کی گئی ہے جو قرآن و حدیث میں ہے۔ اب ان آیات و احادیث سے مدلل عبارات کو پڑھیے اور اوپر صوفیہ کے دعاوی کو پڑھیے اور دونوں کو ملا کر نتیجہ نکالیے اسلام اس لیے آیا تھا کہ اللہ کے بندوں کو دوسری بہت سی چوکھٹوں سے ہٹا کر ایک چوکھٹ، الٰہ واحد اور رب واحد کی چوکھٹ پر جھکائے لیکن فلسفیانہ غیر اسلامی تصوف نے دوبارہ مسلمانوں کو ایک چوکھٹ سے ہٹا کر بہت سی چوکھٹوں پر جھکا ڈالا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون ○

سورۂ یونس آیت ۳۱ میں صراحت ہے کہ مشرکین عرب بھی اللہ تعالیٰ ہی کو مدبر کائنات مانتے تھے وہ اس شرک میں مبتلا نہ تھے کہ رب کائنات اپنے کسی مقرب بندے کو کائنات کی تدبیر حوالہ کر دیتا ہے۔ آیت کا ترجمہ یہ ہے :

" ان سے پوچھو، کون تم کو آسمان و زمین سے روزی دیتا ہے؟
یا کون ہے جو سمع اور بصر پر اختیار رکھتا ہے؟ اور کون ہے جو زندہ کو مردہ سے اور مردہ کو زندہ سے نکالتا ہے جو ساری کائنات کا انتظام فرماتا ہے؟ تو جواب دیں گے، اللہ، تو ان سے کہو کہ کیا تم اللہ سے ڈرتے نہیں ہو؟" (یونس : ۳۱)

---

[۱] ایضاً [۲] ایضاً ص ۵۲-۵۴

۹۔ دین اسلام کی تقسیم

دین اسلام وہ جامع اور ہمہ گیر دین ہے جس کے دائرے میں پوری انسانی زندگی داخل ہے وہ انسان کے ظاہر کو بھی درست کرتا ہے، اس کے باطن کا بھی تزکیہ کر کے اس کو صاف ستھرا بناتا ہے اور ہر طرح کے حسنات وکمالات سے آراستہ کرتا ہے لیکن یہ بات اس تصوف کو گوارا نہ تھی جس میں غیر اسلامی نظریات وخیالات وعقائد کی آمیزش ہوگئی تھی اور اسلام اس آمیزش اور ملاوٹ کا ساتھ نہیں دے سکتا تھا اس لیے صوفیہ کو اسے دو حصوں میں تقسیم کرنا پڑا اور انھوں نے اس کے دو ٹکڑے کر ڈالے۔ ایک حصہ ظاہر کا اور ایک حصہ باطن کا۔ ظاہر کا نام شریعت رکھا اور باطن کا نام "حقیقت" ——— شریعت کو فقہار کے حوالے کیا اور حقیقت کو صوفیہ نے اپنے لیے خاص کر لیا۔ شریعت کے محافظ فقہار محدثین اور مفسرین کے لیے عام طور سے اہل ظاہر یا اصحاب ظواہر اور بعض لوگوں نے فقہار کے لیے اصحاب استدلال اور عرفار واولیار کے لیے اہل حقیقت واصحاب وصال کی اصطلاح وضع کی۔

العلماء ورثة الانبیاء (علمار انبیار کے وارث ہیں) کی حدیث اس تقسیم کے خلاف جارہی تھی اس لیے صوفیہ نے کہا کہ وراثتِ انبیار در اصل اس علم حقیقت کا نام ہے جس کے حامل صوفیہ ہیں، اب علمائے شریعت کے پاس صرف شریعت کے ظاہری احکام رہ گئے" اللہ اللہ خیر سلا۔ مخدوم بہاری (م ۷۸۲) نے اس ذیل کی متعدد باتیں بڑی صفائی سے لکھی ہیں۔

"شریعت کو بندے کے افعال سے تعلق ہے، حقیقت خدا کی ذات پاک سے وابستہ ہے۔"

گویا شریعت کو خدا کی ذات پاک سے تعلق نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے اہل حقیقت اور صاحب شریعت کی دو قسمیں بنائی ہیں۔

"اب ہم صاف صاف یہی کہیں گے کہ بغیر شریعت ورزی اہل حقیقت

ہونے کا دعویٰ کرنا سراسر زندیقیت ہے اور حقیقت سے بے خبر رہ کر صاحب شریعت بن جانا شانِ منافقانہ ہے۔ دراصل دونوں لازم و ملزوم ہیں۔"

مطلب یہ ہے کہ جو لوگ شریعت کے احکام پر عمل نہیں کرتے اور اہلِ حقیقت ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں وہ زندیق ہیں اور جو لوگ حقیقت سے بے خبر رہ کر صاحبِ شریعت بن جاتے ہیں ان میں شان منافقت پائی جاتی ہے۔ اس کے ساتھ یہ بھی فرماتے ہیں کہ دونوں یعنی شریعت اور حقیقت دراصل لازم و ملزوم ہیں۔ لازم و ملزوم ہونے کے معنیٰ یہ ہیں کہ شریعت و حقیقت ایک دوسرے سے علیحدہ نہیں ہو سکتیں اسی لیے انھوں نے حقیقت سے بے خبر صاحبان شریعت میں منافقت کی شان دیکھی ہے۔ گویا علمائے ظاہر اہلِ حقیقت صوفیہ کے نزدیک حقیقی اور مخلص مسلمان بھی نہیں ہیں۔

"اس علم وراثت یعنی علم حقیقت کی بدولت ان بزرگانِ دین کے اعمال و اقوال و احوال میں ایسا نمایاں تغیر نظر آتا ہے کہ علمائے ظاہر دنگ ہو کر رہ جاتے ہیں اور یہ باتیں ان کی سمجھ سے باہر ہوتی ہیں اپنے مقام کی رو سے کتابوں کو الٹ پلٹ کر دیکھتے ہیں، ان باتوں کا کہیں نشان نہیں پاتے حیران ہو کر انکار کر بیٹھتے ہیں اور بول اٹھتے ہیں کہ یہ بات خلاف روایت ہے، اس کا کہیں وجود نہیں۔"

مطلب یہ ہے کہ علم وراثت، علم حقیقت ہی کا نام ہے جس کے حامل بزرگانِ دین ہیں۔ علمائے ظاہر چونکہ علم وراثت سے خالی ہیں۔ اس لیے بزرگانِ دین کی باتیں ان کی سمجھ سے باہر ہوتی ہیں۔

"اولیاء مقربین کے الہامات و مکاشفات غلط نہیں ہوتے وہ جو کچھ کہتے ہیں صحیح کہتے ہیں ان کی جو باتیں کتاب و سنت کے خلاف نظر آتی ہیں یہ کج فہمی کی وجہ سے ہے۔"

یہ ہے بزرگانِ دین کا وہ ذریعۂ علم جس سے علمائے ظاہر محروم ہیں۔ اسی لیے مخدوم بہاری

نے صاف صاف فرمایا ہے کہ :

"موحدانِ حقیقی کے نزدیک جتنے ظاہر بیں ہیں وہ سب احوال روزگار ہیں۔"[1]

مطلب یہ ہے کہ علمائے ظاہر، احول ہیں۔ احول اس بیمار چشم آدمی کو کہتے ہیں جو ایک کو دو دیکھتا ہے۔ "موحدانِ حقیقی" سے مراد وہ لوگ ہیں جو کائنات میں ایک ہی وجود دیکھتے ہیں اور اسی لیے اپنے آپ کو موحدِ حقیقی کہتے ہیں۔

شریعت اور حقیقت کی اس تقسیم کو شیخ سرہندی نے اس طرح بیان کیا ہے کہ انھوں نے دین کو دو قسموں میں تقسیم کر دیا ہے۔ احکامِ شرعیہ۔ امورِ دینیہ۔ احکام شرعیہ کا تعلق ظاہر سے ہے اور امور دینیہ کا تعلق باطن سے ہے۔ دوسری جگہ انھوں نے یہ تقسیم علم الاحکام اور علم الاسرار کے الفاظ سے کی ہے۔ ایک مکتوب میں علمار ظواہر پر تنقید کرتے ہوئے حضرت سرہندی رحمۃ اللہ علیہ نے تحریر فرمایا ہے :

علمارِ ظواہر در امور دین غیبیہ را مخصوص باخبار پیغمبراں می دانند علیہم الصلوات والتسلیمات و دیگراں را در آں اخبار شرکت نمی دہند۔ ایں معنے منافی وراثت است و نفی است مر بسیارے از علوم و معارف صحیحہ کہ بدیں متین تعلق دارند آری احکام شرعیہ مربوط بادلہ اربعہ است کہ الہام را درآں گنجائش نیست اما امور دینیہ ماورائے احکام شرعیہ بسیار است کہ اصل خامس درآں الہام بلکہ تواں گفت

علمارِ ظواہر امور دین میں اخبار غیبیہ کو انبیاء علیہم السلام کی دی ہوئی خبروں کے ساتھ مخصوص جانتے ہیں اور اخبار غیبیہ میں دوسرے لوگوں کی شرکت تسلیم نہیں کرتے۔ یہ بات منافی وراثت ہے اور ان بہت سے علوم و معارف صحیحہ کی نفی ہے جو دین متین سے تعلق رکھتے ہیں۔ البتہ احکام شرعیہ چار دلیلوں کے ساتھ مربوط ہیں وہاں الہام کی گنجائش نہیں ہے لیکن امور دینیہ احکام شرعیہ کے ماورا بہت ہیں، ان میں الہام پانچویں اصل ہے بلکہ کہا جا سکتا ہے کہ کتاب و سنت کے بعد تیسری اصل الہام ہے۔ یہ اصل

---

[1] یہاں مخدوم بہاری کی جو عبارتیں پیش کی گئی ہیں وہ مکتوباتِ صدی مکتوب ۲۶ سے ماخوذ ہیں۔

کہ اصل ثالث الہام است بعد کتاب و سنت ایں اصل تا انقراض عالم برپا است[1] تا قیامت باقی ہے۔

مطلب یہ ہے کہ جن علماء کو انبیاء کا وارث قرار دیا گیا ہے اگر اخبار غیبیہ میں انبیاء کے ساتھ ان کی شرکت تسلیم نہ کی جائے تو یہ بات نہ صرف یہ کہ منافی وراثت انبیاء ہے بلکہ بہت سے علوم اور معارف صحیحہ کی نفی ہے جن کا دین متین سے تعلق ہے، اس کے بعد شیخ سرہندی نے احکام شرعیہ اور امور دینیہ کی تقسیم کر کے امور دینیہ میں الہام کو پانچویں اصل بلکہ تیسری اصل قرار دیا ہے۔ شرعی دلیلیں چار ہیں۔ کتاب و سنت۔ اجماع۔ قیاس۔ امور دینیہ میں شیخ سرہندی نے ایک اور اصل یا دلیل کا اضافہ کیا ہے اور وہ ہے الہام۔

میں دین کے اس تیا پانچہ پر آگے گفتگو کروں گا۔ یہاں لطیفہ کے طور پر ایک بہت بڑے بزرگ شیخ علی بن عثمان ہجویری، لاہوری کا الہام کے بارے میں اظہار خیال ملاحظہ کیجئے جن لوگوں نے "الہام" کو معرفت الہٰی کی علت قرار دیا ہے ان کی تردید کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> "صحیح اور غلط معرفت کے لیے برہان موجود ہے اور اہل الہام کے پاس صحیح اور غلط الہام کے لیے کوئی دلیل (برہان) نہیں ہوتی۔ مثلاً ایک شخص یہ کہتا ہے کہ مجھے الہام ہوا ہے کہ خدا مکان کے اندر ہے اور دوسرا کہتا ہے کہ خدا کے لیے کوئی مکان نہیں ہے۔ لامحالہ ان دو متضاد دعووں میں کسی ایک ہی کا دعویٰ صحیح ہوگا اور دونوں الہام کے مدعی ہیں اس بنا پر کسی ایک دلیل کی ضرورت ہوگی جو ان دونوں دعووں کے سچ اور جھوٹ ہونے کے درمیان فرق کرے ـــــ معلوم ہوا کہ الہام کی بنا پر کوئی حکم لگانا باطل ہے اور یہ قوم برہمنوں اور الہامیوں کا ہے اور اس زمانے میں میں نے دیکھا کہ ایک قوم اس میں بہت غلو رکھتی ہے، یہ لوگ اپنا ظاہر متقیوں کی طرح بنائے رکھتے ہیں حالانکہ سب گمراہ ہیں اور ان کا قول تمام عقلاء کے مخالف ہے۔

---

[1] مکتوبات امام ربانی مکتوب ۵۵ جلد ۲ مطبوعہ نول کشور

کیونکہ دس مدعیان الہام دس متضاد دعوے کرتے ہیں ایک ہی مسئلے میں ـــــ اور وہ تمام دعوے باطل ہوتے ہیں اور ان میں کوئی حق پر نہیں ہے۔ اگر کوئی شخص یہ کہے کہ جو چیز خلاف شرع ہو وہ الہام نہیں ہے تو میں کہوں گا کہ تم نے معرفت الٰہی کے لیے الہام کو اصل بنا کر غلطی کی ہے۔ تمھاری یہ بات خود اس کی دلیل ہے کہ معرفت الٰہی' الہامی نہیں ہو سکتی، معرفت میں الہام کا حکم بہ ہمہ وجوہ باطل ہے[1]

شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کی کتاب ہمعات کا پہلا عنوان یہ ہے:۔ " دین کی دو حیثیتیں ـــــ ظاہری و باطنی " اس کے تحت انھوں نے لکھا ہے:۔

"ظاہر دین کی حفاظت و اشاعت کرنے والا گروہ فقہاء، محدثین اور مفسرین کا ہے اور باطن دین کی حفاظت و اشاعت کرنے والا گروہ اقطاب اور اولیاء اللہ کا ہے۔"

علماء ظواہر میں فقہاء، محدثین اور مفسرین کا گروہ ہوا اور علماء بواطن میں اقطاب اور اولیاء اللہ کا گروہ۔ پہلا گروہ شریعت کا محافظ ہے اور دوسرا گروہ حقیقت کا محافظ ہے۔ مولانا حسین احمد مرحوم و مغفور نے اپنے ایک مکتوب میں سجدۂ تحیۃ کے عدم جواز پر گفتگو کرتے ہوئے لکھا ہے:۔

"نیز عرض یہ ہے کہ یہ اکابر علم طریقت اور تصوف کے ائمۂ عظام ہیں۔ علم ظاہر اور شریعت کے امام نہیں' اس کے امام حضرت امام ابوحنیفہ و امام محمد و ابو یوسف اور فقہاء کرام ہیں۔ اس بارے میں ان کا قول و فعل حجت ہو گا۔ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی اور حضرت جنید بغدادی' حضرت خواجہ بہاء الدین نقشبندی' حضرت خواجہ معین الدین سنجری کے اقوال اور فتاویٰ حجت نہ ہوں گے۔ اگرچہ یہ حضرات علم طریقت کے اونچے پہاڑ ہیں۔ لکل فن رجال

---

[1] سید احمد قادری" تصوف کی تین اہم کتابیں" ص ۲۰ بحوالہ کشف المحجوب ص ۲۰۳ - ۲۰۴

رحمہم اللہ تعالیٰ [1]

اس سے قطع نظر کہ مثال کے طور پر حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی صرف علم طریقت اور تصوف کے امام ہیں یا علم ظاہر اور شریعت کے بھی۔ سوال یہ ہے کہ اس تقسیم کی دلیل کیا ہے ؟ اس بے دلیل تقسیم کی اصل وجہ وہی ہے جو ہم نے اس مقدمہ کے نکتہ ۹ کی تمہید میں عرض کی ہے۔

ظاہر و باطن کی جو بحث اوپر گزری ہے اس سے بات اگرچہ واضح ہے لیکن یہ صراحت مناسب معلوم ہوتی ہے کہ ظاہر و باطن کے الفاظ اپنے لغوی معنے میں بھی مستعمل ہیں۔ ظاہر کے معنے کھلی ہوئی چیز اور باطن کے معنیٰ چھپی ہوئی چیز۔ مثلاً انسان کا ایک ظاہر ہے اور ایک باطن ہے۔ ظاہر اس کا وہ جسم ہے جو دکھائی دیتا ہے اور باطن وہ چیزیں ہیں جو دکھائی نہیں دیتیں جیسے روح، قلب اور اس کے کیفیات۔ اسی طرح نماز کا ایک ظاہر ہے اور ایک باطن ہے۔ ظاہر، نماز کی ہیئت ہے، رکوع و سجود ہے اور قراتِ قرآن ہے اور اس کا باطن خشوع و خضوع ہے، حضور قلب ہے ــــ یہاں ظاہر و باطن کے الفاظ اس معنی کے لحاظ سے زیر بحث نہیں ہیں کیوں کہ ظاہر و باطن کی تقسیم سے مراد وہ اصطلاح ہے جو صوفیہ نے وضع کی ہے اس کے لحاظ سے وہ ظاہر کا لفظ شریعت کے لیے اور باطن کا لفظ "حقیقت" کے لیے استعمال کرتے ہیں اور جس طرح شریعت ایک پورا علم ہے اسی طرح حقیقت بھی ایک پورا علم ہے جس کو علم الباطن یا علم الاسرار کے الفاظ سے وہ بیان کرتے ہیں اور اسی لحاظ سے انھوں نے اہلِ ظاہر اور اہلِ حقیقت، اہل استدلال اور اہل وصال کی دو قسمیں کر دی ہیں۔

تکمیل دین کا اعلان

قرآن حکیم نے دین اسلام کی تکمیل کا اعلان کر دیا ہے:

اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ　　　آج میں نے تمہارے دین کو تمہارے لیے

---

[1] مکتوبات شیخ الاسلام مکتوب ۸۹ ج ۲

دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا ط (المائدہ: ۳)

مکمل کر دیا ہے اور اپنی نعمت تم پر تمام کر دی ہے اور تمہارے لیے اسلام کو تمہارے دین کی حیثیت سے قبول کر لیا ہے۔

یہ ایک ایسا جامع اور کامل دین ہے جس کے دائرے سے نہ انسانی زندگی کا کوئی وقت خارج ہے اور نہ اس کا کوئی جزو اور شعبہ باہر ہے۔ مہد سے لے کر لحد تک، گود سے لے کر گور تک کی تعلیمات اس میں موجود ہیں۔ کوئی مسلمان نہ اپنے ظاہر کے لیے کسی دوسری تعلیم کا حاجت مند ہے اور نہ اپنے باطن کے لیے، اپنے جسم کے لیے اور نہ اپنی روح کے لیے، نہ طہارت جسم کے لیے اور نہ تزکیہ نفس کے لیے، کیونکہ ان سب کے لیے تعلیم اسلام کے اندر ہی موجود ہے۔

تزکیہ:

اللہ تعالیٰ نے اپنے آخری نبی و رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو جو کام سپرد کیے تھے ان میں ایک بہت بڑا کام ایک بہت بڑا فرض منصبی انسانوں کا تزکیہ تھا۔

"درحقیقت اہل ایمان پر تو اللہ نے یہ بہت بڑا احسان کیا ہے کہ ان کے درمیان خود انہی میں سے ایک ایسا پیغمبر اٹھایا جو اس کی آیات انہیں سناتا ہے، ان کا تزکیہ کرتا ہے اور ان کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے حالانکہ اس سے پہلے یہی لوگ صریح گمراہی میں پڑے ہوئے تھے۔"

(آل عمران: ۱۶۴)

یہ مضمون اپنے اپنے موقع کے لحاظ سے قرآن کریم کی چار آیتوں میں دہرایا گیا ہے۔ اس آیت سے پہلے سورۂ بقرہ کی آیت ۱۲۹ اور آیت ۱۵۱ میں ہے اور پھر سورۂ جمعہ کے شروع میں۔ تزکیہ میں دو مفہوم شامل ہیں۔ کسی چیز کو پاک صاف کرنا اور اس کو نشوونما دینا، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا فرض منصبی یہ تھا کہ انسانوں کو کفر سے، شرک سے معصیت سے، اور برے اخلاق سے پاک کر کے ان کو ایمان سے، مکارم اخلاق سے اور تقویٰ سے آراستہ کریں۔ ان کے ظاہر کو بھی پاک کریں اور ان کے باطن کو بھی ہر

طرح کی گندگیوں سے صاف کریں اور ان کو روحانی ارتقار کے سب سے اونچے مقام۔ احسان۔ تک پہنچادیں۔ محمد عربی فداہ امی وابی نے اپنا یہ فرض منصبی بھی دوسرے فرائض منصبی کی طرح ادا کیا۔ آپ کی تعلیم و تربیت سے صحابۂ کرام کی ایک ایسی جماعت تیار ہوئی جس سے بہتر کوئی جماعت چشم فلک نے کبھی نہیں دیکھی۔ عہد رسالت کے بعد صحابہؓ کا عہد گزر گیا، عہد تابعین گزر گیا اور تبع تابعین کا زمانہ بھی گزر گیا۔ اس پورے طویل زمانے میں اسلامی شریعت ہی تمام روحانی ترقیوں کی کفیل رہی اس لیے کہ دین مکمل ہوچکا ہے اور کتاب وسنت نے روحانی ارتقار کے لیے ضروری کوئی چیز نظرانداز نہیں کی ہے۔ کسی عالم اور کسی صوفی کو دین کا تیا پانچہ کرنے اور اس کو ظاہر و باطن یا شریعت و حقیقت کے درمیان تقسیم کرنے کا خیال بھی نہیں آیا۔ جو لوگ خلوص کے ساتھ یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ دین مکمل ہوچکا ہے اور اللہ تعالیٰ کو اپنے بندوں سے جو کچھ مطلوب ہے وہ سب کچھ کتاب وسنت میں موجود ہے کوئی چیز ان سے چھوٹی نہیں ہے۔ ان کے نزدیک ظاہر و باطن یا شریعت و حقیقت میں دین کی تقسیم ایک غیر اسلامی تقسیم ہے اور اسلامی تصوف کا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

۱۰۔ چند صاحبان علم کے تاثرات

مسلم معاشرے میں جو بدعات و خرافات پھیلی ہوئی ہیں اور اولیار پرستی کے جو ہولناک مناظر دیکھے جارہے ہیں اس کا احساس بہت سے صاحبان علم کے دلوں میں موجود رہا ہے اور موجود ہے۔

سنہ ۱۹۶۳ء میں ماہنامہ نظام کان پور کا تصوف نمبر شائع ہوا تھا اس میں مولانا محمد الحق سندیلوی سابق استاذ دارالعلوم ندوۃ العلمار لکھنؤ کا ایک طویل مقالہ چھپا تھا ہم اس سے چند اقتباسات یہاں نقل کرتے ہیں۔ بعض ذیلی عنوانات خود محترم مقالہ نگار کے ہیں اور زیادہ تر ہم نے لگائے ہیں۔

غلط قسم کے تصوف کا نقصان

مولانا محمد اسحاق صاحب نے دو گروہوں کا ذکر کیا ہے۔ ایک وہ جو مطلقاً تصوف کا منکر ہے اور دوسرا وہ جو غلط قسم کے تصوف اور تصوف کی غلط تعبیر و تشریح میں مبتلا ہے۔ ان دونوں گروہوں کی غلط فہمیوں کے نقصانات بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"لیکن انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ ہم اس بات کا اعتراف کریں کہ انکار تصوف سے ہرگز وہ نقصان نہیں پہنچا جو غلط قسم کے تصوف اور اس کی خلاف حقیقت تعبیر و تفسیر سے پہنچا ہے انکار تصوف کا نقصان صرف یہ ہے کہ منکرین اس کی برکتوں سے محروم رہتے ہیں لیکن اس کی غلط تعبیر تو انسان کو بسا اوقات زندقہ اور الحاد تک پہنچا دیتی ہے۔" (ص ۱۴۱-۱۴۲)

تخلیق جن والنس کا مقصد

"انس و جن کی تخلیق کی حکمت اور ان دونوں کے وجود کا مقصد حق تعالیٰ کی عبادت و اطاعت ہے۔ عبادت کے معنی حق تعالیٰ جل شانہٗ کے سامنے اپنی انتہائی ذلت کا اظہار اور حق تعالیٰ کی لا انتہا عظمت و رفعت کا اعتراف۔ طاعت کا مفہوم، احکام الٰہیہ کی پابندی ہے یعنی جن باتوں کا حکم شریعت الٰہیہ نے دیا ہے ان پر عمل کرنا اور جن باتوں سے منع فرمایا ہے ان سے احتراز و اجتناب کرنا۔ عبادت و طاعت کا تعلق انسان کے ظاہر سے بھی ہے اور باطن سے بھی۔ عبادتیں بعض ظاہری ہیں۔ مثلاً نماز میں رکوع و سجود، قیام و قعود اور بعض باطنی ہیں مثلاً خشوع، اسی طرح بعض احکام ظاہر سے تعلق رکھتے ہیں۔ مثلاً روزہ کا حکم اور غیبت کی ممانعت اور بعض باطن سے مثلاً توحید و صبر کا حکم اور شرک و بے صبری کی ممانعت۔ حق تعالیٰ کا مطالبہ اپنے بندوں سے یہ ہے کہ ان کا ظاہر و باطن دونوں حق تعالیٰ کا عبادت گزار اور مطیع و فرمانبردار رہے۔ شریعت اسلامیہ ان سب احکام ظاہری و

باطنی کی جامع ہے بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ انھیں احکام کے مجموعہ کا نام شریعت ہے۔" (ص ۴۳-۴۴)

فرضی تقسیم

صوفیہ اور فقہار کے کاموں کی تفصیل کرتے ہوئے لکھتے ہیں :-

"اور علمار ظاہر و علماء باطن کی ایک فرضی تقسیم کر لی گئی جو درحقیقت بقول حکیم الامت حضرت مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ بالکل غلط ہے ممدوح فرماتے تھے اور بالکل صحیح فرماتے تھے کہ عالم دین وہی ہے جس کو ظاہر و باطن دونوں کے احکام کا علم ہو جو صرف اعمال ظاہرہ کا علم رکھتا ہو اور باطن سے ناواقف ہو وہ سچے معنے میں عالم دین کی تعریف میں داخل ہی نہیں ہے۔ سچ یہ ہے کہ ظاہر و باطن میں فطری طور پر ایسا تعلق ہے کہ ایک کو دوسرے سے مستغنی نہیں قرار دیا جا سکتا، یہ ناممکن ہے کہ انسان باطن کی اصلاح کرے اور ظاہر کو بالکل نظر انداز کر دے یا ظاہر کی اصلاح کرے اور باطن کی طرف سے آنکھیں بند کر لے۔" (۴۴-۴۵)

رضائے الٰہی

قرآن مجید، احادیث نبویہ اور امت کا اجماع ہے کہ سب عبادتوں و طاعتوں اذکار و مجاہدات افکار و مراقبات کا اصلی مقصد حق تعالیٰ کی رضا ہے۔ بندے کا مقصد بندگی، بلکہ مقصود زندگی ایک اور صرف ایک ہونا چاہیئے اور وہ ہے اپنے مالک حقیقی کو راضی کرنا۔ قرآن حکیم، صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی مدح و ستائش کے عنوان سے مقصد کی طرف اس طرح ہدایت فرماتا ہے:

يَبْتَغُونَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا وَرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ اَكْبَرُ۔	یہ حضرات اللہ تعالیٰ کے فضل اور ان کی رضامندی کی تلاش میں لگے رہتے ہیں اور اللہ کی رضامندی بڑی چیز ہے۔

مہاجرین کی مدح و ستائش اور ان کی ہجرت کا مقصد اس طرح بیان فرمایا جاتا ہے:-

يَبْتَغُونَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا — وہ اللہ تعالیٰ کے فضل اور اس کی رضامندی کے جویاں ہیں۔

ہم نے یہ تین آیتیں محض تبرکاً نقل کر دیں ورنہ اس گوہر مقصود کی نشان دہی جن آیات میں کی گئی ہے ان کی تعداد اتنی زیادہ ہے کہ ان کی نقل و تشریح کے لیے ایک مستقل رسالہ درکار ہے۔ اسی طرح حدیث کے خزانہ عامرہ میں بھی اس جوہر تابندہ کی بہتات ہے جو شخص ذرا بھی قرآن سے حدیث سے مس رکھتا ہے اس کے نزدیک یہ حقیقت ایک بدیہی شے ہے کہ سب اعمال صالحہ کا مقصد حقیقی رضائے الٰہی ہے جو شخص اس کے علاوہ کوئی دوسرا مقصد پیش نظر رکھتا ہے۔ وہ یقیناً صراط مستقیم سے دور جا پڑا۔ (۵۳-۵۲)

غلط مقصد

زردشتی فلسفہ اور باطنیت کی ظلمتوں نے ہندوستان آکر جب یوگ سے تعلقات قائم کیے تو ان صوفی نما اشراقیوں کا قلب "ظلمات بعضھا فوق بعض" کا مصداق بن گیا، راہ اس قدر تاریک ہو گئی کہ منزل مقصود بھی نظر سے اوجھل ہو گئی۔ صراط مستقیم کو چھوڑ کر انھوں نے ایک دوسری راہ اور دوسری ہی منزل کا انتخاب کر لیا۔ اس منزل کی شرح یہ ہے کہ اسلام نے بندے کی منزل رضائے الٰہی کو قرار دیا ہے مگر ہندو یوگ میں منزل مقصود ذات الٰہی ہے۔ ہندو فلسفہ جس قسم کے وحدۃ الوجود کا قائل ہے اس کا تقاضا یہی ہے ان کے نزدیک روح ترقی کر کے خدا کی ذات میں گم ہو سکتی ہے گویا بندہ معاذ اللہ خدا بن سکتا ہے۔ افسوس ہے کہ بعض جاہل صوفیوں نے اسلامی تعلیمات سے منھ موڑ کر ذات الٰہی میں گم ہونے اور اس کا جزو بن جانے کو اپنا حقیقی مقصود قرار دیا اسلامی نقطۂ نظر سے یہ نظریہ اور طریق کار دونوں بالکل باطل، غلط اور ضلال خالص ہے، ذات الٰہی ماوراء عقل و فہم ہے، اسے کوئی نہیں پا سکتا۔ بندہ کا خدا بن جانا بالکل محال و خلاف عقل و نقل ہے۔ بندے کا مقصد رضائے الٰہی ہونا چاہیے۔ مکرر عرض کر دوں کہ اسلامی تصوف اور صوفیائے محققین اس گمرہی سے بالکل بری اور پاک ہیں۔ (ص ۵۸)

جہاں تک ذات الٰہی کو مقصود بنانے کا تعلق ہے حضرت جنید بغدادی سے لے کر قریب زمانے کے صوفیہ تک سب اس پر متفق ہیں۔ اوپر کے نکات میں میں نے جو اقتباسات پیش کیے ہیں وہ جاہل صوفیوں کے نہیں صوفیائے محققین کے ہیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ انھوں نے یہ نہیں کہا ہے کہ بندہ خدا بن جاتا ہے لیکن یہ ضرور کہا ہے کہ منزل مقصود ذات الٰہی ہے اور وہ بھی ذاتِ بحت یعنی خالص ذات بغیر صفات۔ مجھے خوشی ہے کہ مولانا اسحاق نے بڑی صراحت کے ساتھ ذاتِ الٰہی کو منزلِ مقصود بنانے کے خیال کو غیر اسلامی اشراقی فلسفے اور ہندو یوگ سے ماخوذ قرار دیا ہے۔

شیعے اپنے "امام" کے بارے میں کیا عقیدہ رکھتے ہیں؟

"ان اشخاص کو یہ لوگ ان اسرار کا محرم سمجھتے ہیں جن کے بیان سے شریعتِ محمدیہ (معاذ اللہ) قاصر ہے اور ان اسرارِ سینہ بہ سینہ کو حقائق سے موسوم کرتے ہیں۔ شیعہ باطنیہ (اسماعیلی) تو صاف صاف اپنے اس عقیدے کو ظاہر کرتے ہیں اور اربابِ شریعت کو اہلِ ظاہر کہتے ہیں۔ اثنا عشری تقیہ سے کام لیتے ہیں اور باتیں ذرا چبا چبا کر کرتے ہیں مگر قائل اسی کے ہیں۔" (۵۷)

اہلِ سنت سے تعلق رکھنے والے صوفیہ اولیائے مقربین کے بارے میں کیا عقیدہ رکھتے ہیں؟ اوپر نکتہ ۶ میں ہم نے کچھ اقتباسات پیش کیے ہیں اور وہ "نمونہ از خروارے" ہیں۔ یعنی ایک انبار میں سے چند اقتباسات لیے گئے ہیں۔

ایمان بالغیب

ایک صوفی صاحب نے ایمان بالغیب کو صراطِ مستقیم کا پہلا قدم قرار دیا تھا۔ ان کی تردید کرتے ہوئے مولانا اسحاق نے لکھا ہے:

"سب سے زیادہ افسوسناک رویہ صوفی صاحب نے ایمان بالغیب کے متعلق اختیار کیا ہے، اگر موصوف سورۂ بقرہ کی ابتدائی آیات پر نظر کرتے تو ان پر یہ حقیقت واضح ہو جاتی کہ ہدایتِ حقیقی اور حقیقتِ ایمان

ایمان بالغیب ہی کا نام ہے۔ قرآن مجید حصر کے ساتھ مومنین بالغیب ہی کے متعلق ارشاد فرماتا ہے اولٰئِكَ عَلٰى هُدًى مِّنْ رَّبِّهِمْ وَاُولٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ٥ یہی لوگ اپنے رب کی طرف سے ہدایت یافتہ ہیں اور یہی لوگ کامیاب ہیں۔ واللہ اعلم۔ صوفی صاحب ایمان بالغیب کا کیا مفہوم سمجھ رہے ہیں اس کا صحیح مفہوم یہ ہے کہ جو امور ہمارے حواس اور ہماری عقل کی دسترس سے باہر ہیں ان کا کامل یقین واذعان محض مخبر صادق صلی اللہ علیہ وسلم پر کامل اعتماد کی وجہ سے رکھنا، حق تعالیٰ کا ہم سے یہی مطالبہ ہے اور بے شک یہی دین کی حقیقت ہے۔ صوفی صاجب اسے صراطِ مستقیم بھی نہیں کہتے بلکہ اس کی طرف پہلا قدم کہتے ہیں حالانکہ یہ عین صراطِ مستقیم ہے۔" (۶۰)

علم سینہ و علم سفینہ

اس عنوان کے تحت مولانا اسحاق صاحب نے تفصیل سے اس بات کی تردید کی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؓ کو کوئی مخصوص علم، علم سینہ کے طور پر عطا فرمایا تھا، انھوں نے لکھا ہے کہ یہ شیعوں کا تراشا ہوا افسانہ ہے لیکن مولانا کو شاید یہ معلوم نہیں کہ شیخ احمد سرہندی رحمہ اللہ نے یہی بات حضرت ابوہریرہؓ کے بارے میں ان کے ایک قول کو دلیل بنا کر کہی ہے ان کا خیال تھا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوہریرہؓ اور چند مخصوص صحابہؓ کو مخصوص علم عطا فرمایا تھا۔

عقائد کی اہمیت

"سب سے زیادہ اہمیت عقائد کو حاصل ہے۔ اگر عقائد درست نہ ہوں تو محض عملی زندگی کی پاکی بھی کسی کو مرتبۂ ولایت پر فائز نہیں کر سکتی۔" (۶۵)

مولانا آزاد مرحوم و مغفور کے خود نوشت سوانح حیات سے چند اقتباسات یہاں پیش کیے جا رہے ہیں۔ اس سے اندازہ ہوگا کہ مروجہ تصوف نے پیروں اور ان کی اولاد کو کیا بنا ڈالا ہے۔ یہ خیال بالکل غلط ہے کہ یہ صورت حال جاہل صوفیوں نے

پیدا کی ہے۔ مولانا آزادؒ لکھتے ہیں :۔

"میرے خاندان پر پیری وطریقت کا رنگ غالب تھا اور بحیثیت مجموعی بزرگوں کی حیثیت ایک عالم ہی کی نہ تھی بلکہ ایک پیرا ور صاحب سجادہ وطریقہ کی بھی۔ اس لیے آنکھ کھولتے ہی سب سے پہلے جو صدائیں میرے کانوں میں پڑیں اور جو منظر چاروں طرف دیکھا وہ سرتاسر انسانی اطاعت ارادت وعقیدت اور پرستش و تعبد کا تھا۔ ہم نے سب سے پہلی بات جو اس دنیا میں نمایاں طور پر دیکھی وہ یہ تھی کہ بڑے بڑے انسان آتے ہیں اور ہمارے بزرگوں کے اور ہمارے ہاتھ چومتے ہیں۔ معتقدین و مریدین کا طرزِ عمل ہمارے خاندان میں یہ رہتا تھا کہ ہر شخص والد مرحوم سے ملنے کے لیے آتا تو پہلے سلام کے بعد کھڑے ہی کھڑے جھک کر ان کا ہاتھ چومتا اور آنکھوں پر لگاتا اس کے بعد بیٹھ جاتا اور دوزانو ہو کر ان کے قدم چومتا زیادہ تر عقیدت مند تو جب تک دونوں پاؤں چوم نہ لیتے "سیر نہ ہوتے۔ اس کے بعد دور فاصلے پر دوزانو جس طرح التحیات میں بیٹھتے ہیں' ہاتھ باندھ کر بیٹھ جاتا۔ گرمیوں میں پنکھا جھلنے لگتا لیکن اس طرح کہ ایک ہاتھ پنکھے پر اور دوسرا ہاتھ، ہاتھ باندھنے کی جگہ پر' آنکھیں نیچی رہتیں اور بڑے سے بڑا معزز آدمی بھی آنکھ ملا کر کبھی بات نہ کرتا، جو بات ان کی زبان سے نکلتی " درست اور بجا" کا کلمہ فوراً نکلتا۔ چلتے وقت پھر اسی طرح دست بوسی و قدم بوسی ہوتی اور دروازے تک رجعت قہقری کرتے ہوئے ہاتھ باندھے ہوئے، سر جھکائے ہوئے واپسی ہوتی تھی۔ مجھے ایک شخص بھی یاد نہیں جو پیٹھ موڑ کر گیا ہو۔[1]

جو لوگ کسی بڑی خانقاہ سے تعلق رکھتے ہیں' وہ مولانا آزاد کے اس چشم دید

---

[1] پندرہ روزہ ترجمان دہلی، مورخہ یکم مارچ ۱۹۸۰ء

بیان کو مبالغہ قرار نہیں دیں گے۔ جہاں تک واپسی کے وقت کسی بزرگ کو پیٹھ نہ دکھانے کا تعلق ہے تو یہ تعظیم صرف زندہ بزرگوں ہی کے ساتھ خاص نہیں بلکہ بزرگوں کی قبروں کے ساتھ بھی یہ روش اختیار کی جاتی ہے۔ کئی بار یہ حقیر اپنے خاندانی بزرگ کی قبر چوم کر اور فاتحہ پڑھ کر واپس ہوا ہے تو اُلٹے پاؤں واپس ہوا ہے تاکہ پیٹھ قبر کی طرف نہ ہو عنفوان شباب میں میں نے یہ کام "تقلیداً" کیا تھا، اللہ تعالیٰ مجھے معاف فرمائے۔

پیرزادوں کے ساتھ کیا ہوتا ہے؟ اس کا نقشہ مولانا آزاد نے اس طرح کھینچا ہے:۔

"جب ذرا اور بڑے ہوئے اور باہر دیوان خانے میں بیٹھنے اُٹھنے لگے تو یہ صورت پیش آئی کہ تمام لوگ حلقہ باندھ کر اور ہاتھ باندھ کر بیٹھتے اور سر جھکا کر ہماری ہر بات پر آمنا وصدقنا کہتے اور معمولی معمولی بات کو بھی عزت واحترام سے سنتے گویا ایک کرامت اور مافوق العادۃ فضیلت ہے"[1]

جب بعض صوفیائے محققین نے اپنے سامنے مریدوں کے سجدوں کو بھی جائز قرار دے لیا تو مولانا آزاد نے جو کچھ لکھا وہ کم ہی ہے۔ ان بزرگوں کے اس طرزِ عمل ہی نے سجدۂ تحیۃ کے جواز وعدم جواز کی بحث پیدا کر دی ہے۔

"ایک ناشگوار حقیقت" کے عنوان سے مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی ایک تحریر شائع ہوئی تھی اس میں ان کا احساس واعتراف ملاحظہ فرمائیے:

"یہ حقیقت خواہ کتنی ہی تلخ، ناخوشگوار اور بہت سے لوگوں کے لیے نامانوس ہو مگر حقیقت ہے کہ ہم مسلمانوں میں بہت سے مشرکانہ عقائد واعمال پائے جاتے ہیں اور شرک جلی کے وجود کا بھی انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے اعتراف کے لیے تھوڑی سی قرآن فہمی اور کسی قدر اخلاقی جرأت کی ضرورت ہے، اگر شرک کوئی حقیقت ہے اور وہ 'عنقا'، کی طرح کوئی خیالی وفرضی چیز نہیں اور اگر قوموں اور ملتوں

---

[1] ایضاً

کے لیے ایک ہی میزانِ عدل اور ایک ہی پیمانہ ہے تو اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ بہت سے مسلمان (خواہ ماحول سے متاثر ہو کر اور خواہ علم اور صحیح تبلیغ کی کمی کی وجہ سے) اس ذہنی گمراہی اور عملی بے راہ روی میں مبتلا ہو گئے ہیں جس کو قرآن میں صاف صاف شرک کہا گیا ہے۔ اگر کسی کو اس میں شبہ ہو یا وہ کسی خیالی دنیا میں رہتا ہو تو کسی "مرجع خلائق" مزار پر جا کر اور کسی عرس میں شریک ہو کر دیکھ لے یا ان عقائد و خیالات کے سننے کی کوشش کرے جو بکثرت عوام اور کہیں کہیں خواص نے اولیائے کرام، بزرگانِ دین اور اپنے سلسلے کے مشائخ کے متعلق قائم کر رکھے ہیں کہ "صفتِ خلق" (پیدا کرنے کی طاقت) ایجاد عالم اور مشکل سے ایک دو صفتوں کے علاوہ صفات و افعالِ الٰہی میں سے کون سی صفت اور کون سا فعل و تصرف ہے جو انھوں نے ان بزرگوں سے منسوب نہیں کر رکھا ہے اور سجدہ سے لے کر دعاء و استعانت تک کون سا معاملہ ہے جو خدا کے ساتھ ہونا چاہیئے اور انھوں نے اس کے ساتھ روا نہیں رکھا ہے۔ قرآن مجید ہاتھ میں لے کر کسی بڑی بستی یا خوش اعتقادی کے کسی عالی مرکز میں چلے جائیے، اندیشہ ہے کہ آپ کی زبان سے بے اختیار قرآن کے الفاظ نکل جائیں۔ (ترجمہ) "اور اکثر جو لوگ خدا کو مانتے بھی ہیں تو اس طرح کہ شرک بھی کرتے جاتے ہیں۔" (یوسف: ۱۰۶) ایسی حالت میں خالص قرآن کی روشنی میں حفاظت و نصرت و تائیدِ الٰہی کی کیا امید کی جا سکتی ہے اور رہنمایانِ قوم کی خارجی تدبیریں کیا کارگر ہو سکتی ہیں جبکہ امن و حفاظتِ ملک کے لیے اس کی شرط لگی ہے کہ (ترجمہ) "بشرطیکہ میری عبادت کرتے رہیں اور میرے ساتھ کسی قسم کا شرک نہ کریں" (النور: ۵۵) اس سلسلے میں علماء، واعظین و واقفینِ حال کا جو فرض ہے وہ محتاجِ بیان نہیں اور اس فرض کے "فرضِ کفایہ" کے درجے میں بھی باقی نہ رہنے سے جس مجموعی باز پرس

اور مواخذہ کا خطرہ ہے وہ اہلِ نظر سے مخفی نہیں ہے[1]

مولانا علی میاں مدظلہٗ کا یہ دو ٹوک احساس و اعتراف قابلِ تحسین اور لائقِ شکر ہے خدا گواہ ہے کہ اس حقیر کی یہ کتاب "غیر اسلامی تصوف" اسی طرح کے احساس کا نتیجہ ہے۔ صرف اتنی بات ادب کے ساتھ عرض ہے کہ بکثرت عوام اور کہیں کہیں خواص اپنے اپنے سلسلے کے بزرگوں کی طرف جو کچھ منسوب کرتے ہیں وہ ان بزرگوں نے یا تو اپنے بارے میں خود کہی ہیں یا مستند بزرگوں نے اپنی کتابوں میں اولیاء کے بارے میں لکھی ہیں۔ میں نے اس مقدمہ کے نکات میں جو اقتباسات پیش کیے ہیں۔ وہ اس کی دلیل ہیں اور اصل کتاب میں ان شاء اللہ دوسرے بہت سے اقتباسات آئیں گے۔ بزرگوں کی سوانح نگاری میں خود علی میاں کی یہ روش رہی ہے کہ جو باتیں کتاب و سنت کی روشنی میں بالکل غلط ہیں ان کی طرف سے انھوں نے مکمل چشم پوشی کی ہے۔ اس حقیر کا شدید احساس ہے کہ جب تک صوفیہ علیہ کی کہی ہوئی غلط باتوں کو نمایاں کر کے ان کی تردید نہ کی جائے۔ صورتِ حال میں کوئی تبدیلی نہیں آسکتی اور تبدیلی آئے یا نہ آئے ہم اپنے فرض سے ہرگز سبکدوش نہیں ہوسکتے بلکہ بزرگوں کی غلط باتوں سے چشم پوشی ہمیں آخرت کی بازپرس سے نہیں بچا سکتی۔

اخیر میں تصوف کے ایک اور بڑے حامی پروفیسر یوسف سلیم چشتی کی تحریر پر یہ دسواں نکتہ ختم کرتا ہوں۔

انھوں نے اپنی کتاب "تاریخ تصوف" کے اخیر میں ایک بزرگ ابوسعید ابن ابی الخیر کے حالات لکھے ہیں۔ اس کی تمہید میں لکھتے ہیں:

ابوسعید اگرچہ صاحب تصنیف صوفیہ میں سے نہیں ہیں مگر میں نے ان کا تذکرہ صرف اس لیے کیا ہے کہ ان کی تعلیمات میں غیر قرآنی عناصر پائے جاتے ہیں۔ اس طرح قارئین کو اس حقیقت سے آگاہی ہو جائے گی کہ پانچویں صدی

---

[1] ندائے ملت لکھنؤ جلد ۳۶ نمبر ۳۲ - ۲۲ نومبر ۱۹۸۱ء

ہجری سے تصوف میں غیر اسلامی عقائد داخل ہونے شروع ہو گئے تھے اور چونکہ مسلمانوں کی دوسری جماعتوں کی طرح صوفیوں کے یہاں بھی تحقیق کا دروازہ بند ہو گیا تھا اس لیے وہ غیر اسلامی عقائد بعینہٖ اسلاف سے اخلاف کو منقول ہوتے رہے اور کسی صوفی یا سجادہ نشین یا شیخ نے ان عقائد و افکار و تعلیمات پر تحقیقی نظر نہیں ڈالی۔ اگر کوئی بات صریحاً خلاف عقل نظر بھی آئی تو اس کی تاویل کر لی کیوں کہ اسلاف کی غلطی کو غلطی کہنا تمام صوفیوں میں سوءِ ادب سمجھا جاتا تھا اور اگر کوئی شخص تغلیط کی جرأت کرتا تھا تو اسے یہ مصرع سنا کر خاموش کر دیا جاتا تھا کہ ؎

خطائے بزرگاں گرفتن خطاست

اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ تمام شیوخ سلاسل "معصوم عن الخطا" ہو گئے اور دیگر فنون کی طرح تصوف میں تقلید کورکا بازار گرم ہو گیا۔ اس تقلید سے سب سے بڑا نقصان یہ پہنچا کہ صدہا غلط اور ضعیف اور موضوع روایات "ارشاد نبوی" کے مقدس نام سے موسوم ہو کر مسلمانوں میں مقبول ہو گئیں۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ صوفیائے کرام محض صوفی تھے محدث نہیں تھے۔ یعنی وہ فن روایت و درایت اور جرح و تعدیل سے ناآشنا تھے۔ وہ بقول شخصے (گناہ بر گردن راوی) مردوں کو زندہ کر سکتے تھے، مگر جھوٹی اور سچی احادیث میں تمیز نہیں کر سکتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ شیخ ہجویریؒ جیسے بزرگ (م ۴۶۲ھ) کی تصنیف میں موضوع احادیث پائی جاتی ہیں اور یہ لوگ تو محض صوفی تھے، حجۃ الاسلام امام غزالی کی احیاء العلوم میں کئی موضوع اور کئی ضعیف (ناقابل اعتماد) روایات، احادیث نبوی کے نام سے مندرج ہیں اور دشمنان اسلام انہیں روایات کو مستدل بنا کر اسلام پر زبان طعن دراز کرتے ہیں[۱]

مجھے صرف اتنا عرض کرنا ہے کہ تصوف میں غیر اسلامی عناصر پانچویں صدی ہجری

---

[۱] تاریخ تصوف ۵۰۷، ۵۰۸

سے بہت پہلے داخل ہونا شروع ہو گئے تھے اور خود ان کی کتاب "تاریخ تصوف" اس پر گواہ ہے — پروفیسر صاحب بھی تصوف کی دو قسموں کے قائل ہیں۔ انھوں نے لکھا ہے :-

"جو تصوف مسلمانوں میں شائع ہوا، اس کی دو قسمیں ہیں۔

(۱) اسلامی تصوف جو قرآن و حدیث اور آثار صحابہ سے ماخوذ ہے۔

(۲) غیر اسلامی تصوف جسے اس بوتل سے تشبیہ دے سکتے ہیں جس کے لیبل پر شربت گلاب لکھا ہوا ہو مگر اندر عرق بنگ و افیون بھرا ہوا ہو۔"

اس مقدمہ کے دس نکات میں سے چھ نکات — چار سے نو تک۔ ان اجزاء سے بحث کرتے ہیں جو غیر اسلامی ہیں۔ اگر کوئی شخص ان نکات پر انصاف کے ساتھ غور کرے تو اس کے لیے غیر اسلامی تصوف کو پہچاننا دشوار نہ ہوگا۔

نومبر، دسمبر ۱۹۵۸ء، جنوری ۱۹۶۰ء

اہلِ تصوّف اور واقعۂ موسیٰ و خضر علیہما السّلام

قرآنِ کریم میں حضرت موسیٰ اور حضرت خضر علیہما السلام کا واقعہ، ان بہتیرے واقعات میں سے ایک ہے جنھیں اللہ تعالیٰ نے انسان کی عبرت پذیری کے لیے بیان کیا ہے، لیکن اس واقعہ کے سمجھنے اور اس سے استدلال کرنے میں بعض اصحاب کو غلط فہمیاں ہوگئیں جن سے بہت سے باطل پرست اصحاب نے گمراہیاں مول لے لیں۔ اس لیے ہم یہاں صحیح احادیث سے اس کی تفصیل پیش کرتے ہیں۔

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی "صحیح" میں اس واقعہ کو مفصل روایت کیا ہے۔ کتاب الانبیاء اور کتاب التفسیر میں بالتفصیل اور کتاب العلم میں بالاجمال، یہاں کتاب التفسیر کی ایک مفصل روایت کا ترجمہ پیش کیا جاتا ہے:

سعید بن جبیرؒ نے کہا کہ میں نے ابن عباسؓ سے بیان کیا، نوف بکالی کا گمان ہے کہ وہ موسیٰؑ جو خضرؑ کے ساتھ رہے تھے بنی اسرائیل کے موسیٰؑ نہیں ہیں۔ یہ سن کر ابن عباسؓ نے فرمایا، نوف بکالی جھوٹا ہے، مجھ سے اُبی بن کعبؓ نے حدیث بیان کی ہے کہ انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ موسیٰؑ، بنی اسرائیل میں خطبہ دینے کے لیے کھڑے ہوئے تو ان سے سوال کیا گیا کہ سب سے زیادہ علم رکھنے والا انسان کون ہے؟ موسیٰؑ نے جواب دیا کہ میں سب سے زیادہ علم رکھنے والا انسان ہوں، اس جواب پر اللہ نے انھیں عتاب کیا کیوں کہ انھوں نے علم کا مرجع اللہ کو قرار نہیں دیا (اس سوال کے جواب میں انھیں اللہ اعلم کہنا چاہیے تھا) اللہ تعالیٰ نے موسیٰؑ پر وحی بھیجی کہ مجمع البحرین میں میرا ایک بندہ ہے جو تجھ سے زیادہ علم رکھتا ہے (یعنی ایک مخصوص علم میں وہ تم سے بڑھے ہوئے ہیں، مخصوص علم

میں حضرت خضرؑ کی اعلمیت نسائی کی ایک روایت میں صراحتہً مذکور ہے۔)
موسیٰؑ نے کہا' اے میرے رب تو میں کیسے ان تک پہنچ سکتا ہوں، اللہ نے کہا تم اپنے ساتھ زنبیل میں مچھلی لے لو اور جس جگہ اس مچھلی کو اس سے گم پاؤ' وہیں خضرؑ ہوں گے۔ موسیٰؑ نے زنبیل میں مچھلی لے لی اور روانہ ہوئے۔ان کے ساتھ یوشعؑ بن نون خدمت کے لیے ہم سفر ہوئے۔ یہاں تک کہ جب وہ دونوں اس خاص چٹان تک پہنچے' جو علامت تھی تو دونوں چٹان پر سر رکھ کر سو گئے' اتنے میں زنبیل کے اندر سے مچھلی تڑپی اور باہر نکل کر سمندر میں جا گری' سمندر میں اس کے لیے ایک راہ بن گئی' اللہ تعالیٰ نے پانی کی روانی کو روک دیا اور پانی کے اندر مچھلی کے لیے ایک طاق بن گیا' جب وہ دونوں جاگے تو یوشعؑ بن نون موسیٰؑ سے مچھلی کا واقعہ کہنا بھول گئے۔ پھر وہ دونوں باقی دن اور پوری رات چلتے رہے جب صبح ہوئی تو موسیٰؑ نے یوشعؑ سے کہا، ہمارا کھانا لاؤ' ہم اس سفر سے تھک گئے۔ موسیٰؑ نے تکان تب محسوس کی جب اس جگہ سے آگے بڑھ گئے جس کا حکم اللہ نے دیا تھا۔ کھانا مانگنے کے بعد یوشعؑ کو واقعہ یاد آیا اور انھوں نے کہا کہ چٹان کے پاس جہاں ہم سوئے تھے وہاں وہ سمندر میں جا گری اور اس میں اس کے لیے راہ بن گئی' میں اس واقعہ کو آپ سے کہنا بھول گیا اور شیطان نے مجھ پر نسیان طاری کر دیا' موسیٰؑ نے یہ سن کر کہا یہی تو ہم چاہتے تھے' پھر وہ دونوں اپنے نقش قدم دیکھتے ہوئے پلٹ پڑے جب وہ اس چٹان تک پہنچے تو وہاں ایک صاحب کپڑا اوڑھے ہوئے لیٹے تھے' موسیٰؑ نے ان کو سلام کیا۔ خضرؑ نے کہا' اس سرزمین میں سلام کرنے والے لوگ کہاں ہیں (یعنی انھیں سلام سے تعجب ہوا کیوں کہ وہاں مسلمانوں کی آبادی نہ تھی) موسیٰؑ نے کہا' میں ہوں' خضرؑ نے پوچھا کیا بنی اسرائیل کے موسیٰؑ؟ انھوں نے کہا' ہاں' میں آپ کے پاس وہ علم سیکھنے آیا ہوں جو آپ نے اللہ سے سیکھا ہے۔ خضرؑ نے کہا' اے موسیٰؑ' آپ میرے ساتھ

صبر نہیں کر سکیں گے، مجھے اللہ نے وہ علم دیا ہے جسے آپ نہیں جانتے اور آپ کو اللہ نے جو علم دیا ہے وہ میں نہیں جانتا۔ موسیٰؑ نے کہا انشاء اللہ آپ مجھے صابر پائیں گے، میں آپ کے حکم کی مخالفت نہیں کروں گا ـــــ اس کے بعد اس روایت میں موسیٰؑ و خضرؑ کے سفر اور ان تین واقعات کا ذکر ہے جو خود قرآن میں مذکور ہیں، اس حدیث میں یہ واقعہ بھی ہے کہ کشتی پر ایک چڑیا آئی اور اس نے اپنی چونچ سمندر میں ڈالی، یہ دیکھ کر حضرت خضرؑ نے حضرت موسیٰؑ سے کہا میرے اور آپ کے علم نے علم الٰہی سے بس اتنا ہی حصہ پایا ہے جتنا اس چڑیا نے اس سمندر سے۔"

قرآن کے الفاظ اور اس حدیث کی تفصیل سے جو باتیں واضح ہوتی ہیں وہ یہ ہیں:

(۱) علم کا سرچشمہ اللہ تعالیٰ ہے اور ہر انسان اتنا ہی علم رکھتا ہے جتنا اللہ تعالیٰ اسے دے۔

(۲) اس کلیہ سے انبیاء کرام علیہم السلام بھی مستثنیٰ نہیں۔

(۳) سب سے زیادہ علم اللہ تعالیٰ نے اپنے انبیاء کو دیا ہے لیکن ان کا علم بھی اس کے علم کے مقابلے میں وہی حیثیت رکھتا ہے جسے اس حدیث میں چڑیا کی منقار اور سمندر کی مثال سے ظاہر کیا گیا ہے۔

(۴) یہ واقعہ اللہ تعالیٰ کے علم و قدرت اور فَوْقَ كُلِّ ذِي عِلْمٍ عَلِيمٌ کا ایک محسوس و مشاہد نمونہ ہے۔

(۵) تمام انبیاءؑ کو اللہ تعالیٰ نے مغیبات اور جزئیاتِ کونیہ کا علم یکساں عطا نہیں کیا ہے۔

(۶) ظاہر میں جسے ہم اچھا سمجھتے ہیں، ضروری نہیں کہ حقیقت کے لحاظ سے بھی وہ اچھا ہو اور بظاہر جسے ہم برا سمجھتے ہیں ضروری نہیں کہ فی الحقیقت وہ برا ہو۔

عَسٰى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْئًا وَّهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ وَعَسٰى اَنْ تُحِبُّوْا شَيْئًا وَّهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ۔	یہ ہو سکتا ہے کہ تمھیں کوئی چیز ناپسند ہو لیکن وہ تمھارے لیے بہتر ہو اور تمھیں کوئی چیز پسند ہو اور وہ تمھارے لیے بری ہو۔

اچھے اور برے کا اصل معیار اللہ کی پسند و ناپسند ہے، اسی کا حکم فیصلہ کن ہے۔

(۷) اختلافِ معلومات کے لحاظ سے کبھی مفضول اپنے سے افضل کے لیے ذریعہ، علم بن جاتا ہے،

یہ باتیں جو اس واقعہ میں معلوم ہوتی ہیں ان میں کی ہر بات قرآن کریم کے دوسرے نصوص سے بصراحت بھی ثابت ہے اور موسیٰ و خضر کا واقعہ بیان کر کے اللہ نے ہمیں بھی گویا ان کا مشاہدہ کرا دیا ہے۔

یہی واقعہ ہے جسے صوفیہ متاخرین نے اپنا ایک نشان بنالیا ہے اور اس سے اپنے خیالات پر طرح طرح سے استدلال کرنے کی کوشش کی ہے۔ آیئے دیکھیں کہ صوفیا متاخرین نے اس واقعہ سے کیا اخذ کیا ہے۔

سب سے پہلی بات جو انھوں نے اخذ فرمائی وہ یہ ہے کہ حضرت خضر کو باطنی امور اور مغیبات کا جو علم حاصل تھا وہی علم کامل ہے اور اس کے مقابلے میں ظواہر و شرائع کا علم، ناقص علم ہے اس لیے کہ باطنی امور کا علم بذریعہ کشف بلا واسطہ اللہ تعالےٰ کی طرف سے حاصل ہوتا ہے اور ظواہر و شرائع کا علم حرف وصورت، عبادت و کتابت اور درس و تدریس کے واسطے سے حاصل ہوتا ہے، بنا بریں علم باطنی فرد کامل اور علم ظاہری فرد ناقص ہے۔ آپ شاید سمجھیں کہ میں نے صوفیہ کی بات تصوف کی کسی کتاب سے لکھی ہوگی، جی نہیں، اگر ایسا ہوتا تو پھر بھی غنیمت تھا۔ ہمارے بعض صوفیہ نے زیادتی یہ کی ہے کہ اس طرح کی باتوں سے قرآن کریم کی تفسیر تک کو نوازا ہے اور اسی ڈھنگ پر پورے قرآن کی تفسیریں لکھ ڈالی ہیں، میں نے یہ بات تفسیر روح البیان سے لی ہے، علم ظاہری اور علم باطنی کے فرق کو واضح کرنے کے بعد آخر میں لکھا ہے:

ولذا اخصّ کبار الصوفیۃ فی اصطلاحاتھم لفظ العلم اللدنیّ بھذا العلم الباطنی الحاصل بمحض تعلیم اللہ تعالیٰ من لدنہ بغیر واسطۃ عبارۃ ولذلک قال بعضھم۔ شعر	اور اسی لیے اکابر صوفیہ نے اپنی اصطلاحات میں علم لدنّی کے لفظ کو اسی علم باطنی کے ساتھ خاص رکھا ہے جو بلا واسطہ، عبارت محض اللہ تعالیٰ کی تعلیم سے حاصل ہوتا ہے اسی لیے ان میں کے بعض نے یہ شعر کہا ہے
تعلمنا بلا حرف وصوت ؛ قرآناہ بلا سھو وفوت یعنی بطریق الفیض الالٰہی والالہام الربانی لا بطریق التعلیم اللفظی والتدریس القولی۔	ہم نے بغیر حرف و آواز علم حاصل کیا ہے، ہمارے علم میں نہ سہو ہے نہ فوت، یعنی ہم نے اس کو فیضِ الٰہی اور الہام ربّانی کے طریقے پر حاصل کیا ہے،

لفظی تعلیم اور قولی تدریس کے طریقے پر نہیں۔ (روح البیان ج ۲ صفحہ ۵۰۱)

صوفیۂ صدق کے اس بیان و استدلال سے صوفیۂ کذب نے یہ نتیجہ نکالا کہ حضرت موسیٰؑ کا علم ناقص اور حضرت خضرؑ کا علم کامل تھا اور چونکہ صوفیہ کے ایک گروہ کے نزدیک حضرت خضرؑ نبی نہیں بلکہ ولی ہیں اس لیے اب یہ نتیجہ برآمد ہوا کہ اولیاء کا علم انبیاء کے علم سے افضل ہے۔ صوفیۂ حق نے تو یہ بات ان علماء پر صوفیہ کی فضیلت ثابت کرنے کے لیے لکھی اور کہی تھی جن کو وہ علمائے ظواہر کہتے تھے لیکن نتیجہ یہ نکلا کہ ولی کی فضیلت نبی پر ثابت ہو گئی، ان کی بات سے جس فتنے کا دروازہ کھل گیا اب اسے بند کرنے کی کوشش کرتے ہیں مگر وہ بند نہیں ہوتا، اگر ان کی کہی ہوئی بات صحیح ہوتی تو باطل پرستوں کے اخذ کردہ نتیجہ کو رد کر دیا جاتا اور سمجھا جاتا کہ انھوں نے ایک صحیح بات سے غلط نتیجہ اخذ کیا لیکن صوفیۂ حق کی کہی ہوئی بات خود اپنی جگہ محلِ غور ہے۔

سوال یہ ہے کہ علم لدنی کو علم باطنی کے ساتھ خاص کرنا کس طرح صحیح ہو سکتا ہے۔ کیا انبیاء کرام علیہم السلام کو ظواہر امور اور شرائع کا جو علم عطا کیا گیا وہ علم لدنی نہیں ہے؟ ظواہر و شرائع کا علم ہو یا بواطن و مغیبات کا جب دونوں ہی اللہ کی تعلیم سے حاصل ہوئے تو دونوں ہی علم لدنی ہیں، ایک کو علم لدنی اور دوسرے کو غیر لدنی قرار دینا کس لغت اور کس منطق کی رو سے صحیح ہے؟ جس طرح یہاں حضرت خضرؑ کے علم کے بارے میں وَعَلَّمْنَاهُ مِن لَّدُنَّا عِلْمًا۔ (ہم نے انھیں اپنے پاس سے علم دیا) کہا گیا ہے اسی طرح قرآن کریم کے بارے میں اِنَّكَ لَتُلَقَّى الْقُرْاٰنَ مِنْ لَّدُنْ حَكِيْمٍ عَلِيْمٍ (نمل) (بے شک تمھیں قرآن حکیم و علیم خدا کی طرف القا کیا جاتا ہے) اور آتَيْنَاكَ مِن لَّدُنَّا ذِكْرًا (طٰہٰ) (اور ہم نے تمھیں اپنے پاس سے ذکر، قرآن، دیا) کہا گیا ہے تو کیا قرآن میں صرف بواطن امور اور مغیبات کا علم ہے اور جب ایسا نہیں ہے تو کیا نعوذ باللہ قرآن کا علم، علم لدنی نہیں ہے؟ پھر علم لدنی کو بلا واسطۂ عبارت و حرف و صوت کہنا عجیب بات ہے۔ قرآن کا علم، علم لدنی کا کامل ترین فرد ہے اور یہ سراسر واسطۂ عبارت و حرف و صوت حاصل ہوا ہے اسی آیت وَعَلَّمْنَاهُ مِن لَّدُنَّا عِلْمًا کے چند آیتوں کے بعد حضرت موسیٰؑ کا جو یہ قول قرآن میں منقول ہے قَدْ بَلَغْتَ مِن لَّدُنِّي عُذْرًا (میری جانب سے تمھیں

عذر پہنچ گیا) کیا حضرت خضرؑ کو حضرت موسیٰؑ کی طرف سے بلا واسطہ عبارت وحرف وصوت عذر حاصل ہو گیا تھا؟ قرآن کریم کا درجہ حدیث شریف کے مقابلے میں اسی لیے تو بلند ہے کہ قرآن کے الفاظ بھی اللہ تعالےٰ کی طرف سے نازل ہوئے ہیں اور حدیث کے الفاظ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل نہیں ہوئے۔ اسی بات سے اتنا عظیم فرق پیدا ہوا کہ ایک وحیٔ متلو اور دوسری وحیٔ غیر متلو قرار پائی، ایک کا علم قطعی اور دوسرے کا علم ظنی قرار پایا۔ اس سے معلوم ہوا کہ وہ وحی علم کا فردِ کامل ہے جو بواسطہ حرف وصوت آئی نہ کہ وہ الہام جو بلا واسطہ حرف و صوت ہو لیکن ہمارے بہتیرے صوفیہ نے نادانستہ اس ترتیب کو الٹ کر رکھ دیا ہے۔ پھر یہ بات الگ بحث طلب ہے کہ حضرت خضرؑ کا ذریعۂ علم کیا تھا۔ وحیٔ الٰہی یا محض الہام۔ قرآن کے الفاظ صاف بتا رہے ہیں کہ ان کا ذریعۂ علم بھی وحیٔ الٰہی تھی نہ کہ وہ الہام جو بلا واسطہ حرف وصوت ہوتا ہے، اس لیے اس آیت سے بلا واسطہ حرف وصوت الہام کی فضیلت کا استدلال کسی طرح صحیح نہیں ـــــ جب صوفیۂ متاخرین نے اس علم کو جو حضرت خضرؑ کو حاصل تھا کامل قرار دیا تو دوسری بات اس واقعہ سے انھیں یہ حاصل ہوئی کہ انھوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بمنزلہ مرید اور حضرت خضرؑ کو بمنزلہ شیخ قرار دیا اور پیری ومریدی کے آداب کی ایک فہرست بنا ڈالی مثال کے طور پر یہاں دو باتیں درج کی جاتی ہیں۔

۱۔ مرید کو اپنے شیخ کی کسی بات پر اعتراض نہ کرنا چاہیے کیوں کہ بہتیری باتیں جو شریعت کے لحاظ سے ناجائز معلوم ہوتی ہیں وہ حقیقت کے اعتبار سے جائز اور صحیح ہوتی ہیں۔ تفسیر روح البیان میں وَلَا أَعْصِي لَكَ أَمْرًا کے تحت لکھا ہے:

وفی التاویلات النجمیة ومن الاداب ان لایکون معترضا علی افعال الشیخ واقوالہ و احوالہ وجمیع حرکاتہ وسکناتہ معتقداً انی جمیع حالاتہ وان شاہد فیہ معاملة غیر مرضیة بنظر عقلہ وشرعہ فلا ینکر بہا ولایسیٔ الظن فیہ بل یحسن فیہ الظن	تاویلات نجمیہ میں ہے کہ مرید کے آداب میں یہ بھی ہے کہ وہ اپنے شیخ پر کبھی اعتراض نہ کرے نہ اس کے اقوال پر نہ افعال پر نہ احوال پر نہ اس کے حرکات وسکنات پر بلکہ تمام حالات میں اس کا معتقد رہے اور اگر کوئی ایسا معاملہ دیکھے جو اس کی نظر میں عقل اور شریعت کے لحاظ سے

ویعتقد انہ مصیب فی معاملاتہ، مجتہد فی آرائہ وانما الخطأ من قصور نظری وسخافۃ عقلی وقلۃ علمی۔	ناپسندیدہ ہو تو اس کا انکار نہ کرے اور بدظنی نہ کرے، حسنِ ظن قائم رکھے اور اس بات کا اعتقاد کرے کہ شیخ کے معاملات ٹھیک ہیں وہ اپنی رایوں میں مجتہد ہے، غلطی جو نظر آرہی ہے وہ میرے قصورِ فہم، نارسائی عقل اور کمیٔ علم کا نتیجہ ہے۔

آپ نے دیکھا کہ تاویلات نجمیہ نے مشائخ کرام کو کتنا بڑا رتبہ اور کیسی عظیم آزادی بخشی ہے عقل بے چاری تو درماندہ ہے ہی، یہاں تو خلافِ شرع کوئی معاملہ دیکھا جائے جب بھی مجالِ دم زدن نہیں، تاویلات نجمیہ نے مشائخ کو یہ آزادی اور یہ رتبہ بخشا ہے تو بخشے، تاویلاتِ محمدیہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام نے کسی کو نہ یہ آزادی بخشی ہے اور نہ یہ رتبہ عطا کیا ہے۔

(۲) اللہ تک پہنچنا شیخ اور اس کی اقتدار کے بغیر ناممکن ہے۔ روح البیان میں ہے:

> "اگر مرید کو اثنار سلوک میں تکان لاحق ہو اور اس کا نفس اس کو یہ سمجھائے کہ شیخ کی صحبت چھوڑ دے اور خود ہی اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں الگ جا اور نفس سے جہاد کر کے حق تک پہنچ جا۔ تو یہ محض فریب اور ظنِ فاسد ہے ایسا مرید سیدھے راستے سے بھٹک جائے گا اور مقصود حاصل نہیں کر سکے گا۔ بے حصولِ مقصود اس کی عمر ضائع ہو جائے گی، شیخ کی صحبت غذائے روح ہے اس لیے اس صحبت سے الگ ہونے کے بعد تکان لاحق ہی ہوگی۔ شیخ کی صحبت سے تجاوز پر شیطان آمادہ کرتا ہے، اگر کبھی ایسا واہمہ ہو تو شیخ کی طرف فوراً رجوع کرنا چاہیے جیسا کہ موسیٰ و یوشع علیہما السلام مقامِ خضر سے دور جانے کے بعد پھر پلٹ کر آئے۔"

پیر و مرید، شیخ و مرشد اور استاد و شاگرد کے موضوع سے قطع نظر کرتے ہوئے یہاں صرف یہ دیکھنا ہے کہ موسیٰ و خضر علیہما السلام کے واقعہ سے شیخ و مرید کے متعلق یہ اشارے نکلتے ہیں؟ صوفیہ نے شیخ اور مرید کی جو اصطلاح مقرر کی ہے اس کے لحاظ سے کیا حضرت موسیٰؑ کو مرید اور حضرت خضرؑ کو ان کا شیخ قرار دیا جا سکتا ہے؟ کیا اس واقعہ کو شیخی و مریدی

سے کوئی تعلق ہے ؟

واقعہ کی نوعیت یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے جو اللہ کے جلیل القدر اور اولوالعزم رسولوں میں ہیں، ایک قولی لغزش ہوتی ہے، اللہ تعالیٰ اس پر انھیں متنبہ کرتا ہے کہ تم بہ ہمہ جہت اعلم الناس نہیں ہو بلکہ ہمارا ایک بندہ ایسا بھی ہے جس کو ہم نے وہ علم عطا کیا ہے جو تمھیں عطا نہیں کیا، علم کا سرچشمہ میں ہوں، اس لیے فی الحقیقۃ اعلم میرے سوا کوئی نہیں۔ حضرت موسیٰؑ کو اس بندے سے ملاقات اور ان چیزوں کے مشاہدے کا اشتیاق پیدا ہوتا ہے جو ان کے دائرۂ علم سے باہر ہیں، وہ اپنے اشتیاق کا اظہار کرتے ہیں، اللہ انھیں پتہ بتاتا ہے اور وہ امرِ الٰہی کے تحت روانہ ہوتے ہیں۔ حضرت خضرؑ سے مل کر اپنے سفر کا مقصد ظاہر کرتے ہیں حضرت خضرؑ ان سے کہتے ہیں کہ آپ میرے ساتھ صبر نہیں کر سکیں گے، حضرت موسیٰؑ چونکہ مشاہدہ کر کے اطمینان قلب حاصل کرنا چاہتے تھے اس لیے انھوں نے اصرار کیا اور کہا کہ آپ مجھے انشاءاللہ صابر پائیں گے اور میں آپ کے حکم کی مخالفت نہ کروں گا۔ اس کے بعد پھر تاکید کے لیے حضرت خضرؑ نے یہ شرط لگائی کہ جب تک میں اپنے معاملات سے آپ کو آگاہ نہ کروں آپ مجھ سے کوئی سوال نہ کریں۔ اس شرط کے ساتھ دونوں کا سفر شروع ہوا اور خرقِ سفینہ، قتلِ ولد، اور اقامتِ جدار کے تین واقعات پیش آئے۔ حضرت موسیٰؑ کا مقصد چونکہ اس علم کے مظاہر کا مشاہدہ تھا جو خرقِ سفینہ اور قتلِ ولد کے دو واقعوں سے حاصل ہو چکا تھا اس لیے تیسری دفعہ قصداً انھوں نے سوال کیا تاکہ یہ صحبت و سفر ختم ہو اور وہ اپنے کارِ رسالت پر واپس جائیں۔ چنانچہ تیسرے سوال کے بعد یہ صحبت ختم ہو گئی۔ حضرت خضرؑ نے مزید اطمینان کے لیے انھیں ان واقعات کی حقیقت بتا دی اور آخر میں یہ بھی بتا دیا کہ یہ معاملات اللہ تعالیٰ کے حکم سے کیے گئے ہیں ان میں میرا کوئی دخل نہیں ہے۔

اس واقعہ کی یہ تمام تفصیلات قرآن وحدیث سے ثابت ہیں۔ اب دیکھیے کہ اس واقعہ کو پڑھ کر کیا کوئی شخص یہ سمجھ سکتا ہے کہ حضرت موسیٰؑ حضرت خضرؑ کی خدمت میں مرید ہونے کے لیے حاضر ہوئے تھے اور صحبتِ خضرؑ کا مقصود وصول الی اللہ تھا؟ کیا موسیٰؑ کو نعوذ باللہ وصول الی اللہ حاصل نہ تھا یا اس میں کوئی کمی تھی جو صحبتِ خضر سے پوری ہوتی۔ کیا انھیں خود سلوک الی اللہ کا طریقہ معلوم نہ تھا جسے سیکھنے کے لیے وہ خضرؑ کے

پاس آئے۔ کوئی باخبر اور منصف انسان ان میں سے کسی بات کا اقرار نہیں کر سکتا لیکن بہتیرے صوفیہ نے اپنا مدعا ثابت کرنے کی محویت میں اس واقعہ سے یہ اشارے نکالے کہ کوئی انسان کسی صاحبِ باطن شیخ کی صحبت و اقتداء کے بغیر خدا تک پہنچ ہی نہیں سکتا اور کسی مرید کے لیے اپنے شیخ کے ایسے افعال و اقوال پر بھی جو عقلاً و شرعاً ناپسندیدہ و ناجائز ہوں اعتراض کرنا درست نہیں۔ ناطقہ سر بگریباں کہ اسے کیا کہیے!

شیخ پر کسی حال میں اعتراض نہ کرنے کا اشارہ حضرت موسیٰؑ کے قول۔ وَلَاۤ اَعْصِیْ لَکَ اَمْرًا (میں آپ کی حکم عدولی نہ کروں گا) سے نکالا گیا ہے۔ اگر واقعہ کی اصل نوعیت اور اس واقعہ کو قرآن میں بیان کرنے کا مقصد پیشِ نظر ہوتا تو یہ اشارہ کبھی نہ نکلتا، اپنے مدعا کو ثابت کرنے کی دھن میں اشارہ نکالنے والوں نے اس قول کے قائل کا عمل بھی نہ دیکھا، اگر اس قول سے یہ اشارہ نکلتا ہے کہ شیخ پر کسی حال میں اعتراض نہ کیا جائے تو ماننا پڑے گا کہ موسیٰ علیہ السلام نعوذ باللہ نہایت ناقص درجہ کے مرید تھے کہ اپنے شیخ کی کسی ایک بات پر بھی اعتراض کرنے سے نہ چوکے اور دو دفعہ تو پوری شدت کے ساتھ اعتراض کیا اور یہ بھی ماننا پڑے گا کہ وہ اپنے شیخ کے فیضِ صحبت سے محروم واپس آگئے۔ حالانکہ واقعہ کی اصل نوعیت سامنے رہے تو وَلَاۤ اَعْصِیْ لَکَ اَمْرًا کا مطلب آسانی سے معلوم ہو جائے۔ حضرت موسیٰؑ نے وَلَاۤ اَعْصِیْ لَکَ اَمْرًا اس لیے نہیں فرمایا تھا کہ خضرؑ ان کے شیخ تھے اور شیخ کے کسی قول و فعل پر اعتراض کرنا جائز نہیں بلکہ اس لیے فرمایا تھا کہ ان کے پاس قطعی اور یقینی شہادت موجود تھی کہ حضرت خضرؑ کے پاس جو علم ہے وہ اللہ کا دیا ہوا اور اس کی مرضی کے مطابق ہے وَعَلَّمْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّا عِلْمًا یہی نہیں بلکہ وہ اذنِ الٰہی کے تحت حضرت خضرؑ کے پاس آئے تھے۔ ان باتوں کے باوجود جب دو ایسے امور ان کے سامنے آئے جو بظاہر ہی سہی، خلافِ شرع تھے تو وہ صبر نہ کر سکے اور پوری سختی کے ساتھ اعتراضات کیے۔ کیوں کہ وَلَاۤ اَعْصِیْ لَکَ اَمْرًا کے عہد میں ہرگز یہ بات داخل نہ تھی کہ خلافِ شرع امور پر بھی اعتراض نہ کیا جائے گا لَا طَاعَةَ لِمَخْلُوْقٍ فِیْ مَعْصِیَةِ الْخَالِقِ (خالق کی نافرمانی کرنے کے لیے مخلوق کی اطاعت

جائز نہیں) کچھ شریعتِ محمدی ہی کا کلیہ نہیں ہے بلکہ تمام آسمانی شریعتوں کا متفقہ کلیہ ہے۔

اب دیکھنے کی چیز یہ ہے کہ جب علم خضرؑ کی اس قطعی دلیل کے باوجود ان کے افعال پر اعتراض ناجائز نہیں تھا تو پھر کسی ایسے شیخ کے افعال و اقوال پر اعتراض کس طرح ناجائز ہوگا۔ جس کے علم باطنی کی کوئی ظنی دلیل بھی موجود نہ ہو۔ پھر یہ بھی دیکھنے کی چیز ہے کہ حضرت خضرؑ کو جو علم حاصل تھا وہ اتنا قطعی تھا کہ اس کی رو سے قتلِ ولد تک ان کے لیے جائز تھا سوال یہ ہے کہ کسی شیخ وقت کے لیے بھی اپنے علم باطنی کی رو سے ایسا کرنا جائز ہے؟ جب ایسا نہیں ہے تو کسی شیخ کو حضرت خضرؑ کا درجہ دینا کس طرح صحیح ہو سکتا ہے؟ امام قشیریؒ اور امام غزالیؒ نے مشائخ کے اقوال و افعال پر ترک اعتراض کا استدلال حضرت خضرؑ کے قول فَاِنِ اتَّبَعْتَنِیْ فَلَا تَسْئَلْنِیْ عَنْ شَیْءٍ حَتّٰی اُحْدِثَ لَکَ مِنْهُ ذِکْرًا (تو اگر تم میرے پیچھے چلو تو کسی شئے کے بارے میں اس وقت تک نہ پوچھو جب تک میں خود اس کا حال تمھیں نہ بتا دوں) سے کیا ہے۔ بات یہاں بھی وہی ہے جو پہلے کہی گئی، ان بزرگوں کی نگاہ سے یہ حقیقت اوجھل ہے کہ حضرت خضرؑ کا علم قطعی تھا اور ان سے جو افعال صادر ہوئے وہ قطعاً امر الٰہی کے ماتحت ہوئے تھے۔ علم باطنی کی قطعیت کسی شیخ کو حاصل نہیں۔ اس لیے حضرت خضرؑ کے علم پر اس کو قیاس کرنا قیاس مع الفارق ہے۔ علامہ قسطلانی نے مواہب لدنیہ میں یہ کتنی سچی بات لکھی ہے۔

لا یظھر علی احد شیٔ من نور الایمان الا باتباع السنة ومجانبة البدعة واما من اعرض عن الکتاب والسنة ولم یتعلق بالعلم من مشکاة الرسول صلی اللہ علیه وسلم بدعواہ علما لدنیا او تیه فھو من لدن النفس والشیطان وانما یعرف کون العلم لدنیا	سنت کی پیروی اور بدعت سے اجتناب کیے بغیر کسی شخص میں ایمان کا نور ظاہر نہیں ہوتا اگر کوئی شخص دعویٰ کرے کہ اسے علم لدنی عطا کیا گیا ہے اور اس دعویٰ کی بنا پر کتاب و سنت سے اعراض کرے اور مشکوٰۃ نبوی سے حاصل شدہ علم سے تعلق نہ رکھے تو اس کا یہ علم نفس اور شیطان کی طرف سے ہوگا، علم کے لدنی و روحانی ہونے کی شناخت یہ ہے کہ وہ شریعت

روحانیا موافقتہ لماجاء بہ الرسول فالعلم اللدنی نوعان لدنی روحانی ولدنی شیطانی۔ | محمدی کے موافق ہو" اس سے معلوم ہوا کہ علم لدنی کی دو قسمیں ہیں ۱ لدنی روحانی اور ۲ لدنی شیطانی۔

حضرت خضرؑ کے واقعۂ قتل ولد سے خارجیوں نے بھی استدلال کرنے کی کوشش کی تھی جیسا کہ امام احمدؒ نے یہ روایت درج کی ہے۔

"عطا سے مروی ہے کہ نجدہ حروری (خارجی) نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے لکھ کر بچوں کے قتل کا مسئلہ پوچھا۔ انھوں نے جواب بھیجا کہ اگر تم خضر ہو اور بچوں کو دیکھ کر جان لیتے ہو کہ کون کافر ہوگا اور کون مومن تو بچوں کو قتل کرو۔ (روح المعانی ج ۵ ص ۱۲۱)

سبکی لکھتے ہیں کہ "نجدہ نے قصۂ خضرؑ سے حجت پیش کرنے کی کوشش کی تھی اس لیے حضرت ابن عباسؓ نے اس کو یہ دندان شکن جواب دیا۔ اس جواب سے یہ بھی معلوم ہوا کہ حضرت خضرؑ کا علم قطعی تھا اس لیے کسی غیر قطعی علم کو وہ درجہ نہیں دیا جا سکتا۔

حضرت خضرؑ کے علم باطنی اور اس کی فضیلت پر مشائخ کرام نے اتنا زور دیا اور اپنی کتابوں میں اس کو اتنے مبہم انداز میں درج کیا کہ یہ نفس پرستوں کے ہاتھوں کا ہتھکنڈہ بن کر رہ گیا۔ نفس پرستوں نے کہنا شروع کیا کہ انسان جب درجۂ ولایت پر پہنچ جاتا ہے تو اسے نبی کے اتباع کی ضرورت نہیں رہتی بلکہ نبی ہی اس کا اتباع کرتا ہے۔ جیسے حضرت خضرؑ نے حضرت موسیٰؑ کی پیروی نہیں کی بلکہ موسیٰؑ نے خضرؑ کا اتباع کیا۔ اس غلط استدلال نے پورے دین و شریعت کو ہدم کرنا شروع کر دیا اور یہ لے اتنی بڑھی کہ خود مشائخ کرام گھبرا اٹھے۔ یہاں تک کہ علامہ عبدالوہاب شعرانیؒ نے صوفیہ کے علم کو علم باطن کہنے ہی سے انکار کیا۔ انھوں نے فرمایا کہ فقہا اور دوسرے اہل حجاب نے صوفیہ کے علم کو علم باطن قرار دیا ہے ورنہ صوفیہ کا علم تو کتاب و سنت پر عمل کا نتیجہ ہے۔ صوفیہ کی باتیں چونکہ دقیق ہوتی ہیں اس لیے عوام اسے سمجھتے نہیں اور علم باطن سے تعبیر کرنے لگتے ہیں۔ آخر میں وہ لکھتے ہیں۔

ولیس ذلك بباطن اذالباطن هو علم الله تعالیٰ واما جمیع ما علمه الخلق علی اختلاف طبقاتهم فهو من العلم الظاهر لانه ظهر للخلق فاعلم ذلك۔

اور وہ (صوفیہ کا علم) باطن نہیں ہے اس لیے کہ باطن صرف اللہ تعالیٰ کا علم ہے۔ باقی رہا تمام مخلوقات کا علم تو وہ علم ظاہر ہے اس لیے کہ مخلوق پر ظاہر ہو چکا اس بات کو اچھی طرح سمجھ لو۔

(الدرالمنثور بحوالہ روح المعانی)

یہ الگ بحث ہے کہ صوفیہ کے علم کو فقہا اور اہل حجاب نے علم باطن قرار دیا ہے یا خود اکابر صوفیہ اور اہل مشاہدہ نے ایسا لکھا ہے، یہاں دکھلانا یہ ہے کہ علم باطن کا نام لے کر لوگوں نے اس قدر گمراہیاں پھیلانی شروع کر دی تھیں کہ شیخ عبدالوہاب کو اس اصطلاح ہی سے انکار کرنا پڑا۔ نفس کے بندوں اور باطل پرستوں کے استدلال کو علامہ قسطلانی نے بھی بڑے زور کے ساتھ رد کیا ہے۔ ہم مواہب لدنیہ کی عبارتوں کا ترجمہ پیش کرتے ہیں۔

"موسیٰ علیہ السلام کا قصہ جو حضرت خضرؑ کے ساتھ گزرا ہے اس سے یہ استدلال کرنا کہ علم لدنی حاصل ہونے کے بعد انسان وحیٔ الٰہی سے بے نیاز ہو جاتا ہے الحاد وکفر ہے دائرہ اسلام سے خارج کر دینے والا اور موجب قتل ہے۔ فرق یہ ہے کہ موسیٰ علیہ السلام خضرؑ کی طرف مبعوث نہیں کئے گئے تھے اور نہ خضرؑ کو ان کی متابعت و پیروی کا حکم دیا گیا تھا اور اگر وہ مامور ہوتے تو حضرت موسیٰؑ کی طرف ہجرت کر[illegible]ان کے ساتھ رہنا ان پر واجب ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے مکالمے کے وقت پوچھا تھا کہ کیا آپ بنی اسرائیل کے موسیٰؑ ہیں؟ تو حضرت موسیٰؑ نے جواب میں کہا تھا کہ ہاں میں بنی اسرائیل کا موسیٰ ہوں اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم قیامت تک کے لیے تمام جن وانس کی طرف مبعوث کیے گئے ہیں اس لیے آپ کی رسالت عام ہے، اگر موسیٰ وعیسیٰ علیہما السلام اس وقت موجود ہوتے تو انھیں محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہی کا اتباع کرنا ہوتا۔ اس لیے جو شخص اس کا دعویٰ کرتا ہے کہ اس کی حیثیت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ وہی ہے جو خضرؑ کی حضرت موسیٰؑ کے ساتھ تھی یا امت محمدی میں کسی شخص کے لیے بھی یہ بات جائز

رکھتا ہے تو اُسے چاہیئے کہ از سرِ نو مسلمان ہو اور کلمۂ شہادت ادا کرے۔ کیونکہ وہ اس باطل عقیدے کی وجہ سے دینِ اسلام سے بالکل الگ ہو گیا ہے چہ جائیکہ وہ اللہ کے اولیاء میں ہو، بے شک وہ شیطان کے اولیاء اور اس کے خلفاء و نائبین کے گروہ میں داخل ہو چکا ہے۔"

ان تمام تفصیلات سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ موسیٰ و خضر علیہما السلام کے واقعے سے استدلال کرنے میں ابتداءً صوفیہ حق سے غلطی ہو گئی، اور پھر اس غلطی کی بنیاد پر باطل پرستوں نے بے دینی و الحاد کی پوری عمارت کھڑی کر دی۔

اگست ستمبر ۱۹۵۳ء

صوفیا، اور سماجی یک جہتی

(پروفیسر خلیق احمد نظامی کے ایک مضمون پر تبصرہ)

جب مستند و معتبر دینی اداروں سے نکلنے والے اخبارات ورسائل میں کوئی بات، کوئی خیال، کوئی نظریہ کتاب وسنت کے خلاف نظر آتا ہے تو قدرتی طور پر زیادہ افسوس ہوتا ہے۔ باطل نظریات وخیالات پھیلانے والے سیکڑوں اخبارات ورسائل اور کثیر تعداد میں لٹریچر ہمارے ملک میں شائع ہو رہا اور ذہنوں کو مسموم کر رہا ہے۔ اس ماحول میں اگر دینی ومذہبی اخبارات ورسائل میں بھی غلط خیالات اور غلط نظریات شائع کیے جائیں تو زیادہ افسوس ہونا ہی چاہیے۔ جن اداروں کی دین داری اور تقویٰ پر بہت سے مسلمان اعتماد کرتے ہوں اور ان میں زیادہ تعداد ایسے لوگوں کی ہو جو خود براہِ راست کتاب وسنت کا علم نہیں رکھتے تو وہ ان غلط خیالات اور غلط نظریات کو بھی صحیح سمجھ لیتے ہیں جو اس طرح کے دینی رسالوں میں شائع ہوتے ہیں۔ یہ حقیر اس وقت جس مضمون پر اظہار خیال کرنا چاہتا ہے وہ پروفیسر خلیق نظامی صاحب کا ہے۔ جو ایک دینی ماہنامے میں ”سماجی یک جہتی میں صوفی، سنتوں کا رول“ کے عنوان سے شائع ہوا ہے۔ پروفیسر صاحب ایک مشہور مصنف اور دین دار مسلمان ہیں۔ انھوں نے خصوصیت کے ساتھ تصوف کا مطالعہ کیا ہے اور اس سے متعلق وقیع کتابیں مرتب کی ہیں۔ جب مصنف دین دار ہو اور اس کا مضمون ایک مستند دینی ادارے کے ماہنامے میں شائع ہوا ہو تو اس کے اثرات مسلمان عوام پر کیا پڑیں گے اس کا اندازہ لگانا دشوار نہیں ہے۔ اگرچہ اس مضمون پر مدیر رسالہ نے ایک نوٹ لکھا ہے لیکن مضمون کی اس

سے پوری تردید نہیں ہوتی۔

مضمون نگار نے صوفیہ کے اقوال پیش کر کے یہ بتایا ہے کہ ہندوستان کے صوفیوں اور سنتوں کے سماجی افکار کی بنیاد یہ تھی کہ تمام انسان ایک ہیں اور ان کے درمیان کسی قسم کا فرق وامتیاز کرنا اسلامی مزاج اور اس کی روح کے خلاف ہے۔ وہ اپنے مضمون میں لکھتے ہیں :-

"گنگوہ کے شیخ عبد القدوسؒ نے اعلان کیا۔ انسانوں کے درمیان اہل ایمان وکافر، گناہگار و دین دار، گمراہ و راستی پسند، پاک وناپاک وغیرہ کی بے معنے تقسیم کیوں ہے؟ سب ایک ہی باغ کے پھول ہیں۔"

پروفیسر صاحب نے چونکہ کتب تصوف کا وسیع مطالعہ کیا ہے، اس لیے توقع ہے کہ شیخ عبد القدوس گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کی طرف اس قول کا انتساب صحیح ہوگا لیکن اسلام کا علم رکھنے والا ہر شخص اسے پڑھ کر پکار اُٹھے گا کہ یہ قول غلط ہی نہیں، بلکہ سراسر باطل ہے۔ "نظریۂ وحدۃ الوجود" کے استغراق میں شاید یہ بات اُن کے منھ سے نکل گئی ہوگی۔ اس قول کا ہوش اور شعور سے کوئی تعلق نہیں ہے اور اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ تصوف کے لحاظ سے بھی یہ قول غلط ہے۔ اگر اس قول کو صحیح مانا جائے تو پھر انبیاء کرام علیہم السلام کی بعثت، کتابوں کا نزول، جزا و سزا، جنت وجہنم، اللہ تعالیٰ کی خوشنودی و ناراضی، یہ تمام باتیں بے معنی ہو کر رہ جائیں گی۔ اس قول نے پورے قرآن پر ضرب لگادی ہے۔ (نعوذ باللہ من ذالک) بہت افسوس ہے کہ پروفیسر صاحب نے اپنے باطل خیال کے ثبوت میں ایک باطل قول پیش کیا ہے ـــــ قرآن نے منکرین حق اور اللہ کے باغیوں کو اندھا، گونگا اور بہرا قرار دیا ہے۔ قرآن نے انسانوں کے درمیان اولیاء اللہ اور اعداء اللہ، حزب اللہ اور حزب الشیطان کی تفریق کی ہے۔ اس نے تو ایمان لانے والوں کے درمیان بھی منافق اور مخلص کی تقسیم کی ہے ـــــ بلاشبہ اسلام نے اور صرف اسلام نے یہ تعلیم بھی دی ہے کہ پیدائشی طور پر اور نسل کے لحاظ سے سب انسان یکساں ہیں۔ نسلی اعتبار سے ان میں اونچ نیچ کا کوئی فرق نہیں ہے۔ سب آدم

کی اولاد ہیں ۔ اس نے وحدت آدم کی تعلیم دی ہے ۔ حدیثوں میں تمام انسانوں کو "عیال اللہ" کہا گیا ہے ۔ انسانی اخوت کی تعلیم دی گئی ہے اور بلا تفریق رحمت و مواسات کی ترغیب دی گئی ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ اللہ کے فرماں برداروں اور نافرمانوں، وفاداروں اور غداروں کے درمیان فرق بھی کیا گیا ہے اور دونوں کو یکساں سمجھنے والوں سے ان کے خالق نے بڑے غصے سے یہ سوال کیا ہے۔

اَفَنَجْعَلُ الْمُسْلِمِیْنَ کَالْمُجْرِمِیْنَ ○ مَا لَکُمْ کَیْفَ تَحْکُمُوْنَ ○ (ن : ۳۵-۳۶)

کیا ہم فرماں برداروں اور مجرموں کو یکساں کر دیں ؟ تم لوگوں کو کیا ہو گیا ہے ۔ تم کیسے حکم لگاتے ہو ؟

معلوم نہیں پروفیسر صاحب اس سوال کا کیا جواب دیں گے ؟ ۔۔۔ ان سے یہ بھی پوچھا جا سکتا ہے کہ کیا دنیا کی ریاستیں اپنے فرماں برداروں اور نافرمانوں وفاداروں اور غداروں کے درمیان تفریق نہیں کرتیں ؟ بہ لحاظ بشریت و آدمیت تمام انسانوں کا ایک ہونا اور چیز ہے اور بہ لحاظ عقائد و اعمال ان کا ایک ہونا دوسری چیز ہے ۔ پہلی بات صحیح اور دوسری غلط ہے۔

"دین کے معاملے میں کوئی زور و زبردستی نہیں ہے ۔ صحیح بات غلط خیالات سے الگ چھانٹ کر رکھ دی گئی ہے ۔ اب جو کوئی طاغوت کا انکار کر کے اللہ پر ایمان لے آیا، اس نے ایک ایسا مضبوط سہارا تھام لیا جو کبھی ٹوٹنے والا نہیں اور اللہ سب کچھ سننے اور جاننے والا ہے جو لوگ ایمان لاتے ہیں ان کا حامی و مددگار اللہ ہے اور وہ ان کو تاریکیوں سے روشنی میں نکال لاتا ہے اور جو لوگ کفر کی راہ اختیار کرتے ہیں ان کے حامی و مددگار طاغوت ہیں اور وہ انہیں روشنی سے تاریکیوں کی طرف کھینچ لے جاتے ہیں۔ یہ آگ میں جانے والے لوگ ہیں جہاں یہ ہمیشہ رہیں گے ۔" (البقرہ : ۲۵۶-۲۵۷)

پروفیسر خلیق نظامی صاحب نے اپنے اسی مضمون میں لکھا ہے :

"صوفی کی زندگی کا مقصد خدا کی محبت ہوتا ہے اور یہ اسی وقت ممکن ہے

جب کوئی شخص دوسرے انسانوں کے ساتھ محبت اور رواداری برتے۔ خدا کی محبت کو اپنی زندگی کا آدرش ماننے والوں کے لیے خدا کے اوصاف کو اپنانا ضروری تھا۔ یعنی جس طرح خدا نے سورج، پانی اور زمین جیسی تمام نعمتیں ہر ذات، رنگ، نسل اور کردار کے لوگوں کو یکساں طور پر بخشی ہیں اسی طرح انسان کا بھی فرض ہے کہ وہ تمام انسانوں کو برابر سمجھے مذہب یا نسل کی بنیاد پر انسانوں کے درمیان امتیاز کرنا خدا کی مرضی کے خلاف ہے۔ لہذا صوفیوں کے فلسفۂ حیات میں اس کے لیے کوئی جگہ نہ تھی۔"

پروفیسر صاحب کی یہ تحریر پڑھ کر اندازہ ہوا کہ انھوں نے کوئی خاص دنیوی مقصد حاصل کرنے کے لیے یہ مضمون لکھا ہے۔ ورنہ اس قدر نادانی کا ثبوت وہ نہ دیتے۔ قرآن اور حدیث کا علم تو دور کی بات ہے۔ اس تحریر میں انھوں نے عقل عام کو بھی رخصت کر دیا ہے۔ اگر سورج، پانی اور زمین کا سب انسانوں کے لیے عام ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ تمام انسانوں کو ہر لحاظ سے یکساں اور برابر سمجھا جائے تو کیا تمام انسانوں کو پروفیسر صاحب کی طرح پروفیسر، دانش ور اور صاحب علم سمجھنا فرض قرار پائے گا اور انسانوں کے درمیان عالم اور جاہل، خواندہ اور ناخواندہ کی تفریق بھی صحیح نہ ہوگی؟ سمجھ میں نہیں آتا کہ پروفیسر صاحب کن لوگوں سے مخاطب ہیں اور کن لوگوں کے لیے انھوں نے یہ مضمون لکھا ہے۔ پھر یہ کہ کیا محبوب کی اطاعت کے بغیر محبت کا دعویٰ صحیح ہے؟ اگر صوفی کی زندگی کا مقصد خدا کی محبت ہوتا تھا تو کیا وہ خدا کی اطاعت سے غافل اور منحرف ہو گئے تھے؟ اگر وہ منحرف ہوتے تھے تو ایسے صوفی ہم مسلمانوں کے کس کام کے؟ اور اگر وہ منحرف نہیں ہوتے تھے تو کیا وہ خدا کی صرف ایک ہی صفت کو مانتے تھے؟ نیز یہ کہ ان کا قرآن پر ایمان تھا یا نہیں؟ قرآن میں تو اللہ نے اپنی محبت کا دعویٰ کرنے والوں کے لیے صرف اپنی ہی نہیں بلکہ اپنے آخری نبی سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کو بھی ضروری قرار دیا ہے۔ آپ کی پیروی ہی محبت الٰہی کی کسوٹی ہے۔

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ	اے نبی، لوگوں سے کہہ دو کہ اگر تم حقیقت میں اللہ سے محبت رکھتے ہو تو میری پیروی

یُحْبِبْکُمُ اللّٰہُ وَیَغْفِرْ	اختیار کرو ۔ اللہ تم سے محبت کرے گا اور تمھاری
لَکُمْ ذُنُوْبَکُمْ وَاللّٰہُ	خطاؤں سے درگزر فرمائے گا وہ بڑا معاف
غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ۝ قُلْ	کرنے والا اور رحیم ہے ۔ ان سے کہو کہ اللہ و
اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَالرَّسُوْلَ	رسول کی اطاعت کرو پھر اگر وہ تمھاری یہ
فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّ	دعوت قبول نہ کریں یقیناً یہ ممکن نہیں ہے
اللّٰہَ لَا یُحِبُّ الْکَافِرِیْنَ	کہ اللہ ایسے لوگوں سے محبت کرے جو اس
	کی اور اس کے رسول کی اطاعت سے انکار
(آل عمران : ۳۱-۳۲)	کرتے ہوں ۔

پہلی آیت محبت کی کسوٹی اور دوسری آیت ایک ایسی تنبیہ ہے جس سے رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں۔ دوسری جگہ خدا سے محبت کرنے والوں کی یہ صفات قرآن میں بیان کی گئی ہیں ۔

"اے ایمان لانے والو! اگر تم میں سے کوئی اپنے دین سے پھرتا ہے تو اللہ اور بہت سے لوگ ایسے پیدا کر دے گا جو اللہ کو محبوب ہوں گے اور اللہ ان کو محبوب ہوگا جو مومنوں پر نرم اور کفار پر سخت ہوں گے ۔ جو اللہ کی راہ میں جدوجہد کریں گے اور کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہ ڈریں گے ۔ یہ اللہ کا فضل ہے جسے چاہتا ہے عطا کرتا ہے ۔ اللہ وسیع ذرائع کا مالک ہے اور سب کچھ جانتا ہے ۔" (المائدہ : ۵۴)

اس آیت کریمہ میں اللہ سے محبت کرنے والوں کی جو صفات بیان کی گئی ہیں وہ یہ ہیں :

(الف) مومنوں پر نرم ہونا ۔ (ب) کفار پر سخت ہونا ۔ (ج) اللہ کی راہ میں جہاد کرنا ۔ (د) حق کے معاملے میں کسی ملامت کرنے والوں کی ملامت سے نہ ڈرنا ۔

یہ آیتیں پروفیسر صاحب نے پڑھی ہیں یا نہیں ؟ اور اُن صوفیہ نے پڑھی تھیں یا نہیں جن کے اقوال انھوں نے اپنے مضمون میں نقل کیے ہیں ؟

پروفیسر صاحب کا یہ مضمون پڑھ کر میرا یہ احساس شدید ہو گیا ہے کہ فلسفیانہ تصوف کی کتابوں میں جو غیر اسلامی چیزیں مخلوط ہو گئی ہیں ان کو الگ چھانٹنا اور قرآن و حدیث سے ان کی مدلل تردید کرنا بے حد ضروری کام ہے۔ پروفیسر خلیق نظامی جیسے لوگ صوفیہ کے غلط اور غیر اسلامی اقوال کا سہارا لے کر غلط خیالات پھیلانے کی جرأت کر رہے ہیں۔ اسی مضمون میں ایک جگہ انھوں نے لکھا ہے کہ "وحدۃ الوجود" کا طرزِ فکر جو اپنشد سے کافی مشابہ تھا ہندوستان میں اسی نظریہ کے سہارے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان نظریاتی خلیج کو پُر کیا جا سکا تھا۔"

معلوم نہیں ہندوستان میں وہ دَور کب آیا تھا۔ جب ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان نظریاتی خلیج پُر ہو گئی تھی؟ اس نظریہ سے نہ پہلے یہ خلیج پُر ہوئی تھی اور نہ آج ہو گی البتہ موجودہ ہندوستان میں اس طرح کے مضامین کا صرف ایک فائدہ ہے اور وہ یہ کہ مضامین لکھنے والوں کی حکومت میں قدر و منزلت بڑھ جاتی ہے اور منافع و مناصب حاصل کرنے کی راہ ہموار ہو جاتی ہے۔

مارچ ۱۹۸۳ء

تصوّف کے سلسلے کی کچھ باتیں

خط

ناچیز آپ کے لیے ایک اجنبی شخص ہے۔ بس میں نے آپ کی دو کتابیں پڑھی ہیں۔ پہلی کتاب مولانا علی میاں کے اعتراضات کا جواب ہے اور دوسری کتاب "اسلامی تصوف" ہے۔ یہ کتاب میں نے آپ کے ایک دیرینہ دوست کو مطالعہ کے لیے دے دی ہے۔ اب تک جتنا حصہ وہ پڑھ چکے ہیں اس کی تعریف کی ہے۔ آپ کی کتاب "اسلامی تصوف" پڑھنے کے بعد جو چند سوالات ذہن میں ابھرے ہیں وہ آپ کو لکھ رہا ہوں۔ امید ہے کہ مفصل جواب دیں گے۔

حدیث جبرئیل میں "احسان" کا جو ذکر ہے اسے کیسے حاصل کیا جائے اور اس کے لیے کیا طریقہ اپنایا جائے جبکہ تصوف کی عمارت ہی اس پر کھڑی ہے۔ میں نے اب تک جماعت کی جتنی کتابوں کا مطالعہ کیا ہے ان میں تعلق باللہ پر زور دیا گیا ہے لیکن کیا عام انسان بغیر کسی اہل اللہ کی صحبت کے وہ مقام پا سکتا ہے؟ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ جماعت کی کتابوں کے مطالعہ سے دین کی معلومات حاصل ہوتی ہیں اور زندگی بدل جاتی ہے لیکن قلب کی اصلاح اور توجہ الی اللہ نہیں ہو پاتی۔ یہ میرا اپنا ذاتی خیال ہے اور کچھ دوسرے لوگ بھی ایسا ہی خیال رکھتے ہیں۔ اگر کوئی شخص اوراد و وظائف پڑھتا ہے تو ثواب یقیناً ملے گا لیکن قلب کا ذاکر ہونا میری دانست میں بغیر بزرگوں کی توجہ کے ناممکن ہے اور جب تک قلب ذاکر نہ ہوگا "احسان" کا مقام حاصل نہیں ہوگا۔ ہاں ایک عامی آدمی کو آپ کی کتاب کے مطالعہ سے معلومات حاصل ہو جائیں گی۔ اور اس کے اخلاق بھی درست ہو سکتے ہیں لیکن قلب کا ذاکر ہونا بغیر توجہ ناممکن ہے اس کی مثال

ایسی ہے جیسے بغیر استاذ کے کوئی شخص "الف" "ب" کی کتاب لے کر بیٹھ جائے اور پڑھنا شروع کر دے۔ کیا کوئی شخص بے استاد علم حاصل کر سکتا ہے۔ اگر پڑھ لے گا تو معنے مطلب نہیں جان سکے گا۔

میں برابر مکتوبات امام ربانی کا مطالعہ کرتا رہتا ہوں۔ کہیں بھی میں نے ان کی تحریر میں خلاف شریعت کوئی بات نہیں پائی۔ حضرت مخدوم بہاری کی مکتوبات صدی بھی نظر سے گزری ہے۔ ہر چیز شریعت کے مطابق ہے۔ ایک شخص کسی بزرگ کی صحبت میں بیٹھ کر چند ساعت میں وہ مقام حاصل کر لیتا ہے جو لاکھ اوراد و وظائف پڑھنے کے بعد بھی حاصل نہیں ہو پاتا۔

کیا ایک شخص کسی سلسلے میں بیعت بھی ہو اور آپ کی جماعت سے گہری ہمدردی بھی رکھتا ہو اور آپ کے طریقہ کار سے موافقت بھی رکھتا ہو، رکن ہو سکتا ہے؟ جبکہ وہ رکن بننے کے پورے شرائط کو پورا کرے۔

جواب

تصوف کے سلسلے میں جو باتیں آپ نے دریافت کی ہیں وہ فی الواقع بہت مفصل جواب کی طالب ہیں۔ تصوف کی ابتدا، پھر رفتہ رفتہ اس میں تغیرات، مقصد زندگی کی تعیین و تشریح، اپنے بندوں سے اللہ تعالیٰ کے مطالبات، سنت اور بدعت کے مفہوم کی وسعت صحیح و غلط کو جانچنے کا حقیقی معیار —— ان سب چیزوں پر جب تک گفتگو نہ کی جائے، کوئی واضح بات سامنے نہیں آسکتی۔ افسوس ہے کہ ایک خط میں اتنی تفصیل جو ایک طویل مقالے کی متقاضی ہے، نہیں کی جا سکتی۔ آپ کے خط سے جو باتیں جواب طلب معلوم ہوئیں ان کے نمبروار مختصر جوابات حاضر کر رہا ہوں۔

(۱) ایک بات تو آپ نے یہ لکھی ہے کہ حدیث جبرئیل میں جس احسان کا ذکر ہے اس کو کیسے حاصل کیا جائے، طریقہ کیا ہو جب کہ تصوف کی عمارت ہی اس پر کھڑی ہے۔

یہ حقیر عرض کرتا ہے کہ حدیث شریف میں جس "احسان" کا ذکر ہے اس کو اسی طرح حاصل کیا جائے جس طرح نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے تعلیم دی ہے۔ وہ احسان

اسی طرح اور اسی طریقے سے حاصل کیا جا سکتا ہے جو حضورؐ نے سکھایا ہے۔ انبیاء کرام علیہم السلام کا ایک اہم کام نفوس کا تزکیہ کرنا اور تعلق باللہ کو زندہ اور مستحکم کرنا تھا اس لیے اس سلسلے کی کوئی چیز اللہ کی کتاب اور رسول اللہ کی سنت نے چھوڑ نہیں دی ہے۔ ان دونوں صحیح ترین ماخذوں میں سب کچھ موجود ہے۔ کتاب و سنت ہی کے بتائے ہوئے طریقے سے صحابۂ کرام اور تابعین عظام نے "احسان" کا مقام حاصل کیا تھا۔

(۲) "اہل اللہ" اسلام میں کوئی خاص طبقہ نہیں ہے بلکہ وہ تمام لوگ جو اللہ و رسولؐ کے مطیع و فرماں بردار ہوں "اہل اللہ" ہیں۔ صالحین کی صحبت اختیار کرنا یقیناً ضروری ہے۔

(۳) آپ نے قلب کے ذاکر ہونے کی بات لکھی ہے۔ اس کا ایک مفہوم تو یہ ہے کہ مسلمان ہر وقت دو باتوں کا خیال رکھے۔ ایک یہ کہ اس سے کوئی فرض و واجب اور کوئی ایسا کام چھوٹنے نہ پائے جس کا شریعت نے مطالبہ کیا ہے اور دوسری بات یہ کہ اس سے کوئی ایسی حرکت سرزد نہ ہو جس سے شریعت نے روک دیا ہے اور اگر نفس اور شیطان کے اغوا سے کوئی ناجائز کام ہو جائے تو فوراً خدا کی طرف پلٹے اور توبۂ نصوح کرے۔ اس کا دوسرا مفہوم یہ ہے کہ جس طرح ہماری زبان اللہ اللہ کہتی ہے اسی طرح ہمارا دل بھی اللہ اللہ کہنے لگے اگر آپ نے اسی مفہوم میں قلب کے ذاکر ہونے کی بات لکھی ہے تو برادرم میں اپنے علم کی حد تک یہ عرض کرتا ہوں کہ کتاب و سنت میں کہیں اس کی تعلیم نہیں دی گئی ہے کہ دل سے اللہ اللہ کی آواز نکلنے لگے اور نہ ہمیں اس کا مکلف قرار دیا گیا ہے اگر ہمارا مالک اللہ رب العزت ہم سے یہ چاہتا کہ ہمارا دل بھی اللہ اللہ کہنے لگے تو وہ اس کی ترغیب دیتا اور اللہ کے رسول اس کا طریقہ ضرور بتاتے —— استاذ کی ضرورت مسلم ہے لیکن پہلے تو یہ بات ثابت ہو جائے کہ اس چیز کا حاصل کرنا مطلوب ہے جس چیز کا ہم سے مطالبہ نہ ہو، اس کے لیے ہم استاد کیوں تلاش کریں؟

(۴) مکتوبات امام ربانی اور مکتوبات صدی کا اس حقیر نے بھی بغور مطالعہ کیا ہے اور ان میں خلاف شریعت باتیں پائی ہیں۔ مثال کے طور پر مکتوبات امام ربانی میں ذکر لسانی

کو بدعت قرار دیا ہے حالاں کہ قرآن کی آیتیں اور حدیثیں ذکر لسانی کی تعلیم سے بھری ہوئی ہیں اور صرف ذکر قلبی کی تعلیم نہ قرآن میں ہے اور نہ احادیث میں۔ یہاں تک کہ شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے بھی اس کا اعتراف کیا ہے کہ زبان ہلائے بغیر صرف ذکر قلبی کی تعلیم احادیث میں نہیں ہے۔ اسی طرح مکتوبات صدی میں مثال کے طور پر جہنم سے نجات اور جنت حاصل کرنے کے لیے عمل کرنے کی تنقیص و تحقیر کی گئی ہے۔ حالانکہ قرآن کریم میں جنت حاصل کرنے کے لیے عمل کی ترغیب دی گئی ہے۔

(۵) آپ نے لکھا ہے :-

"ایک شخص کسی بزرگ کی صحبت میں بیٹھ کر چند ساعت میں وہ مقام حاصل کر لیتا ہے جو لاکھ اوراد و وظائف پڑھنے کے بعد بھی حاصل نہیں ہو پاتا۔"

پہلی بات یہ کہ "مقام" کی توضیح آپ نے نہیں کی۔ وہ کون سا مقام ہے جو وہ حاصل کر لیتا ہے۔ دوسری بات یہ کہ کیا اس مقام کو حاصل کرنے کی کوئی ترغیب کتاب و سنت میں موجود ہے؟ تیسری بات یہ کہ قرآن کریم کی آیتیں سن کر بھی بہت سے کافر مسلمان ہو گئے ہیں اور بہت سے فاسق مسلمان متقی مسلمان بن گئے رہیں۔ برادر! اصل چیز خود انسان کے اندر کا "جوہر قابل" ہے۔ یہ موجود ہو تو بزرگوں کی صحبت بھی مفید ہوتی ہے اور دوسرے ذرائع بھی مفید ہوتے ہیں اور کسی کے اندر جوہر قابل ہی موجود نہ ہو تو کوئی چیز مفید نہیں ہوتی۔

(۶) اس حقیر نے خود خانقاہ مجیبیہ پھلواری شریف میں حضرت مولانا محی الدین قادری مجیبی کے ہاتھ پر بیعت کی ہے اور جماعت اسلامی ہند کا رکن بھی ہے۔

جنوری ۱۹۸۲ء

مروّجہ تصوّف ــــــ محض ایک فلسفہ

ان دنوں ہمارے جدید تعلیم یافتہ خصوصیت کے ساتھ تصوف کی طرف بہت متوجہ ہیں۔ ابھی پٹنہ اور علی گڑھ میں اس پر سمینار منعقد ہو چکے ہیں۔ خدا بخش لائبریری کے ڈائرکٹر بیدار صاحب رام پوری بھی اس معاملہ میں بیدار ہیں۔ اگرچہ اس حقیر کو بھی موجودہ فلسفیانہ تصوف سے دل چسپی ہے مگر ناقد کی حیثیت سے۔ بحمد اللہ یہ دل چسپی نہ بے عملی کے جواز کے لیے ہے اور نہ اندھے پن کے ساتھ ــــ بلکہ ایک ایسے ناقد کی حیثیت سے جو اس کی خوبیوں کا معترف بھی ہے اور اس کی ناخوبیوں پر معترض بھی۔ انسان کی عمر قلیل ہے اور موضوعات علمی کثیر ہیں۔ میں نے ان موضوعات کو جن کا تعلق براہ راست یا بالواسطہ دین اسلام سے بلکہ اس کی اقامت سے ہے، سوچ سمجھ کر اپنے لیے منتخب کر لیا ہے ــــ اس میں میرا کوئی قابل ذکر کارنامہ نہیں ہے لیکن اللہ تعالٰی نے جو کچھ بھی صلاحیت عطا فرمائی ہے، میں اس کو اسی میں کھپا رہا ہوں اور دعا کرتا رہتا ہوں کہ آخر دم تک اسی میں لگا رہوں۔ تصوف پر جو سمینار پٹنہ اور علی گڑھ میں ہوا اور جس میں بڑے اور چھوٹے اعیان علم نے حصہ لیا اس کا اصل مقصد یہ تھا کہ تصوف کے مخطوطات کی تلاش کر کے اس کی ایک مکمل اور مفصل فہرست تیار کی جائے۔ یہ ایک بڑا کام اور ایک اچھا علمی کام ہے۔ ہم جیسے لوگوں کے لیے اس کا بڑا فائدہ ہوگا کہ یہ بات کھل کر سامنے آجائے گی کہ ان میں امرت کتنا ہے اور زہر کتنا؟ دیکھا یہ جا رہا ہے کہ وہ لوگ جو تصوف کی کتابوں کی طرف متوجہ ہیں یا اس کی تحقیق کر رہے ہیں ان میں اکثر حضرات کا عملی تعلق تصوف سے کچھ بھی نہیں۔ محض حقیر ہے۔ بس زیادہ سے زیادہ نماز روزے تک ــــ اس لیے یہ سوال ذہن میں پیدا ہوتا ہے

کہ اس کا محرک کیا ہے؟ علمی ورثہ کی محافظت یا کچھ اور؟ میں نیتوں پر حملہ نہیں کرتا لیکن قرائن سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہندوستان کے سیکولرزم اور وحدت ادیان کو اگر تقویت مل سکتی ہے تو اسی فلسفیانہ تصوف سے۔ چنانچہ بعض اہل علم اس سے یہ کام لے بھی رہے ہیں۔ یونانی فلسفہ سے متاثر تصوف اور ہندوستانی ویدانت میں محض معمولی فرق ہے۔ مجرد عشق الٰہی اور اللہ کی ذات بحت رب بے صفات ذات تک رسائی دونوں ہی کی منزل مقصود ہے۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں اس پر جو سیمینار ہوا تھا اس میں پروفیسر مقبول احمد صاحب نے اپنے کلیدی خطبے میں یہ بجا فرمایا :-

"اور تصوف زندگی کو بہتر بنانے کا ذریعہ ہی نہیں بلکہ ایک فلسفہ بھی ہے۔"

(قومی آواز لکھنؤ، ۲۶ر فروری ۱۹۸۵ء)

یہ حقیر اتنا اضافہ کرتا ہے کہ مروجہ تصوف اصلاً فلسفہ ہی ہے۔ آیات قرآن کی معنوی تحریفات اور موضوع احادیث کا اس میں پیوند لگا دیا گیا ہے۔ شہاب الدین مقتول نے انصاف کے ساتھ یونانی فلاسفہ کو اپنا استاذ اور گرو تسلیم کیا ہے۔ مندوبین کا شکریہ ادا کرتے ہوئے پروفیسر محمد حسین رضوی نے بھی صحیح کہا کہ :

"علم الیقین، عین الیقین اور حق الیقین کا ادراک ہمیں تصوف کے مطالعہ سے ملتا ہے اس سلسلے میں جملہ رموز کا علم حاصل کرنا ضروری ہے۔"

قرآن کریم کی ان اصطلاحات کو تصوف میں کیا بنا دیا گیا ہے اس پر گفتگو کا یہ موقع نہیں۔

اپریل ۱۹۸۵ء

ایک گمراہ کن عبارت

عربی زبان کے ایک روزنامہ "المدینۃ" کے ہفتہ وار ایڈیشن ۱۴ ستمبر ۱۹۸۴ء میں ایک مضمون "سراج السالکین" کے عنوان سے شائع ہوا ہے۔ مضمون نگار کا نام "اوالی عبدالکریم" ہے۔ انھوں نے تمہید میں تصوف کی کتابوں پر سخت الفاظ میں تنقید کی ہے۔ ہم اس سے قطع نظر کرتے ہیں۔ مضمون نگار نے لکھا ہے کہ سراج السالکین تصوف کی قدیم کتاب ہے جو بڑی تعداد میں اب بھی شائع کی جارہی ہے انھوں نے لکھا ہے کہ تصوف کی کتابوں پر تنقید کا ایک سلسلہ شروع کر رہے ہیں۔ ان کا مضمون پڑھ کر اس پہلو سے اطمینان ہوا کہ عرب ممالک میں بھی یہ احساس پیدا ہو رہا ہے کہ تصوف کی کتابوں میں جو غیر اسلامی چیزیں شامل ہوگئی ہیں ان کو نمایاں کرکے کتاب وسنت کی روشنی میں ان پر تنقید کی جائے۔ مضمون نگار نے اپنے اس مضمون میں یہی خدمت انجام دی ہے۔ ذیل میں ہم اس مضمون کی تلخیص پیش کر رہے ہیں

(زندگیِ نو)

سراج السالکین کے مؤلف نے صفحہ ۴۹ پر لکھا ہے:۔

اربعة فرض على الشيخ للمريد الاولى يحضره عند الموت يلقنه الشهادة ولو كان المريد فى الشرق او الغرب	پیر پر مرید کے چار فرض ہیں۔ پہلا یہ کہ موت کے وقت وہ اس کے پاس پہنچے اور اس کو کلمہ شہادت کی تلقین کرے۔ اگرچہ مرید مشرق میں ہو یا مغرب میں یا چاروں سمتوں میں چار مرید ہوں تو پیر صاحب سب

اذكانوا اربعة فى جميع الجهات الاربع فانه يحضرهم جميعا ويلقنهم الشهادة الثانية عند سوال الملكين بالقبر يلهمه الجواب الثالثة عند الميزان يرجح حسناته الرابعة عند الصراط يسهل له الجواز -

کے پاس پہنچیں گے اور سب کو کلمۂ شہادت کی تلقین کریں گے۔ دوسرا فرض قبر میں دونوں فرشتوں (منکر نکیر) کے سوال کے وقت کا ہے۔ پیر مرید کے دل میں جواب کا الہام کر دے گا۔ تیسرا فرض میزان کے پاس جہاں پیر، مرید کی نیکیوں کا پلڑا جھکا دے گا اور چوتھا فرض پل صراط کے پاس جہاں پیر مرید کے لیے اس سے گزر جانا آسان بنا دے گا۔

اے برادر اس کو پڑھ کر تعجب نہ کرو اس لیے کہ میں تم کو بتا چکا ہوں کہ جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے عقل سلیم اور دین کی سمجھ عطا کی ہے وہ اگر ان کتابوں کا بہ نظر تحقیق مطالعہ کریں تو جان لیں گے کہ یہ کتابیں خرافات اور دجل وفریب سے بھری ہوئی ہیں۔ رہی یہ عبارت تو میں نہیں سمجھتا کہ اس کی لغویت واضح کرنے کی کوئی خاص ضرورت ہے کیوں کہ اس کا مہمل اور لغو ہونا خود واضح ہے۔ دین کا علم رکھنے والے ہر شخص کو معلوم ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مُحتَضر (وہ شخص جس کی موت کا وقت قریب آگیا ہو) کو کلمۂ شہادت (اَشْهَدُ اَنْ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ) تلقین کرنے کی ترغیب دی ہے۔

مسلم شریف کی حدیث ہے کہ آپؐ نے فرمایا۔ لَقِّنُوْا موتاکم لا الٰہ الا اللہ (تم لوگ اپنے مرنے والوں کو لا الٰہ الا اللہ کی تلقین کیا کرو) یہ بات آپؐ نے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین سے فرمائی تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو پوری انسانیت کے استاذ اور ان کے مرشد تھے اور صحابہ کے درمیان موجود تھے۔ آپؐ نے ان سے یہ نہیں فرمایا کہ میں اپنے ان صحابہ کو جن کی موت کا وقت قریب آگیا ہو۔ ان کے پاس پہنچ کر ان کو لا الٰہ الا اللہ کی تلقین کرتا ہوں، خواہ مرنے والے صحابی مدینہ منورہ میں ہوں یا مکہ مکرمہ میں۔ یہ بات بھی صحیح

احادیث میں آتی ہے کہ آپؐ صحابہؓ کے جنازوں میں شریک ہوتے۔ جنازوں کی نماز پڑھتے اور دفن کے بعد صحابہؓ سے کہتے کہ یہاں سے رخصت ہونے سے پہلے اپنے ساتھی کے لیے ایمان پر ثابت رہنے کی دعا کرو کیوں کہ یہی وقت ہے جب قبر میں ان سے سوال کیا جائے گا۔ آپؐ نے یہ نہیں فرمایا کہ میں قبر میں میت کے دل میں جواب کا القا کر رہا ہوں۔ یعنی اس کے دل میں جواب ڈال رہا ہوں مُردے سے تین سوالات کیے جاتے ہیں۔ تمھارا رب کون ہے؟ تمھارا دین کیا ہے؟ اور اس شخص کے بارے میں کیا کہتے ہو جس کو رسول بنا کر تمھارے پاس بھیجا گیا ہے؟ (یعنی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں کیا کہتے ہو) اگر مردہ، مومنین و مخلصین میں ہوگا تو ان سوالوں کے صحیح جواب دے گا۔ وہ کہے گا کہ میرا رب اللہ ہے میرا دین اسلام ہے اور محمدؐ اللہ کے رسول ہیں۔ اس صحیح جواب کے بعد اس کی قبر جنت کے باغوں میں سے ایک باغ بن جائے گی اور اگر معاملہ اس کے برعکس ہوا تو وہ ہر سوال کے جواب میں کہے گا ہائے ہائے میں نہیں جانتا۔ اس کے بعد اس کی قبر دوزخ کے گڑھوں میں سے ایک گڑھا بن جائے گی۔ نعوذ باللہ من ذالک یہی وہ فتنۂ قبر ہے جس سے پناہ مانگنے کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا ہے، مثلاً ہم یہ کہیں اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُ بِکَ مِنْ عَذَابِ الْقَبْرِ (اے اللہ، میں عذاب قبر سے تیری پناہ مانگتا ہوں) یا یہ کہے اَللّٰھُمَّ انی اعوذ بک من فتنۃ المحیا و الممات (اے اللہ میں زندگی اور موت کے فتنے سے تیری پناہ چاہتا ہوں)

اب رہی قیامت کی بات تو قرآن مجید میں ہے:

فَاِذَا نُفِخَ فِی الصُّوْرِ فَلَآ اَنْسَابَ بَیْنَھُمْ یَوْمَئِذٍ وَّلَا یَتَسَآءَلُوْنَ ۝ فَمَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِیْنُہٗ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝ وَمَنْ خَفَّتْ مَوَازِیْنُہٗ فَاُولٰٓئِکَ الَّذِیْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَھُمْ

پھر جونہی کہ صور پھونک دیا گیا ان کے درمیان پھر کوئی رشتہ نہ رہے گا اور نہ وہ ایک دوسرے کو پوچھیں گے۔ اس وقت جن کے پلڑے بھاری ہوں گے وہی فلاح پائیں گے اور جن کے پلڑے ہلکے ہوں گے وہی لوگ ہوں گے جنھوں نے اپنے آپ کو گھاٹے

فِی جَھَنَّمَ خَالِدُوْنَ ۝ (المومنون: ۱۰۱ تا ۱۰۳) میں ڈال لیا وہ جہنم میں ہمیشہ رہیں گے۔

یَوْمَ تَاْتِیْ کُلُّ نَفْسٍ تُجَادِلُ عَنْ نَّفْسِہَا وَتُوَفّٰی کُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ وَھُمْ لَا یُظْلَمُوْنَ (النحل: ۱۱۱) جب کہ ہر متنفس اپنے ہی بچاؤ کی فکر میں لگا ہوا ہوگا اور ہر ایک کو اس کے کیے کا بدلہ پورا پورا دیا جائے گا اور کسی پر ذرہ برابر ظلم نہ ہونے پائے گا۔

اس مضمون کی بہت سی آیتوں میں سے یہ چند آیتیں ہیں ان سے بھی یہ واضح ہے کہ محشر میں انسان کا موقف کیا ہوگا؟ جہاں باپ بیٹے سے بھاگے گا اور بیٹا باپ سے۔ وہ اتنا ہولناک دن ہوگا کہ ہم اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ اس سلسلے کی صحیح احادیث بھی اتنی زیادہ ہیں کہ ان سب کو یہاں پیش نہیں کیا جا سکتا۔ اگر کوئی شخص صرف اس حدیث کو سامنے رکھے جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے قریبی رشتہ داروں کو بلا کر ان سے کہا تھا کہ تم لوگ اللہ کے غضب سے اپنے آپ کو بچانے کی خود کوشش کرو۔ اللہ کے عذاب سے میں تمھیں نہیں بچا سکتا۔ یہی بات آپؐ نے حضرت فاطمہؓ سے بھی فرمائی تھی۔ اس کے الفاظ یہ تھے:

سلینی ما شئت من مالی لا اغنی عنک من اللہ شیئا تم میرے مال میں سے جو چاہو مانگو اللہ کے عذاب سے بچانے میں تمھیں میں کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتا۔

کتاب وسنت کے ان نصوص کو پڑھیے اور پھر سراج السالکین کے مؤلف کا یہ بیان پڑھیے کہ پیر اپنے مریدوں کی نیکیوں کے پلڑے کو جھکا دیں گے اور ان کو پل صراط سے گزار دیں گے۔ سبحانک اللّٰھُمَّ، ھذا افتراء مبین (اے اللہ! تیری ذات پاک ہے۔ یہ کھلا ہوا افتراء ہے)

بلاشبہ اللہ کے اولیا ہیں۔ ہم ان کی ولایت پر یقین رکھتے ہیں جیسے ابوبکرؓ و عمرؓ اور دوسرے وہ صحابۂ کرامؓ رضوان اللہ علیہم اجمعین جن کو جنت کی بشارت دی گئی ہے۔ اس لیے کہ جنت میں متقی مومن داخل ہوں گے۔ ایمان اور تقویٰ دونوں ولایت کی شرط ہیں۔

اسی طرح ہم یہ بھی یقین رکھتے ہیں کہ شیطان کے بھی اولیار ہیں جن کو قرآن نے اولیار طاغوت کہا ہے ۔ اولیار اللہ اللہ کے عذاب سے ڈرتے رہتے ہیں۔ اللہ کا خوف ان کی صفت ہوتی ہے۔ اللہ ان کے بارے میں فرماتا ہے: اِنَّ الَّذِین ھم من خشیۃ ربھم مُشفِقُوْن ٥ جو لوگ اپنے رب کے خوف سے ڈرتے رہتے ہیں۔ (المومنون: ۵) رہے اولیار الشیطان تو وہ اللہ سے نہیں ڈرتے اور اس کے عذاب سے بے خوف رہتے ہیں۔

اَفَاَمِنُوْا مکرَ اللہِ فَلَا یامن مکرَ اللہ اِلَّا القَومُ الخٰسِرُوْنَ ٥ (الاعراف: ۹۹)

کیا یہ لوگ اللہ کی تدبیر سے بے خوف ہیں حالانکہ اللہ کی تدبیر سے وہی قوم بے خوف ہوتی ہے جو تباہ ہونے والی ہے۔

مکر کے معنی خفیہ تدبیر کے ہیں۔ خدا کی خفیہ تدبیر کا مطلب یہ ہے کہ خدا وہاں سے پکڑتا ہے جہاں سے پکڑے جانے کا کسی کو گمان بھی نہیں ہوتا۔ لوگ اللہ تعالیٰ کی معصیتوں میں مشغول رہتے ہوئے اس خوش گمانی میں مبتلا رہتے ہیں کہ سب خیریت ہے حالانکہ اللہ کا عذاب ان کو گھیرے میں لے رہا ہوتا ہے۔

اس مضمون کے پڑھنے والوں سے میں کہتا ہوں کہ آپ نے کتاب وسنت کی تصریحات پڑھ لیں۔ پھر خود فیصلہ کریں کہ سراج السالکین میں جو بات لکھی گئی ہے اس کی حیثیت کیا ہے۔ میں تو اس کے بارے میں وہ بات کہتا ہوں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی ہے:

اذا لم تستحی فاصنع ماشئت — بے حیا باش وہرچہ خواہی کن

سوڈان میں ملحدانہ تصوف کا ایک داعی

جس کو شرعی عدالت نے موت کی سزا دی

۱۹۸۵ء میں سوڈان نے ایک ایسا واقعہ دیکھا جو صدیوں سے دیکھا نہیں گیا تھا منصور حلاج کی سولی کے بعد محمود محمد طٰہٰ کی پھانسی ایک ایسا واقعہ ہے جو چشم فلک نے بارہ سو سال کے بعد دیکھا۔ جرم وہی تھا جو حلاج کا تھا اس فرق کے ساتھ کہ حلاج نے کوئی جماعت نہیں بنائی تھی اور محمود طٰہٰ نے ابتداءً "تحریک جمہوریت" کے نام سے ایک سیاسی جماعت بنائی اور پھر اس نے اس کو تحریک الحاد میں تبدیل کر دیا۔

الحرکۃ الجمہوریۃ:۔

یہ پارٹی اواخر اکتوبر ۱۹۴۵ء میں قائم ہوئی۔ یہ وہ سال ہے جس میں سوڈان کی بہت سی سیاسی پارٹیاں قائم ہوئی تھیں۔ محمود محمد طٰہٰ کی پارٹی کا پورا نام یہ تھا۔ "الحزب الجمہوری الاشتراکی"۔ یہ پارٹی جمہوریت و اشتراکیت کی طرف دعوت دیتی اور سوڈان کو انگریزوں اور مصر دونوں کے اقتدار سے آزاد کرنا چاہتی تھی۔

محمود محمد طٰہٰ کی ڈگری:

انھوں نے خرطوم کے کالج غردوں سے انجینئرنگ کا ڈپلوما حاصل کیا تھا شاید یہی وجہ ہے کہ ابتداءً ان کی پارٹی میں بہت سے دانشور، ادیب اور شاعر جمع ہو گئے تھے اور پھر ان میں سے بہت سے دانشوروں نے علیحدگی اختیار کر لی تھی۔

خاندان :

استاذ محمود، سوڈان کے ایک ایسے خاندان سے تعلق رکھتے تھے جو تصوف میں غلو رکھتا تھا۔ ان کے دادا الشیخ الھمیم سوڈان کی تاریخ تصوف میں ایک معروف شخصیت ہیں۔ سوڈان میں تحریک تصوف کے مورخ" ود ضیف اللہ" نے اپنی کتاب" الطبقات" میں لکھا ہے کہ شیخ ہمیم نے وصول الی اللہ کا دعویٰ کیا تھا اور یہ کہا تھا کہ اللہ نے ان سے شرعی تکالیف ساقط کر دی ہیں۔ انھوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ شیخ ہمیم نے بیک وقت سات عورتوں سے نکاح کیا تھا اور جمع بین الاختین (دو سگی بہنوں سے بیک وقت نکاح) کے مرتکب بھی ہوئے تھے۔ قاضی شریعت شیخ وشین نے اس کا انکار کیا تھا اور یہ اعلان کیا تھا کہ یہ نکاح باطل ہیں۔ شیخ ہمیم نے اشعار میں اس کا جواب دیا تھا کہ تمھارا دین کچھ اور ہے اور ہمارا دین کچھ اور ہے۔

شیخ محمود :

شیخ محمود محمد طٰہ جب انجینئر ہو گئے تو کئی سال تک انھوں نے سرکاری ملازمت بھی کی۔ اس اثنا میں انھوں نے بہت سے مغربی فلاسفہ کا مطالعہ کیا اور ان سے فیض حاصل کیا۔ برطانوی استعمار کے خلاف انھوں نے جد و جہد کی اور ایک خاص مسئلے میں خاصی شہرت حاصل کی۔ سوڈان میں قدیم زمانے سے لڑکیوں کے ختنے کا رواج بھی تھا اس کو" الخفاض الفرعونی" کہتے ہیں۔ لڑکیوں کے ختنے کا یہ رواج کہا جاتا ہے کہ فرعون کے وقت سے اس وقت تک رائج ہے۔ شاید اسی لیے اس عمل کو" الخفاض الفرعونی" کہتے ہیں۔ انگریزوں نے اس عمل کو قانوناً ممنوع قرار دیا اور پانچ سال قید اس کی سزا مقرر کی۔ محمود نے اس ممانعت کی مخالفت کی اور اس کے خلاف بیانات اور پمفلٹ شائع کیے۔ برطانوی افسر پولیس نے ان کو تھانے میں بلایا اور ایک پمفلٹ دکھایا جو ان کے نام سے شائع ہوا تھا۔ انھوں نے اس کا اقرار کیا اور افسر سے بحث شروع کر دی۔ آخر کار برطانوی جج نے ان کو قید کی سزا دی اور وہ جیل بھیج دیئے گئے۔ سزا تو ایک سال کی تھی لیکن پچاس دنوں کے بعد وہ جیل سے چھوڑ دیئے گئے۔

اتفاق ایسا ہوا کہ جیل سے باہر آنے کے دو ماہ بعد ایک قابلہ (دایہ) کو ایک لڑکی کا ختنہ کرنے کے جرم میں چار ماہ کی سزا دی گئی۔ استاذ محمود نے اس کے خلاف اشتعال انگیز تقریر کی۔ اس علاقے کے ایک بڑے مجمع کی قیادت کرتے ہوئے پولیس اسٹیشن پہنچ گئے، اس کا محاصرہ کر لیا اور اس میں گھس گئے، اور اس عورت کو چھڑا لائے۔ اس جرم میں ان کو دو سال کی سزا دی گئی۔ جیل کے اس دو سالہ قیام میں انھوں نے اپنے خاندانی تصوف پر غور کیا اور اس پر عمل بھی کیا۔ یہ دو سالہ قیام ان کے فکری الحاد کا نقطۂ آغاز بن گیا۔

۳ سالہ گوشہ نشینی:

جیل سے نکلنے کے بعد وسطی سوڈان کے شہر "رفاعہ" میں انھوں نے تین سال مزید گوشہ نشینی اختیار کی۔ شاید اسی میں انھوں نے پورا منصوبہ تیار کر لیا ہو وہ منصوبہ یہ تھا کہ سیاسی عمل اور صوفی فکر کو ملا کر پیش کیا جائے۔

میدانِ عمل میں:

۱۹۵۱ء کے اواخر میں شیخ محمود محمد طٰہٰ اپنی گوشہ نشینی سے باہر آئے اور اس ہیئت و شکل میں جیسے وہ قدیم زمانے کے کوئی صوفی اور فلسفی ہیں۔ سر کے اور داڑھی کے بال بڑھے ہوئے سادہ اور پرانا لباس، ننگے سر، لوگوں کو اپنے گرد جمع کرنے کے لیے حدیث نبوی کا ایک مدرسہ کھولنے کا ارادہ ظاہر کیا اور خود چندہ جمع کرنے کے لیے لوگوں کے پاس جانے لگے لیکن یہ ارادہ زیرِ عمل نہیں آسکا اور انھوں نے کتابیں لکھنی شروع کر دیں۔ ۱۹۵۲ء میں انھوں نے سب سے پہلی کتاب "قُل ھٰذہٖ سبیلی" کے نام سے لکھی اس میں انھوں نے ایک عالمی حکومت کی دعوت پیش کی اور از سرِ نو "الخفاض الفرعونی" کی حمایت کی۔ ۱۹۵۵ء میں سوڈان کی آزادی سے کچھ پہلے جب ملک میں دستور کی بحث چھڑی ہوئی تھی یعنی دستور اسلامی ہو یا سیکولر۔ اس موقع پر انھوں نے اسس دستور السودان (سوڈان کے دستور کی بنیادیں) کے نام سے ایک کتاب لکھی۔ سب سے پہلے اسی کتاب میں ان کے "فکر باطنی" کی جھلک نظر آئی۔

معرکے:

"جمہوری پارٹی" دوسری پارٹیوں سے مختلف مسائل میں لڑتی رہی اور سوڈان کی آزادی کے بعد اسماعیل ازہری اور ان کے بعد عبداللہ خلیل کی قیادت میں جو حکومتیں بنیں ان سے بھی اس کی سیاسی جنگ جاری رہی۔ یہاں تک کہ فوج نے حکومت پر قبضہ کر لیا اور ابراہیم عبود برسر اقتدار آ گئے۔ فوج نے تمام پارٹیوں کو ختم کر دیا۔ چھ سال تک ملک پر فوج کی مطلق العنان حکومت قائم رہی۔ اس دوران میں "الحزب الجمہوری" داخلی طور پر اپنے خیالات پھیلاتی رہی۔ ۱۹۶۰ء میں اس پارٹی نے ایک کتاب "الاسلام" کے نام سے شائع کی اور دنیا نے پہلی بار سنا کہ اسلام دو قسم کے پیغام کا حامل ہے۔ اس کے پہلے پیغام کا زمانہ گزر چکا اور اب اس کے دوسرے پیغام کا زمانہ ہے اور یہ دوسرا پیغام اشتراکیت ہے۔ اس دوسرے پیغام کے لحاظ سے انسان بالکل آزاد ہے اس کی حریت پر کسی طرح کی کوئی قید لگی ہوئی نہیں ہے۔ ۱۹۶۴ء میں فوجی حکومت ختم ہوئی اور تمام پارٹیوں نے کھل کر سیاست میں حصہ لینا شروع کیا۔ محمود محمد طہٰ نے اپنی ملازمت ترک کر دی اور اپنی پارٹی کے کام کے لیے فارغ ہو گئے اور اب کتابوں، بیانات اور پیغامات کا ایک سیلاب آ گیا ان کی پارٹی نے کھلم کھلا دین دار لیڈروں اور علمائے دین سے سیاسی و فکری جنگ چھیڑ دی۔ اخبارات و رسائل دونوں طرف کی بحثوں سے بھر گئے۔ محمود کی ایک کتاب نے مسلمانوں کو غم اور غصے سے بھر دیا جس میں اس نے بڑی صراحت کے ساتھ لکھا تھا کہ اسلام کا پہلا پیغام بیسویں صدی کے انسانوں کے لیے مناسب نہیں ہے اس کے علاوہ بہت سی خرافات اس کتاب میں موجود تھیں۔ آخر کار ۱۹۶۸ء میں دو عالموں نے شرعی عدالت میں یہ مقدمہ دائر کر دیا کہ حزب جمہوری کا لیڈر مرتد ہو گیا ہے۔ ارتداد ثابت ہو جائے تو اس کو ارتداد کی اسلامی سزا دی جائے۔ اس کی پارٹی پر پابندی لگائی جائے۔ اس کی مسلمان بیوی کو اس سے الگ کیا جائے اور اس کے ارتداد کا اعلان عام کیا جائے۔ محکمہ شرعیہ نے قاضی احمد توفیق الصدیق کی صدارت میں اس الزام کی تحقیق کی اور ۱۸ نومبر ۱۹۶۸ء کو یہ فیصلہ سنایا کہ محمود محمد طہٰ مرتد ہو گیا ہے۔ لیکن ملک کے حالات اس وقت ایسے

تھے کہ اس کو ارتداد کی سزا نہیں دی گئی۔ اس طرح قاضی کا یہ فیصلہ الحزب الجمہوری کے لیے مفید ہو گیا۔ بہت سے دانش ور اس کی حمایت کرنے لگے۔ برل خیال کے ادیبوں اور دانش وروں نے اس فیصلے کے خلاف اخبارات ورسائل میں مضامین لکھے اور حزب جمہوری نے طاقت پاکر اپنے خیالات کی اشاعت تیز کردی۔ اس وقت پارلیمنٹ میں جو دستور اسلامی زیر بحث تھا محمود کی پارٹی نے اس کے خلاف مہم چلائی اور دستور اسلامی کے حامیوں کو "رجعت پسند" کہنا شروع کیا۔ سوڈان کی اشتراکی پارٹی اور چند دوسری پارٹیوں نے اس کی تائید شروع کردی۔ ابھی یہ بحث جاری ہی تھی کہ ۲۵ مئی ۱۹۶۹ء کو فوج نے دوبارہ ملک پر قبضہ کرلیا اور تمام سیاسی پارٹیوں کا کاروبار پھر ختم ہو گیا۔

ملحدانہ تصوف:

جیسا کہ اوپر گزرا محمود کا دادا بھی ملحدانہ تصوف میں مبتلا تھا اسی خاندانی تصوف نے محمود کو بھی تباہ کیا۔ اس کا خیال تھا کہ اللہ نے انسان کو اپنی ذات سے پیدا کیا ہے اور اس کی دلیل میں وہ سورۂ نسار کی پہلی آیت پیش کرتا ہے:

يَا أَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوا رَبَّكُمُ	اے لوگو! اپنے رب سے ڈرو جس
الَّذِي خَلَقَكُم مِّن نَّفْسٍ وَاحِدَةٍ	نے تم کو ایک جان سے پیدا کیا۔

محمود کہتا ہے کہ نفس واحدہ سے اللہ کی ذات مراد ہے۔ انسان ترقی کرتا رہتا ہے یہاں تک اللہ کی ذات میں مل جائے۔ انسان کے خدا بن جانے کا استدلال وہ دو آیتوں سے کرتا ہے۔

يَا أَيُّهَا الْإِنسَانُ إِنَّكَ كَادِحٌ	اے انسان تجھ کو تکلیف اٹھانی ہے
إِلَىٰ رَبِّكَ كَدْحًا فَمُلَاقِيهِ (الانشقاق)	اپنے رب تک پہنچنے میں سہ سہ کر پھر اس سے
وَأَنَّ إِلَىٰ رَبِّكَ الْمُنتَهَىٰ (النجم)	ملنا ہے اور یہ کہ تیرے رب تک سب کو پہنچنا ہے۔

یہ بات محمود نے اپنی کتاب "عقیدۃ المسلمین الیوم" میں لکھی ہے۔ اس نے اپنی دوسری کتاب "الرسالۃ الثانیہ من الاسلام" میں اپنی اس کتاب کی تشریح کی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اسلام

میں انسان کا اطلاق یعنی اس کا مطلق ہونا اصل ہے اور اطلاق اللہ کی شان ہے۔ لہذا انسان ترقی کر کے محدود سے مطلق ہو جاتا ہے۔ وہ اپنی کتاب میں سوال قائم کرتا ہے کہ اللہ سے ملاقات کہاں ہوگی اس کی زمین میں یا اس کے آسمان میں؟ اور پھر خود جواب دیتا ہے اس موضوع حدیث کو پیش کر کے جس میں خدا نے کہا ہے کہ میری گنجائش نہ میری زمین میں ہے اور نہ میرے آسمان میں۔ میری گنجائش تو میرے مومن بندے کے قلب میں ہے۔ اسی طرح محمود نے انسان کی الوہیت یا امکان الوہیت کی بات اپنی متعدد کتابوں میں لکھی ہے اور اس باطل خیال کو پھیلانے کی کوشش کی ہے۔ وہ قرآن کی آیتوں میں معنوی تحریف کرتا ہے اور موضوع حدیثیں پیش کرتا ہے۔ اس نے اپنی کتاب "الرسالۃ الثانیۃ" میں لکھا ہے کہ انسان اللہ کی اطاعت کرتا ہوا اس مقام تک پہنچ جاتا ہے کہ

فهو قد اطاع	پس اس نے اللہ کی اطاعت کی یہاں تک
الله حتى اطاعه الله	کہ اللہ نے اس کی اطاعت کی اس کے فعل
معارضة لفعله	کے بدلے میں۔ پس وہ زندہ رہتا ہے اللہ
فيكون حياً حياة الله	کی زندگی سے، عالم ہوتا ہے اللہ کے علم سے
وعالما علم الله ومريد ارادة	ارادہ کرنے والا ہوتا ہے اللہ کے ارادے
الله وقادرا قدرة الله	سے اور قادر ہوتا ہے اللہ کی قدرت سے
ويكون الله	اور وہ اللہ ہو جاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کے بارے میں بھی محمود اور اس کے متبعین نے لغو اور بیہودہ باتیں لکھی ہیں۔ مثلاً یہ کہ اللہ امرد کی شکل میں ہے لہذا انسان کو بھی داڑھی اور مونچھ مونڈ دینی چاہیے۔ محمود کے متبعین اس کو خدا کہتے ہیں نظم و نثر دونوں میں۔ وہ یہ بھی کہتے تھے کہ محمود کو موت کی سزا نہیں دی جا سکتی۔ حد یہ ہے کہ جب اس کو موت کی سزا دے دی گئی تو اس کا ایک مرید چیخ اٹھا:

وما قتلوه وما صلبوه ولكن	اور انھوں نے نہ اس کو قتل کیا اور نہ سولی پر
شُبِّهَ لَهُمْ (النساء: ۲۲)	چڑھایا لیکن وہی صورت بن گئی ان کے آگے۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے مصلوب ہونے کی تردید کی ہے۔
جب محمود کے مرید نے یہ آیت پڑھی تو پولیس نے اس کو پکڑ لیا اور اعلان کیا کہ اس کو عدالت میں پیش کیا جائے گا۔ لیکن بعد کو اس نے اپنے قول سے توبہ کی اور چھوڑ دیا گیا۔

ارکان اربعہ:

نماز، روزہ اور حج کے بارے میں محمود کے خیالات اور عمل۔ ایک مجلس عام میں اس سے پوچھا گیا کہ وہ رمضان کے روزے رکھتا ہے یا نہیں؟ اس کے جواب میں اس نے کہا۔ میں رمضان میں دن کے وقت کھاتا ہوں لیکن پیٹ بھر کے نہیں کھاتا۔ حج کے بارے میں سوال کیا گیا تو کہا کہ میں اپنے دل کے ارد گرد طواف کرتا ہوں۔ نماز کے بارے میں دریافت کیا گیا تو کہا میں "اصلی" نماز پڑھتا ہوں۔ جمہوریوں نے نماز کو دو قسموں میں بانٹ دیا ہے۔ نماز تقلید۔ نماز اصالۃ۔ ان لوگوں کے نزدیک نماز تقلید وہ ہے جس میں مسلمان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تقلید کرتے ہیں اور نماز اصالۃ" وہ ہے جس میں تقلید نہیں ہوتی۔ (رسالۃ الصلوٰۃ مطبوعہ ۱۹۷۹ء)

ان لوگوں نے امت مسلمہ کو بھی دو قسموں میں تقسیم کیا ہے۔ مومنین، مسلمین۔ مومنین تو عام مسلمان ہیں اور مسلمین وہ لوگ ہیں جو واصل باللہ ہو جاتے ہیں۔ مومنین، جب مسلمین کے درجے میں پہنچ جاتے ہیں تو ان سے شرعی یا تقلیدی نماز ساقط ہو جاتی ہے اور ان میں کا ہر شخص وہ نماز ادا کرتا ہے جو وہ بذات خود اللہ سے حاصل کرتا ہے۔ محمود کا اعتقاد یہ ہے کہ صحابہ کرامؓ "اسلام" کے درجے تک نہیں پہنچ سکے۔ اس کے نزدیک نماز مرتبہ اصالۃ تک پہنچنے کا وسیلہ ہے اور یہ مرتبہ اصالۃ "اتحاد مع اللہ" کا مرتبہ ہے۔ اس مرتبہ پر فائز ہو جانے کے بعد ہر شخص کی اپنی الگ الگ نماز ہے۔

(یہ ایک عربی مضمون کا ترجمہ ہے جو الاصلاح دبی (امارات) جنوری و فروری ۱۹۸۶ء کے دو شماروں میں من هم الجمهوريون بالسودان؟ دراسة فى فكر الذى ارتد کے عنوان سے شائع ہوا تھا۔ مضمون نگار محمد وقیع اللہ احمد پروفیسر جامعہ اسلامیہ ام درمان سوڈان ہیں۔)

باب پنجم

تصوّف کی کتابوں پر

تنقید و تبصرہ

تفسیر الشیخ الاکبر

غیر اسلامی تصوف کے رواج میں اس سلوک کا بڑا دخل ہے جو حضرات صوفیہ نے قرآن کریم کی آیات کے ساتھ کیا ہے۔ یہ سلوک شعوری تھا یا غیر شعوری، صحیح تھا یا غلط، اس کا آخری فیصلہ قیامت میں ہوگا۔

اِلَى اللّٰهِ مَرْجِعُكُمْ	آخر کار تم سب کو خدا کی طرف پلٹ
جَمِيْعًا فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا	کر جانا ہے پھر وہ تمھیں اصل حقیقت
كُنْتُمْ فِيْهِ	بتا دے گا جس میں تم اختلاف کرتے
تَخْتَلِفُوْنَ (المائدہ: ۴۸)	رہے ہو۔

اس کے تحت ایک خدا پرست مفسّر نے لکھا ہے:

"جو اختلافات انسانوں نے اپنے جمود، تعصب، ہٹ دھرمی اور ذہن کی اُپج سے خود پیدا کر لیے ہیں ان کا آخری فیصلہ نہ مجلس مناظرہ میں ہو سکتا ہے، نہ میدانِ جنگ میں، آخری فیصلہ اللہ تعالیٰ خود کرے گا جبکہ حقیقت بے نقاب کر دی جائے گی اور لوگوں پر منکشف ہو جائے گا کہ جن جھگڑوں میں وہ عمریں کھپا کر دنیا سے آئے ہیں ان کی تہ میں حق کا جوہر کتنا تھا اور باطل کے حاشیے کس قدر۔"

سورۃ الانعام میں فرمایا گیا ہے:

وَلَا تَكْسِبُ كُلُّ نَفْسٍ	ہر شخص جو کماتا ہے اس کا ذمہ دار خود
اِلَّا عَلَيْهَا وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ	ہے کوئی بوجھ اٹھانے والا دوسرے کا بوجھ
اُخْرٰى ثُمَّ اِلٰى رَبِّكُمْ مَّرْجِعُكُمْ	نہیں اٹھاتا، پھر تم سب کو اپنے رب کی

فَيُنَبِّئُكُم بِمَا كُنتُمْ فِيهِ تَخْتَلِفُونَ ٥ (الانعام: ۱۶۴) طرف پلٹنا ہے۔ اس وقت وہ تمھارے اختلافات کی حقیقت تم پر کھول دے گا

یعنی کسی انسان کے غلط افکار و اعمال کی ذمہ داری کسی دوسرے پر نہیں ہے وہ خود اس کا ذمہ دار ہے۔ اور جو لوگ غلط اور صحیح کا فیصلہ اللہ تعالیٰ کی کتاب اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات اور آپؐ کی سیرت سے کرنا نہیں چاہتے ان کے اختلافات کا آخری فیصلہ آخرت میں خود اللہ تعالیٰ فرمائے گا۔

"تفسیر الشیخ الاکبرؒ" کے نام سے ایک کتاب دو جلدوں میں مصر سے شائع ہوئی تھی۔ اس کتاب کے حوالے بعض تازہ مضامین میں میری نظر سے گزرے ہیں۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اہل علم آج بھی اس کتاب کا مطالعہ اور اس سے استفادہ کرتے ہیں۔ بعض محققین نے اس کتاب کے بارے میں دو باتیں لکھی ہیں۔ ایک یہ کہ شیخ اکبر محی الدین ابن عربی کی طرف اس کتاب کا انتساب غلط ہے یہ کمال الدین کاشی کی لکھی ہوئی کتاب ہے اور دوسری بات یہ کہ یہ تفسیر قرآن نہیں ہے بلکہ بہت سی آیات قرآن کی تاویل ہے۔ یہ دوسری بات خود مؤلف نے کتاب کے دیباچے میں لکھی ہے۔ پہلی بات کے بارے میں اس حقیر نے خود کوئی تحقیق نہیں کی ہے یوں بھی اس کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی کہ تاویلات کے پردے میں جو فلسفیانہ تصوف اس کتاب میں پیش کیا گیا ہے وہ شیخ اکبر کی مسلمہ کتابوں، فصوص الحکم اور الفتوحات المکیہ میں موجود ہے۔ نیز یہ کہ جزوی اختلاف کے ساتھ تمام "وجودی" صوفیہ کی کتابوں میں یہ باتیں ملتی ہیں خواہ وہ وحدۃ الوجود کے قائل ہوں یا وحدۃ الشہود کے ——— ان تاویلات نے مسلم معاشرے میں فلسفیانہ اور غیر اسلامی تصوف کو رواج دینے میں مؤثر کردار ادا کیا ہے۔ ہم یہاں معنوی تحریفات کا اندازہ لگانے کے لیے چند مثالیں پیش کریں گے۔ پوری کتاب پر تبصرہ مقصود نہیں ہے۔

تفسیر بالرائے:

دیباچہ میں مصنف نے جو باتیں لکھی ہیں ان میں ایک یہ ہے کہ ان کے نزدیک

قرآن کی تفسیر بالرائے پر جو وعید آئی ہے اس کا تعلق قرآن کے ظاہر یعنی اس کی تفسیر سے، قرآن کے باطن یعنی اس کی تاویل سے نہیں ہے انھوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ تاویلات، اپنے اپنے کشف و وجدان کی بنا پر بدلتی رہی ہیں اور بدل سکتی ہیں۔ مصنف نے اپنی ان باتوں پر نہ کوئی عقلی دلیل پیش کی ہے اور نہ شرعی بلکہ صرف اپنی ذہنی اُپج کے طور پر اسے پیش کیا ہے۔

یہ حقیر عرض کرتا ہے کہ قرآن عزیز جو تاقیام قیامت پوری نوع انسان کے لیے کتاب، ہدایت اور انسانی زندگی کا دستور ہے۔ اس کی آیات کی ایسی تاویلات کو جو مفسرین قرآن کی تفسیرات، منشا و مقاصد، آیات، سیاق وسباق یہاں تک کہ لغت، عرب، کے بھی خلاف ہوں۔ کس دلیل سے جائز قرار دیا جا سکتا ہے؟ قرآن کریم کی تفسیر بالرائے پر جو وعید آئی ہے وہ بدرجہ اولیٰ گمراہ کن تاویلات پر بھی صادق ہے۔ اس حقیر نے جب بعض بزرگوں کا یہ قول پڑھا تھا کہ وہ چاہیں تو پوری ہدایہ (فقہ کی مشہور کتاب) کی تشریح معرفت وسلوک کے مسائل سے کر سکتے ہیں تو مجھے حیرت ہوئی تھی لیکن اس کتاب کی تاویلات پڑھ کر حیرت دور ہو گئی اور معلوم ہوا کہ آیات قرآن کی تحریف معنوی کا کام بھی بہت پہلے شروع ہو چکا تھا ــــــ

اس کتاب کے مصنف نے فنا اور بقا اور وحدۃ الوجود کو اپنے تصوف کا محور بنایا ہے اور اسی محور پر قرآن مجید کو گردش دینے کی سعی کی ہے۔

وجودی نظریہ تصوف کیا ہے؟

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ تاویلات کی مثالیں پیش کرنے سے پہلے اس وجودی نظریۂ تصوف کا مختصر تعارف کرا دیا جائے جو اس کتاب میں پیش کیا گیا ہے فلسفیانہ اصطلاحات، اور تفصیلات سے قطع نظر کر کے اگر وجودی تصوف، کا خلاصہ بیان کرنا ہو تو وہ یہ ہو گا۔

سالک راہ سلوک میں ترقی کرتا ہوا آگے بڑھتا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ مقامِ فنا

پر پہنچ کر "فانی فی اللہ" ہو جاتا ہے۔ اس کا پہلا وجود ختم ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ اس کو دوسرا وجود عطا کرتا ہے اور دوبارہ اپنی ذات سے الگ کر کے اس کو دنیا کی طرف واپس کر دیتا ہے۔ اس طرح وہ "باقی باللہ" ہو جاتا ہے۔ اس دوسرے وجود کے لیے مصنف نے "الوجود الموہوب الحقانی" کا جملہ وضع کیا ہے۔ یعنی اللہ کی طرف سے عطا کردہ حقانی وجود ـــــ وجود کے لحاظ سے وہ ایک "مقام" کو "الجمع" کے اصطلاح سے بیان کرتے ہیں۔ اس مقام میں اللہ کے سوا کوئی موجود نہیں ہے۔ یہاں وہ خود ہی عابد خود ہی معبود، خود ہی آمر خود ہی مامور، خود ہی شاہد اور خود ہی مشہود ہے۔ خود کوزہ و خود کوزہ گر و خود گلِ کوزہ ـــــ وجود ہی کے اعتبار سے دوسرے مقام کو وہ "التفصیل" کی اصطلاح سے پیش کرتے ہیں۔ اسی مقام کے لحاظ سے یہ پوری کائنات موجود ہے اور ذات الٰہی سے جدا ہے لیکن اس کا وجود محض اعتباری اور وہمی ہے۔ یہ وہمی جدائی بھی انسان کے لیے ناقابل برداشت ہے۔ اس لیے مصنف اس کے اس وجود کو اکبر الکبائر (سب سے بڑا گناہ) قرار دیتے ہیں۔ اللہ کی صفات کے بارے میں مولف کا نظریہ یہ ہے کہ وہ عین ذات ہیں۔ یہ ہے ان کے تصوف کی بنیاد جس پر فلسفیانہ تصوف کی ایک پوری عمارت بنائی گئی اور ایک پورا "فن" مرتب کیا گیا ہے۔

تضاد:

یہ فلسفہ چونکہ حقائق پر نہیں بلکہ اوہام پر مبنی ہے اس لیے تضاد بیانی اس کا لازمہ ہے۔ اقتباسات سے پہلے یہاں اس تضاد کی طرف اشارہ کر دینا چاہیے۔

صاحب تاویلات ایک طرف صفات الٰہی کو عین ذات مانتے ہیں۔ یعنی صفات ذات سے الگ نہیں ہیں بلکہ اس میں داخل ہیں اور دوسری طرف وہ ذات، صفات، افعال کی تین الگ الگ تقسیمیں بھی کرتے ہیں اور ہر ایک کے احکام مختلف بیان کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ اسمائے الٰہی میں سے ہر اسم کا ایک الگ تشخص تجویز کرتے ہیں اور مختلف سالکین کے لیے مختلف اسماء کو ان کا مربی قرار دیتے ہیں۔ یعنی کسی سالک کا مربی مثال کے طور پر اسم "قدیر" ہوتا ہے اور کسی کا اسم "علیم" ـــ اسی طرح وہ توحید

کی بھی تین قسمیں بیان کرتے ہیں۔ توحید فی الذات ۔ توحید فی الصفات ۔ توحید فی الافعال۔ یہ تقسیم سالکین کے "ایمان" کے لحاظ سے ہے۔ کوئی سالک توحید فی الافعال تک پہنچ کر رک جاتا ہے، وہ توحید فی الصفات تک ترقی نہیں کرتا اور کوئی توحید فی الصفات تک پہنچ کر رک جاتا ہے، توحید فی الذات تک ترقی نہیں کرتا اور بہت کم ایسے ہیں جو توحید فی الذات تک ترقی کرتے ہوں۔ یہ "اوہام" فلسفیوں کے لیے معقول ہوں تو ہوں، ہم جیسے لوگوں کے لیے نامعقول ہیں۔ صفات جب عین ذات ہیں تو ان میں سے ہر ایک کا الگ الگ تشخص تجویز کرنا اور توحید کو اس طرح کی تین قسموں میں تقسیم کرنا ایک "واہمہ" کے سوا اور کیا ہوگا؟ مؤلف کتاب کا فلسفہ پڑھ کر "ایک تین اور تین ایک کا" فلسفہ یاد آجاتا ہے۔ توحید کی تقسیم کے لحاظ سے مصنف نے جنت کو بھی تین قسموں میں بانٹ دیا ہے۔ جنتِ افعال۔ جنتِ صفات۔ جنتِ ذات۔ حور و قصور والی جنت کو وہ جنت افعال قرار دیتے ہیں جو ان کے خیال میں گھٹیا درجہ کی جنت ہے۔ وہ "رضوان اللہ" کو جنت صفات کہتے ہیں۔ باقی رہی جنتِ ذات تو معلوم نہیں وہ کیا چیز ہے۔ انسان کے باطن یعنی نفس، قلب، روح کے اعتبار سے حور و قصور والی جنت، نفس کی جنت ہے اور رضوان اللہ قلب کی جنت ہے اور جنت ذات روح کی جنت ہے۔ مصنف کے نزدیک چونکہ مقام "الجمع" ہی اصل اور مقصود سالک ہے۔ اس لیے وہ جوش میں مقام تفصیل کو بھی بھول جاتے ہیں۔ چنانچہ "الحمد للہ" کی تاویل میں انھوں نے جمع و تفریق کے فرق کو مٹا ڈالا ہے۔ یہ ہے وہ تصوف جسے آپ مانیں تو تصوف کے قائل ہیں اور نہ مانیں تو تصوف کے منکر ہیں اور "صوفیہ" کی نظر میں آپ کی کوئی وقعت نہیں۔ اس تمہید کے بعد اب اقتباسات ملاحظہ فرمایئے۔

اَلحَمدُ لِلّٰہِ کی تاویل

قرآن کھولتے ہی آپ کے اور ہمارے سامنے الحمد للہ کا فقرہ آتا ہے۔ اس کی تاویل یہ ہے:

فله تعالیٰ مطلق الحمد و ماهیته ازلاً و ابداً علیٰ حسب استحقاقه بذاته باعتبار البدایة والنهایة وما بینهما فی مقام الجمع علی السنة التفاصیل فهو الحامد والمحمود تفصیلا وجمعا والعابد والمعبود مبدأ و منتهیٰ

(تفسیر الشیخ الاکبر ص ۳)

مطلق حمد اور اس کی ماہیت ازلاً وابداً اللہ تعالیٰ کے لیے ہے اس لیے کروہ بذاتہٖ اس کا مستحق ہے۔ بدایت ونہایت اور ان دونوں کے درمیان جو کچھ ہے ان سب کے اعتبار سے، مقام جمع میں تفاصیل کی زبانوں پر۔ پس وہی حامد بھی ہے محمود بھی تفصیل کے اعتبار سے بھی اور جمع کے اعتبار سے بھی اور وہی عابد بھی ہے اور معبود بھی مبدا کے لحاظ سے بھی اور منتہیٰ کے لحاظ سے بھی۔

عبارت کا مطلب یہ ہے کہ پوری کائنات انسانوں سمیت اللہ کی ذات وصفات کی ہی تفصیلات ہیں۔ اس لیے فی الواقع علیحدہ سے نہ کوئی حامد ہے اور نہ عابد، وہ خود ہی حامد بھی ہے اور محمود بھی۔ عابد بھی ہے اور معبود بھی۔ یہی بات خود کوزہ وخود کوزہ گر وخود گلِ کوزہ۔ (خود ہی کوزہ بنانے والا ہے اور خود ہی کوزے کی مٹی ہے) کے جملے میں کہی گئی ہے۔ اسی تصوف نے صوفیہ میں ملحدین کا ایک گروہ پیدا کیا۔ جس نے اسلامی شریعت کو معطل کر دیا۔ یہاں تک کہ نماز بھی ضروری نہیں رہی۔ افسوس ہے کہ شریعت کے پابند صوفیہ نے اس فلسفہ کو قرآن عزیز میں بھی داخل کرنے کی سعی ناشکور کی ہے۔

يُؤْمِنُونَ بِالْغَيْبِ

مصنف کتاب نے ایمان کی اولین دو قسمیں کی ہیں۔ تقلیدی۔ تحقیقی۔ اس کے بعد تحقیقی ایمان کی کئی قسمیں بتائی ہیں۔ استدلالی، کشفی، ایمان استدلالی کو وہ ایمان علمی بھی کہتے ہیں۔ علمی و کشفی دونوں قسموں کے ایمان کی مزید تقسیم کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

وکلاهما اما واقف علیٰ

اور یہ دونوں یا تو علم اور غیب کی حد

حد العلم والغيب واما
غير واقف والاول هو الايمان
المسمى علم اليقين والثاني اما عيني
وهو المشاهدة المسمى عين اليقين
واما حقي وهو الشهود الذاتي
المسمى حق اليقين والقسمان
الاخيران لا يدخلان تحت الايمان
بالغيب۔

تک رک جانے والے ہیں یا نہ رکنے والے۔
اول ایقان ہے جس کا نام علم الیقین ہے اور
دوسرا یا تو عینی ہے اور یہ مشاہدہ ہے جس
کو عین الیقین کہتے ہیں یا حقی ہے اور یہ
شہود ذاتی ہے جس کو حق الیقین کہتے ہیں
اور دونوں اخیر کی قسمیں (عینی اور حقی) ایمان
بالغیب کے تحت داخل نہیں ہیں۔

قرآن کریم میں علم الیقین، عین الیقین اور حق الیقین کے جو الفاظ آئے ہیں ان کا مصنف کی اس تقسیم سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

مصنف ہی نے نہیں بلکہ بہت سے صوفیہ نے ایمان بالغیب کو ادنیٰ درجہ کا ایمان قرار دیا ہے۔ جہاں تک کتاب اللہ اور احادیث نبوی کی تعلیم کا تعلق ہے اس دنیا میں انسان کی زندگی آزمائشی اور امتحانی زندگی ہے اور آزمائش و امتحان کا دارومدار ایمان بالغیب ہی پر ہے اسی طرح مومن کی تمام روحانی ترقیات اور مراتب و درجات کا تعلق بھی ایمان بالغیب ہی سے ہے۔ کتاب و سنت سے یہ بات ثابت ہے کہ جب تک انسان زندہ ہے۔ غیب شہادت میں بدل نہیں سکتا اور جب قیامت میں غیب شہادت میں بدل جائے گا تو وہاں کسی کو مجال کفر و شرک باقی نہیں رہے گی اور کفار و مشرکین یہ تمنا کریں گے کہ کاش ان کو دوبارہ دنیا میں بھیج دیا جائے تاکہ وہ صالح اور فرماں بردار بن کر دکھائیں۔

وَلَوْ تَرٰى اِذِ الْمُجْرِمُوْنَ
نَاكِسُوْا رُءُوْسِهِمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ
رَبَّنَا اَبْصَرْنَا وَسَمِعْنَا
فَارْجِعْنَا نَعْمَلْ صَالِحًا اِنَّا

اور کبھی تو دیکھے جس وقت کہ منکر سر
ڈالے ہوئے ہوں گے اپنے رب کے سامنے
اے رب ہم نے دیکھ لیا اور سن لیا اب ہم کو
پھر بھیج دے کہ ہم کریں گے بھلے کام۔ ہم

مُوْقِنُوْنَ ۝ (السجدہ: ۲۰) کو یقین آگیا۔

ہم سب جانتے ہیں کہ قیامت میں کفار و مشرکین کا مشاہدہ، ایمان و یقین اور ان کی دنیا میں واپسی کی تمنا بے کار ہوگی کیوں کہ وہ ایمان بالغیب کے امتحان میں ناکام ہو چکے ہوں گے البتہ جو لوگ ایمان بالغیب کے امتحان میں کامیاب رہے ہوں گے وہ اپنے رب کا دیدار کریں گے۔ مصنف نے شہود ذاتی کی جو بات لکھی ہے وہ معقول نہیں ہے بلکہ ایک 'وہم' ہے۔ صفات کے بغیر کسی انسان کی ذات کا مشاہدہ بھی عقلاً محال ہے چہ جائیکہ اللہ تعالیٰ کی ذات کا مشاہدہ۔

مصنّف کی روش

يَا اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اور اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا کے جملے قرآن میں بہت آئے ہیں۔ مصنف ایمان کی من گھڑت تقسیم کے اعتبار سے ان آیات میں کہیں ایمان علمی لکھ دیتے ہیں۔ کہیں ایمان عینی اور کہیں ایمان حقی۔ اسی طرح بشارت جنت کی جو آیات ہیں ان میں کہیں جنت افعال یا جنت نفس لکھتے ہیں۔

کہیں جنت صفات یا جنت رضوان اللہ اور کہیں ان دونوں جنتوں کے ساتھ جنتِ ذات بھی۔ یہ حقیر یہاں صرف اتنا عرض کرتا ہے کہ قرآن کریم اور احادیث نبوی میں جنت کی اس تقسیم کا کہیں کوئی اشارہ بھی موجود نہیں ہے۔

تقسیم جنّت کی چند مثالیں

ہم یہاں مؤلف کی تقسیم جنت کی چند مثالیں پیش کرتے ہیں۔

(۱) البقرہ آیت ۲۵ کی تاویل میں ان کا خیال ہے کہ اس میں جس جنت کی بشارت دی گئی ہے وہ جنت روح یعنی جنت ذات نہیں ہے، لکھتے ہیں:

ولاجنة لارواحهم	ان کے لیے ارواح کی جنّت نہیں ہے
لاحتجابهم عن المشاهدة (ص۱۲)	اس لیے کہ وہ مشاہدہ سے محجوب رہے تھے۔

مطلب یہ ہے کہ اس آیت وبشر الذین اٰمنوا وعملوا الصّٰلحٰتِ ان لھم جنّٰتٍ الخ میں جن مومنین صالحین کو جنت کی بشارت دی گئی ہے وہ دنیا میں ایمان عینی حاصل نہیں کر سکے تھے اس لیے انہیں جنت ذات نہیں ملے گی۔

(۲) سورۂ آلِ عمران آیات ۱۶۸ تا ۱۷۱ کی تاویل کرتے ہوئے انھوں نے جنت کے جو مراتب و درجات بیان کیے ہیں ان کی دو قسمیں ہیں۔ جنت معنوی۔ جنت صوری اور پھر ایمان و عمل کے لحاظ سے ان دونوں کے بہت سے درجات ہیں۔

فالمعنویۃ جنۃ الذات وجنۃ الصفات والصوریۃ جنۃ الافعال

پس معنوی جنت ذات اور جنت صفات ہے اور صوری جنت افعال ہے۔

صوفیہ نے جنت ذات تو پورے طور پر اپنے لیے مخصوص کر لی ہے اور جنت صفات اپنے سے نیچے درجہ کے لوگوں کے لیے اور جنت افعال یعنی جنت نفس ان مومنین صالحین کے لیے ہے جن کا ایمان علمی استدلالی ایمان رہا وہ لوگ نہ ایمان عینی و حقی تک پہنچ سکے اور نہ توحید فی الصفات اور توحید فی الذات تک ترقی کر سکے بلکہ صرف توحید فی الافعال تک پہنچ کر رک گئے۔

(۳) سورۂ الفجر کی آخری آیتوں کی تاویل یہ ہے:

(ارجعی الی ربّکِ) فی حال الرضا ای اذا تم لک کمال الصفات فلا تسکنی الیہ و ارجعی الی الذات فی حال الرضا الذی ھو کمال مقام الصفات والرضا عن اللہ لا یکون الا بعد رضا اللہ عنھا کما قال رضی اللہ عنھم ورضوا عنہ (فادخلی فی عبادی) فی زمرۃ عبادی

اپنے رب کی طرف چل رضا کی حالت میں، جب تیرے لیے صفات کا کمال پورا ہو گیا تو اس سے سکون حاصل نہ کر اور ذات کی طرف رجوع کر رضا کی حالت میں، جو مقام صفات کا کمال ہے۔ اور اللہ سے رضامندی اس کے بعد ہوتی ہے کہ اللہ اس سے راضی ہو جائے جیسا کہ اللہ نے کہا ہے اللہ ان سے راضی ہوا اور وہ اللہ سے راضی ہوئے پس داخل ہو جا میرے ان بندوں کے

المخصوصين من اهل التوحيد الذاتي (وادخلي جنتي) المخصوصة بي اي جنة الذات۔

گروہ میں جو اہل توحید ذاتی ہیں اور داخل ہوجا اس جنت میں جو میرے ساتھ مخصوص ہے یعنی جنت ذات میں۔

یہ ہے تاویل کا وہ طریقہ جس سے آپ قرآن میں اور احادیث میں جو کچھ چاہیں داخل کر سکتے ہیں۔ بہر حال جنت ذات کا یہی وہ تخیل ہے جس نے صوفیہ کی نظروں میں شہد کی نہروں والی جنت کو حقیر اور ادنیٰ بنا دیا۔ "رضوان اللہ" یعنی اللہ کی رضا کو جنت صفات قرار دینا اور حور وقصور والی جنت کو اس سے خارج کرنا بھی عجیب سی بات ہے کیوں کہ جنت اللہ کی رضا ہی کا صلہ ہے اور قرآن بتاتا ہے کہ حور وقصور والی جنت اللہ تعالیٰ کے مقربین کو بھی ملے گی۔ جنت صفات و جنت ذات کی معنوی جنت مصنف کے وہم وخیال کی جنت ہے۔

موحّد کی ذات، اللہ کی ذات ہے

سورۂ بقرہ کی آیت یٰبَنِیَّ اِنَّ اللّٰہَ اصْطَفٰی لَکُمُ الدِّیْنَ (رکوع ۱۶ آیت ۱۳۲) (اے میرے بچو! اللہ نے تمہارے لیے یہی دین پسند کیا ہے) اس میں "دین" کی تاویل ملاحظہ ہو۔

ان دينه الذي يدين به الموحد لادين له غيره ولاذات فدينه دين الله وذاته ذات الله۔

یعنی اس کا وہ دین جس کو موحد اختیار کرتا ہے اس کے سوا نہ اس کا کوئی دین ہے نہ ذات پس اس کا دین اللہ کا دین ہے اور اس کی ذات اللہ کی ذات ہے۔

آپ نے غور کیا؟ حضرت ابراہیمؑ واسحاقؑ ویعقوبؑ علیہم السلام نے اپنی اولاد کو جس دین پر قائم رہنے کی تاکید کی تھی وہ دین وہ دین تھا جس کو دین عربی سے پہلے تھوڑے سے فلسفی صوفیہ نے ایجاد کیا تھا۔ یہ تاویل کرتے وقت شاید مصنف مقام "الجمع" میں مقیم تھے۔ اگر آیات قرآن کی اس طرح کی تاویل جائز ہو تو پھر فرقہ باطنیہ کا قصور کیا ہے؟ اور یہود ونصاریٰ کی خطا کیا ہے؟

اذکار کی اقسام

سورہ بقرہ آیت ۱۹۸ فاذکروہ کما ھدٰکم (اور اس کو اس طرح یاد کرو جس کی ہدایت اس نے تمھیں کی ہے) اس کی تاویل میں پرواز تخیل ملاحظہ کیجیے، لکھا ہے:

اولاً اللہ نے زبان سے ذکر کی ہدایت کی ہے جو نفس[۱] کا ذکر ہے پھر اس نے دل[۲] سے ذکر کی ہدایت کی ہے جو ان افعال کا ذکر ہے جن سے اللہ تعالیٰ کی نعمتیں اور احسانات صادر ہوتے ہیں اور پھر اس نے ذکر سر[۳] کی ہدایت کی ہے اور وہ افعال کا معاینہ ہے اور تجلیات صفات کا مکاشفہ ہے۔ پھر اس نے ذکر روح[۴] کی ہدایت کی ہے اور وہ تجلیات صفات کے انوار کا مشاہدہ ہے۔ نور ذات کے ملاحظہ کے ساتھ —— پھر ذکر خفی[۵] کی ہدایت اور وہ مشاہدۂ جمال ذات ہے۔ بقاء اثنیت (دوئی) کے ساتھ —— پھر اس نے ذکر ذات[۶] کی ہدایت کی ہے اور وہ شہود ذاتی ہے "بقیہ" کے پردے کو اٹھا کر۔ (ص ۳۸)

"ارتفاع البقیہ" کی اصطلاح "ارتفاع الاثنیۃ" کے لیے استعمال کی گئی ہے۔ یعنی جب دوئی ختم ہوجاتی ہے اور سالک ذات الٰہی میں گم ہوجاتا ہے۔ اس گم شدگی کے لیے مصنف نے "شہود ذاتی" کی اصطلاح استعمال کی ہے۔ مشاہدہ اور شہود ذاتی میں یہ فرق ہے کہ مشاہدہ میں دوئی باقی رہتی ہے اور شہود ذاتی میں دوئی ختم ہوجاتی ہے۔

ذکر کی مذکورہ بالا چھ[۶] اقسام میں سے صرف زبان سے ذکر کی صراحت وہدایت قرآن اور احادیث میں موجود ہے۔ ذکر صرف ذکر قلبی کی بھی کوئی تعلیم نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں دی ہے۔ حضور قلب کے ساتھ ذکر لسانی کی تعلیم سے قرآن اور احادیث مملو ہیں۔ بقیہ اذکار کا کوئی اشارہ بھی قرآن وحدیث میں نہیں ہے۔ ذکر سری وغیرہ کی ہدایت کو اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کرنا بالکل غلط ہے۔

فنا اور بقا

سورۂ بقرہ کا آخری رکوع عقائد، اذعان و یقین، توبہ و استغفار اور بہترین دعا پر مشتمل ہے لیکن تاویلات کے موجد نے اس میں بھی اپنا خیالی فلسفہ داخل کر کے اس کا حلیہ بگاڑ دیا ہے۔ مثلاً غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَإِلَيْكَ الْمَصِيرُ (مالک ہم تجھ سے خطا بخشی کے طالب ہیں اور ہمیں تیری طرف پلٹنا ہے) کی تاویل ملاحظہ فرمایئے۔

اي اغفرلنا وجوداتنا و صفاتنا وامحها بوجودك و وجود صفاتك بالفناء فيك

یعنی ہمارے وجود اور ہماری صفات کی مغفرت فرما اور ہمارے وجود اور ہماری صفات کو اپنے وجود اور اپنی صفات سے محو کر دے اپنے اندر ہم کو فنا کر کے۔

آگے وَاغْفِرْ لَنَا کا جو فقرہ ہے اس کی تاویل یہ ہے:

ذنوب وجوداتنا فانها اکبر الکبائر کما قیل اذا قلت ما اذنبت قالت مجیبة وجودك ذنب لا یقاس به ذنب۔

ہمارے وجود کے گناہ کو بخش دے اس لیے کہ ہمارا وجود ہی سب سے بڑا گناہ ہے جیسا کہ کہا گیا ہے جب میں نے اپنی معشوقہ سے کہا کہ میں نے کیا گناہ کیا ہے تو اس نے جواب دیا تیرا وجود ہی ایسا ہے جس پر کسی دوسرے گناہ کو قیاس نہیں کیا جا سکتا۔

فنا فی اللہ کے بعد اب بقا باللہ کا جلوہ دیکھیے "وَارْحَمْنَا" کی تاویل یہ ہے:

بالوجود الموهوب بعد الفناء

یعنی ہم پر رحم کر فنا کے بعد ایک دوسرا وجود عطا کر کے۔

اوپر تمہید میں یہ حقیر لکھ چکا ہے کہ وجودی و شہودی صوفیہ کے نزدیک فنا فی اللہ کے بعد سالک کو اللہ تعالیٰ ایک نیا وجود عطا کر کے دنیا میں واپس بھیج دیتا ہے اس کے لیے مصنف نے "الوجود الموہوب الحقانی" کی اصطلاح وضع کی ہے۔ دیکھ لیجیے کہ وحدۃ الوجود

کا فلسفہ کتنی آسانی سے قرآن میں داخل کر دیا گیا۔ اب آخری دعا وانصرنا علی القوم الکافرین۔ دیکھیے کہ "قوم کافر" سے مراد کیا ہے:-

من قوی نفوسنا الامارة وصفاتها وجنود شیاطین اوھامنا وخیالاتنا المحجوبین عنک الحاجبین ایانا بکفرھا وظلمتھا	ہماری مدد فرما۔ ہمارے نفوس امارہ کی قوتوں اور ان کی صفات کے مقابلہ میں اور شیاطین اوہام وخیالات کے لشکروں کے مقابلہ میں جو تجھ سے محجوب ہیں اور اپنے کفر وظلمت کی وجہ سے ہمارے لیے حاجب بن گئے ہیں۔

اسی طرح کی تاویلات نے مسلمان خواص وعوام کے سینوں میں روح جہاد پر اوس ڈال دی اور وہ اپنی ذات کے خانے میں محجوب ہو کر رہ گئے۔ علمائِ باطن، سفید وسیاہ اور سرخ وزرد انوار کے دائرے میں داخل ہوئے تو پھر اس سے نکلنا نصیب نہیں ہوا۔ الاماشاءاللہ۔ اسی فلسفے نے مسلمانوں کو نظام کفر وشرک کے تحت زندگی بسر کرنے پر نہ صرف راضی کیا بلکہ ان کو مطمئن کر دیا۔ "قوم کافرین" سے نفوس امارہ اور اوہام و خیالات مراد لینا عربی زبان کا بھی مذاق اڑانا ہے۔ "وحدۃ الوجود" کے وہم نے صوفیہ کو کتنے گہرے گڑھے میں گرا دیا ہے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں ایک تخیل

سورۂ آل عمران کی آیت ۳۱ میں یَغْفِرْ لَکُمْ ذُنُوْبَکُمْ (اور وہ تمھارے گناہوں کو بخش دے گا) کی تاویل میں لکھتے ہیں:

کما غفر لحبیبہ حیث قال لیغفر لک اللہ ما تقدم من ذنبک وما تاخر ذنبہ المتقدم ذاتہ والمتاخر	جس طرح اس نے اپنے حبیب سے درگزر فرمایا جب کہا تاکہ اللہ تمھارے اگلے اور پچھلے گناہ بخش دے۔ ان کا اگلا گناہ ان کی ذات تھی اور ان کا پچھلا

صفاتہ ۔ گناہ ان کی صفات ۔

سورۂ فتح کی پہلی آیت میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مغفرت عامہ وتامہ کی جو بشارت ہے اس کی تاویل مصنف علام نے فرمائی ہے۔ اس قسم کی عبارتیں پڑھ کر یقین نہیں آتا کہ یہ کسی متقی مسلمان نے لکھی ہوں گی ۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات وصفات کو گناہ قرار دینے کی جرأت کوئی متقی مومن نہیں کر سکتا لیکن صوفیہ نے " وحدۃ الوجود " کا جو غیر شرعی فلسفہ اختیار کیا ہے اس نے ان کو یہ سب کچھ لکھنے پر آمادہ کیا ۔ اللہ تعالیٰ انھیں معاف فرمائے ۔ آمین !

اکبر الکبائر

پہلے بھی گزر چکا کہ اس کتاب میں انسان کے وجود کو سب سے بڑا گناہ کہا گیا ہے۔ اس کی ایک مثال اور پیش کی جاتی ہے ۔ سورۂ نساء کی آیت ۳۱

اِنْ تَجْتَنِبُوْا كَبَآئِرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ	اگر تم ان بڑے بڑے گناہوں سے بچتے رہے جن سے تمھیں منع کیا جا رہا ہے ۔

اس آیت کی تاویل یہ فرمائی گئی ہے :

من اثبات الغیر فی الوجود الذی ھو الشرک ذاتاً وصفۃً وفعلاً فان اکبر الکبائر اثبات وجود غیر وجودہ تعالیٰ کما قیل وجودک ذنب لا یقاس بہ ذنب ثم اثبات الاثنیۃ فی الذات باثبات زیادۃ الصفات علیھا کما قال	اگر تم بچتے رہے غیر اللہ کے وجود کے اثبات سے جو شرک ہے ذات کے لحاظ سے بھی ۔ صفات کے لحاظ سے بھی' اور فعل کے لحاظ سے بھی اس لیے کہ اکبر الکبائر (سب سے بڑا گناہ) اللہ تعالیٰ کے وجود کے علاوہ کسی غیر کے وجود کو ثابت کرنا ہے جیسا کہ کہا گیا ہے " تیرا وجود گناہ ہے جس سے بڑا کوئی گناہ نہیں " پھر ذات پر صفات کا اضافہ کر کے ذاتِ الٰہی میں اثنینیت یعنی

امیر المومنین علیہ	دوئی کا اثبات بھی گناہ ہے جیسا کہ امیر المومنین
السلام وکما قال	علیہ السلام نے کہا ہے اور جیسا کہ یہ کہا
الاخلاص نفی الصفات	ہے کہ اللہ کے لیے اخلاص یہ ہے کہ صفات
عنہ (ص ۱۰)	کی اس سے نفی کی جائے۔

یہ نظریہ "وحدۃ الوجود" کا حقیقی اور واضح بیان ہے۔ اس عبارت کا حاصل یہ ہے:-

(۱) غیر اللہ کے وجود کا اثبات شرک ہے۔ ذات، صفت، اور فعل ہر لحاظ سے صرف اللہ موجود ہے کوئی شخص اگر ذات یا صفات یا افعال کے لحاظ سے کسی غیر کا وجود تسلیم کرتا ہے تو شرک کا ارتکاب کرتا ہے۔

(۲) غیر اللہ کے وجود کا اثبات شرک اس لیے ہے کہ سب سے بڑا گناہ یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے وجود کے سوا کسی دوسرے وجود کو ثابت کیا جائے کیوں کہ کہا گیا ہے کہ تیرا وجود ہی ایسا گناہ ہے جس پر کسی دوسرے گناہ کو ناپا نہیں جا سکتا۔

(۳) ذات الٰہی ایک ایسی وحدت ہے کہ اس پر اس کی صفات کو ماننا بھی شرک ہے اس لیے کہ یہ ذات میں دوئی کا اثبات ہے۔

(۴) یہ بات امیر المومنین علیہ السلام نے کہی ہے۔

(۵) انھوں نے یہ بھی کہا ہے کہ اللہ کے لیے اخلاص یہ ہے کہ اس سے صفات کی نفی کی جائے۔

دین اسلام کا علم رکھنے والا کوئی مسلمان یہ تصور بھی کر سکتا ہے کہ کسی متبع شریعت عالم دین نے یہ عبارت لکھی ہو گی؟ بہر حال یہ حقیر اس عبارت کا مختصر جائزہ لیتا ہے۔ لکھنے والا کوئی بھی ہو۔

(الف) قرآن میں شرک کو ظلم عظیم اور ناقابل معافی جرم قرار دیا گیا ہے اس لیے اس کا تقاضا یہ ہے کہ اس جرم کی پوری وضاحت کر دی جائے۔ اب سوال یہ ہے کہ کیا قرآن میں یا احادیث نبوی میں کہیں یہ بیان کیا گیا ہے کہ غیر اللہ کے وجود کو تسلیم

کرنا شرک ہے؟ اتنا شدید جرم محض کسی شخص کی بے دلیل اور نامعقول تاویل سے تو ثابت نہیں ہو سکتا۔

(ب) یہ بات قرآن کی کس آیت میں کہی گئی ہے کہ غیر اللہ کے وجود کو تسلیم کرنا سب سے بڑا گناہ ہے۔ کیا ایک شاعر کا شعر کوئی آیت یا کوئی ارشاد نبوی ہے؟

(ج) اللہ تعالیٰ سے صفات کی نفی فلاسفہ اور معتزلہ کا نامعقول خیال ہے شریعت اسلامی کو محور بنانے والے کسی امام نے اسے تسلیم نہیں کیا ہے بلکہ سب نے اس کو مردود قرار دیا ہے۔ یہ صرف ان صوفیوں کی بکواس ہے جو فی الواقع یونان کے اشراقی فلاسفہ کے شاگرد ہیں خواہ وہ اپنے آپ کو کتنا ہی متبع سنت اور متبع شریعت قرار دیں۔

(د) امیر المومنین سے مراد غالباً حضرت علیؓ ہیں۔ ان کی طرف ان دونوں اقوال کا انتساب بہت بڑا جھوٹ ہے۔ اب ہم ایک دوسرے پہلو سے اس کا جائزہ لیتے ہیں۔

(۱) شرک کا وجود ہی دوئی پر موقوف ہے یعنی کسی غیر اللہ کو اللہ تعالیٰ کی ذات صفات اور حقوق میں شریک کرنا اور جب اللہ کے سوا کوئی موجود ہی نہیں تو پھر "شرک" کا کہیں وجود ہی نہیں اور اس طرح پورا قرآن کیا باقی رہے گا جو شرک کی تردید اور توحید کے اثبات سے بھرا ہوا ہے۔

(۲) ایک طرف غیر اللہ کے وجود کے اثبات کو "شرک" کا قرار دینا اور دوسری طرف انسان کے وجود کو سب سے بڑا گناہ کہنا کھلا ہوا تضاد ہے یا نہیں؟ جب وجود ایک ہی ہے تو پھر انسان کا وجود کہاں ہے جو گناہ قرار پائے۔ اس کے علاوہ سوال یہ بھی ہے کہ اگر انسان کا وجود سب سے بڑا گناہ ہے تو اس کا ارتکاب کس نے کیا ہے؟ انسان اس دنیا میں خود پیدا نہیں ہوا، پیدا کیا گیا ہے۔ اب غور کیجئے کہ بات کہاں پہنچتی ہے۔

(۳) اللہ تعالیٰ نے انسان کی تخلیق کو اپنی نعمتوں میں شمار کیا ہے اور انسان کے سر پر اپنی خلافت کا تاج زریں رکھا ہے۔ اس کو گناہ بلکہ سب سے بڑا گناہ قرار دینا، اللہ کے قول کی تردید ہے یا نہیں؟

(۴) "ایمان" اور اس کی تقسیم مصنف نے کی ہے سوال یہ ہے کہ کیا انسانی وجود کے سب سے بڑے گناہ سے ایمان کا سب سے بڑا ثواب پیدا ہوتا ہے۔

(۵) اگر یہ سب محض خیالی فلسفہ ہے جب بھی کوئی معقولیت تو ہونی چاہیے! آخر یہ کس قسم کا بے ہنگم اور نامعقول فلسفہ ہے۔

الفاظ قرآن کے ساتھ زیادتی

اس کتاب میں صرف یہی نہیں کیا گیا ہے کہ "تاویل" کے نام سے فلسفیانہ تصوف کے نظریات و خیالات زبردستی اس میں داخل کیے گئے ہیں بلکہ الفاظ قرآن کے ساتھ بھی کھلی ہوئی زیادتیاں کی گئی ہیں۔ حد یہ ہے کہ قیامت کے جو اسمائے صفات قرآن میں مذکور ہیں، ان کے معنے و مراد کو بھی بدل دیا گیا ہے۔

قیامت کبریٰ و صغریٰ

مؤلف کتاب نے قیامت کی بھی دو قسمیں کر دی ہیں۔ قیامت کبریٰ۔ قیامت صغریٰ۔ اور ستم ظریفی یہ ہے کہ جس یوم الحساب اور یوم الدین کے ذکر سے قرآن بھرا ہوا ہے وہ مؤلف کے نزدیک قیامت صغریٰ (چھوٹی قیامت) ہے۔ پھر قیامت کبریٰ کیا ہے؟ وہ ہے سالک راہ عشق کا مقام فنا پر پہنچ جانا اور فانی فی اللہ ہو جانا۔

"والسَّمَاءِ ذَاتِ الْبُرُوْجِ" کی تاویل یہ ہے:

ای الروح الانسانی ذات المقامات فی الترقی والدرجات	یعنی والسماء ذات البروج، روح انسانی ہے جو ترقی اور درجات کے لحاظ سے مقامات رکھنے والی ہے۔

اس کے بعد "والیوم الموعود" کی تاویل ملاحظہ ہو۔

ای القیامۃ الکبریٰ التی ھی اٰخر درجاتہ من	یعنی "الیوم الموعود" وہ قیامت کبریٰ ہے جو کشف توحید ذاتی کے درجات

کشف التوحید الذاتی میں روح انسانی کا آخری درجہ ہے۔

یعنی جب روح ترقی کرتی ہوئی فانی فی اللہ ہو جاتی ہے اور یہی مقام اس کے لیے قیامت کبریٰ (بڑی قیامت) ہے۔

سورۂ النازعات میں "الطامۃ الکبریٰ" کی تاویل یہ ہے:

ای تجلی نور الوحدۃ	یعنی وحدت ذاتیہ کے نور کی تجلی جو
الذاتیۃ الذی یطم علیٰ کل	ہر شے کو ڈھانپ لیتی اور پھر اس کو مٹا دیتی
شیئٍ فیطمہ ویمحوہ	اور محو کر دیتی ہے۔

"اِذَا الشَّمْسُ کُوِّرَتْ" میں شمس سے مراد روح کا سورج اور "کُوِّرَتْ" سے مراد روح کا جسم سے نکل جانا اور "اِذَا السَّمَاءُ انْفَطَرَتْ" میں آسمان سے مراد روح حیوانی کا آسمان ہے۔

یہ ہیں آیات قرآنی کی وہ تاویلات جن کے ذریعہ فلسفیانہ تصوف کو قرآنی تصوف کہا جاتا ہے۔ میں نے کسی کتاب میں پڑھا تھا کہ بہائیوں کے نزدیک قرآن میں قیامت کا جو لفظ آیا ہے اس سے مراد بہاء اللہ تھے اور جب وہ آ گئے تو قیامت واقع ہو چکی جس کی خبر قرآن نے دی ہے۔ چلیے چھٹی ملی۔ گویا خواہ مخواہ قیامت کا اندیشہ لگا ہوا تھا۔ اسی طرح غلام احمد پرویز کی تحریر میں پڑھا ہے کہ قرآن میں "آخرۃ" کا جو لفظ آیا ہے اس سے مراد انسان کا دنیوی مستقبل ہے۔ "تفسیر الشیخ الاکبر" پڑھ کر معلوم ہوا کہ قرآن کے ساتھ اس طرح کا مذاق صرف انہیں لوگوں نے نہیں کیا ہے بلکہ ان لوگوں نے بھی کیا ہے جن کو ہم "بزرگ" کہتے ہیں۔

ایک اور باطن

مؤلف کتاب، قرآن کریم کے ظاہر کی تشریح کو تفسیر اور اس کے باطن کی تعبیر کو تاویل کہتے ہیں۔ گویا ابن جریر طبری اور ابن کثیر وغیرہ نے قرآن کے ظاہر کی تفسیر کی ہے اور مؤلف کتاب جیسے بزرگوں نے قرآن کے باطن کو کھولا ہے۔ ایک اور باطن ملاحظہ کیجیے۔ سورۂ اعراف

آیت ۱۵۶۔

قال عذابی اصیب بھا من اشاء ورحمتی وسعت کل شیئ	سزا تو میں جس کو چاہتا ہوں دیتا ہوں مگر میری رحمت ہر چیز پہ چھائی ہوئی ہے۔

اس کی تاویل یہ ہے:

ای عذاب الشوق المخصوص بی الحاصل من جھتی وان کان الیھا الم الفراق لکنہ امر عزیز خطیر ورحمتی وسعت کل شیئ لا تختص باحد دون احد غیرہ و شیئ دون شیئ (۱۲۲)	یعنی وہ شوق جو میرے ساتھ مخصوص اور میری جنت سے حاصل ہو اگرچہ یہ تکلیف دہ ہے الم فراق کی شدت کی وجہ سے لیکن وہ بلند مرتبہ اور نادر چیز ہے" اور میری رحمت ہر شے پر وسیع ہے" کا مطلب یہ ہے کہ وہ کسی شخص کے ساتھ مخصوص ہے اور نہ کسی شے کے ساتھ۔

رحمت کے مقابلے میں اس عذاب کی فضیلت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

ولعمری ان ھذا العذاب اعز من الکبریت الاحمر واما الرحمۃ فلا یخلو من حظ منھا احد	اور یہ عذاب کبریت احمر (سرخ گندھک) سے زیادہ قیمتی اور کم یاب ہے۔ باقی رہی رحمت تو ہر شخص کو اس میں سے کوئی نہ کوئی حصہ ملتا ہے۔

گفتگو اس میں نہیں کہ نگاہ عشق میں فراق لذیذ ہے یا وصل؟ گفتگو یہ ہے کہ اس آیت میں "عذاب" کی تاویل یا اس کا باطن' اللہ تعالیٰ کے عشق اور اس کے فراق کو قرار دینا تحریف معنوی ہے یا نہیں؟

جہاد

مولف کتاب اور اکثر صوفیہ نے اپنی ذات میں مست رہنے کے لیے "جہاد فی سبیل اللہ" کی آیات سے اکثر و بیشتر اعلاءِ کلمۃ اللہ کی جدوجہد اور اللہ کے باغیوں سے قتال کو حذف

کر دیا ہے اور وہ خود جس جہاد میں مشغول رہے اس میں اس لفظ کو محدود کر دیا ہے۔ اسی طرح انھوں نے مسلمانوں سے روحِ جہاد چھین لی ہے۔ یہاں تک کہ اعلاء کلمۃ اللہ کے لیے جدوجہد کا خیال بھی ان کے ذہنوں سے نکل گیا۔ سورۂ مائدہ کی آیت ۳۵ میں وجاھدوا فی سبیلہ (اور اس کی راہ میں جدوجہد کرو) کی تاویل یہ کی گئی ہے:

جاھدوا فی سبیلہ بمحو الصفات والفناء فی الذات (ص ۹۰)	اس کی راہ میں جدوجہد کرو اپنی صفات کو مٹا کر اور ذات الٰہی میں فنا ہو کر۔

سورۂ مائدہ کی آیت ۵۴ قرآن کریم کی ایک انقلاب انگیز آیت ہے اس کے دو فقرے يُجَاهِدُونَ فِي سَبِيلِ اللهِ وَلَا يَخَافُونَ لَوْمَةَ لَائِمٍ (جو اللہ کی راہ میں جدوجہد کریں گے اور کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہ ڈریں گے) کی یہ تاویل کی گئی ہے:

يُجَاهِدُونَ فِي سَبِيلِ اللهِ بمحو صفاتهم وافناء ذواتهم التی هی حجب مشاهداتهم و لا یخافون لومة لائم من نسبتهم الی الاباحة والزندقة والکفر وعزلهم بترك الدنیا ولذاتها بل بترك الآخرة ونعیمها کما قال امیر المومنین علیه السلام اعبدوا الله لا لرغبة ولا لرهبة (ص ۹۱)	وہ اللہ کی راہ میں جہاد کرتے ہیں اپنی صفات کو محو اور اپنی ذوات (ذات کی جمع) کو فنا کر کے جو ان کے مشاہدات کے لیے حجاب ہیں اور وہ ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہیں ڈرتے کہ وہ انھیں اباحت، بددینی اور کفر کی طرف منسوب کرتے ہیں اور نہ وہ دنیا اور اس کی لذتوں بلکہ آخرت اور اس کی نعمتوں کو ترک کر دینے پر ملامت گروں کی ملامت سے ڈرتے ہیں۔ جیسا کہ امیر المومنین نے فرمایا اللہ کی عبادت کرو کسی لالچ اور خوف سے بے پرواہ ہو کر۔

اس عبارت کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کی راہ میں جہاد یہ ہے کہ انسان اپنی صفات اور اپنی ذات کو فنا کر دے کیوں کہ اس کی ذات وصفات اللہ کے مشاہدے کے لیے حجاب ہیں اور جو لوگ صوفیہ کو بددینی اور کفر کی طرف منسوب کرتے ہیں ان کی ملامت

سے نہ ڈرے۔ اسی طرح صوفیہ کی اس بات پر کہ انھوں نے دنیا اور اس کی لذتوں بلکہ آخرت اور اس کی لذتوں کو ترک کر دیا ہے ملامت کرتے ہیں ان کی ملامت سے بھی نہ ڈرے۔ جیسا کہ امیر المومنین علیہ السلام نے کہا ہے کہ اللہ کی عبادت کرو نہ رغبت کے لیے اور نہ خوف کی وجہ سے۔ یعنی تمھاری عبادت نہ جنت کی رغبت کی بنا پر ہونی چاہیے اور نہ دوزخ کے خوف سے۔ صوفیہ میں ایک گروہ ملحدین کا بھی ہے جنھوں نے شریعت اسلامیہ کو معطل کر دیا ہے۔ یہاں رام پور میں بھی ایک صوفی موجود ہیں جو اپنے مریدوں کو نماز پڑھنے سے منع کرتے ہیں۔ اگر اس قسم کے صوفی اپنی بددینی پر ملامت سے نہیں ڈرتے تو یہ نہ ڈرنا خود ایک لعنت ہے جس کا اس آیت کریمہ سے کوئی تعلق نہیں اسی طرح ترک آخرت پر ملامت سے نہ ڈرنا قابل تعریف نہیں بلکہ قابل مذمت ہے اور ترک آخرت کی بات قرآن کی نفی کر دینے کے مترادف ہے۔ تصوف میں یہ غیر اسلامی خیال دوسروں سے لے کر داخل کیا گیا ہے۔ اس عبارت میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی طرف منسوب قول، قرآن کے خلاف ہے اس لیے انھوں نے ہرگز یہ بات نہیں فرمائی ہوگی

قرآن کریم میں انبیائے کرام علیہم السلام کے بارے میں بیان کیا گیا ہے:

اِنَّهُمْ كَانُوْا يُسٰرِعُوْنَ فِي الْخَيْرٰتِ وَيَدْعُوْنَنَا رَغَبًا وَّرَهَبًا ؕ وَكَانُوْا لَنَا خٰشِعِيْنَ ○ (الانبیاء: ۹۰)	یہ لوگ نیکی کے کاموں میں دوڑ دھوپ کرتے تھے اور ہمیں رغبت اور خوف کے ساتھ پکارتے تھے اور ہمارے آگے جھکے ہوئے تھے۔

سورہ سجدہ میں فرمایا گیا ہے:۔

تَتَجَافٰى جُنُوْبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ خَوْفًا وَّطَمَعًا ۫ وَّمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ○ (السجدہ: ۱۶)	ان کی پیٹھیں بستروں سے الگ رہتی ہیں اپنے رب کو خوف اور طمع کے ساتھ پکارتے ہیں اور جو کچھ رزق ہم نے ان کو دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔

خود باری تعالیٰ نے اپنے بندوں کو حکم دیا ہے:

وَلَا تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ	زمین میں فساد نہ کرو جبکہ اس کی

بَعْدَ اِصْلَاحِهَا وَادْعُوْهُ خَوْفًا	اصلاح ہو چکی ہے اور خدا کو پکارو خوف کے
وَّطَمَعًا اِنَّ رَحْمَتَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ	ساتھ اور طمع کے ساتھ یقیناً اللہ کی رحمت
مِّنَ الْمُحْسِنِيْنَ ○ (الاعراف: ۵۶)	نیک کردار لوگوں سے قریب ہے۔

کیا صوفیا انبیاء کرام علیہم السلام سے بھی بڑھے ہوئے ہیں؟ بڑھے ہوئے نہیں ہیں بلکہ غیر اسلامی فلسفہ تصوف میں محو و مدہوش ہیں۔ یہ جو کچھ لکھا گیا ہے تعارف کے لیے کافی ہے۔ یہ کتاب دو جلدوں میں ہے اور پورے قرآن کو اس کتاب کے مرتب نے خواہ وہ ابن عربی ہوں یا کوئی اور — اپنے من گھڑت فلسفہ کا تختہ مشق بنا ڈالا ہے۔

نومبر ۱۹۸۳ء

ربّانیۃ لارھبانیّۃ

مولانا ابوالحسن علی الحسنی الندوی

ناشر: دار الفتح بیروت۔ صفحات ۱۷۴

قیمت: پانچ روپے۔ ملنے کا پتہ:۔ مکتبہ ندوۃ العلماء لکھنؤ ۷

فاضل مصنف کی یہ کتاب بھی تبصرہ نگار نے بہت دل چسپی سے پڑھی اس لیے کہ وہ بھی صوفیہ و مشائخ ہی کے خاندان میں پیدا ہوا، اسی گھرانے اور اسی ماحول میں پرورش پائی، اپنے صوبہ کے ایک مسلم شیخ وقت کے ہاتھ پر بیعت کی اور تعلیم بھی پائی اور آج بھی ان کی عقیدت و محبت اس کے دل میں اتنی ہی ہے جتنی بیعت کے وقت تھی اس میں کوئی کمی نہیں ہوئی اس کے علاوہ تصوف کی متعدد مستند کتابیں شوق و ذوق کے ساتھ پڑھیں۔ بزرگان دین کے بیسیوں تذکرے اور سوانح حیات پڑھے اور آج بھی کسی معتمد علیہ شیخ کا تذکرہ مل جاتا ہے تو وقت نکال کر اسے پڑھتا ہے۔ ضمناً یہاں یہ بات اس لیے لکھی گئی کہ وہ تصوف سے اجنبی نہیں ہے۔

اس موضوع پر مولانا علی میاں کی یہ عربی تصنیف بقامت کہتر بہ قیمت بہتر کی مصداق ہے۔ یہ ایک اوسط ضخامت کی کتاب ہے لیکن اس میں جو کچھ لکھا گیا ہے وہ ایک ضخیم کتاب کا مواد بن سکتا ہے۔ تبصرہ نگار کے پیش نظر اس کتاب کا دوسرا ایڈیشن ہے۔ جیسا کہ مصنف نے اس ایڈیشن کے پیش لفظ میں لکھا ہے ان کی اس کتاب نے بھی عرب میں مقبولیت حاصل کی ہے اور بڑے بڑے اہل علم و فکر نے اس کے مواد کی بھی تعریف کی ہے اور اسلوب بیان کی بھی۔

مولانا ایک دردمند دل رکھتے ہیں اور مسلمانوں کے اخلاق و کردار کی تباہی، حب دنیا کے استیلاء، روحانیت کے فقدان اور مادیت کے فروغ سے انھیں سخت تکلیف پہنچتی ہے، وہ بجا طور پر سمجھتے ہیں کہ اس بیماری کی دوا وہ "تزکیہ" ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے مقاصد بعثت میں ایک بڑا مقصد تھا اور اس مرض کا علاج وہ "ربانیت" ہے جس کا مطالبہ علماء سے قرآن میں کیا گیا ہے۔ ان کا احساس ہے کہ اس وقت ایک روحانی خلا پیدا ہو گیا ہے جسے بھرنا ضروری ہے۔ اس خلا کو بھرے بغیر کوئی اصلاحی تحریک

اور کوئی انفرادی و اجتماعی کوشش کامیاب نہیں ہو سکتی ۔ یہ کتاب فاضل مصنف کے اسی احساس کا نتیجہ ہے ۔ اس کتاب میں کہا گیا ہے کہ بیسیوں اعمال، باطنی کیفیات اور روحانی صفات ایسی ہیں جن کے حصول کا کتاب و سنت میں حکم دیا گیا ہے، ترغیب دی گئی ہے اور ان کی مدح و ثنا کی گئی ہے مثلاً صبر، توکل، اخلاص، احتساب، زہد و قناعت، جود و سخا، ایثار، دنیا پر آخرت کی ترجیح، اللہ سے لقا کا شوق، دعا میں ابتہال و تضرع، اللہ کی خشیت سے گریہ و بکا، نماز میں خشوع، ایک نماز کے بعد دوسری نماز کا انتظار، ذوق و شوق کے ساتھ اس کی ادائگی، مصائب و حوادث میں اس سے استعانت اور اس پر اعتماد، قیام لیل، اللہ کا ایسا خوف جو دوسروں کے خوف سے بے نیاز کر دے ۔ جو رشتہ کاٹے اس کے ساتھ صلہ رحمی، زیادتی کرنے والوں سے درگزر، برائی کرنے والوں کے ساتھ احسان، ستانے والوں اور ظلم کرنے والوں کے لیے دعا، غلطی کرنے والوں کے عذر کی پذیرائی، موت آنے سے پہلے اس کے لیے تیاری، حسن خاتمہ کی فکر اور اس کے لیے شدید اہتمام ـــــ یہ سب وہ چیزیں ہیں جن سے قرآن کی آیتیں اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثیں بھری ہوئی ہیں ۔ انھیں چیزوں کے مجموعہ کا نام تزکیہ یا احسان یا ربانیت ہے اور اسی مجموعہ کا نام تصوف رکھ دیا گیا ہے ۔

فاضل مصنف نے اس کتاب کے مقدمہ میں پوری قوت کے ساتھ یہ لکھا ہے کہ کتنے ہی حقائق و مقاصد، جدید اصطلاحات کی وجہ سے نزاعی و اختلافی بن گئے ہیں ۔ اگر ان اصطلاحات سے صرف نظر کر لیا جائے تو ان حقائق و غایات کا نہ کوئی انکار کرے اور نہ ان کے بارے میں جھگڑا پیدا ہو ۔ وہ کہتے ہیں کہ "تصوف" بھی اسی سانحہ اور المیہ کا شکار ہوا ہے ۔ اگر دوسری صدی ہجری میں "تصوف" کی اصطلاح وضع نہ کی جاتی اور مطلوبہ حقائق و مقاصد کے لیے وہی نام تزکیہ یا احسان یا ربانیت کا باقی رہتا جو کتاب و سنت میں موجود ہے تو کوئی جھگڑا پیدا نہ ہوتا اور اگر آج بھی تصوف کے نام سے صرف نظر کر لیا جائے اور مذکورہ بالا حقائق و مقاصد کو انہیں ناموں سے پیش کیا جائے جو قرآن و حدیث میں ہیں تو یہ جھگڑا ختم ہو سکتا ہے ۔ راقم الحروف عرض کرتا ہے کہ کاش ایسا ہو سکتا لیکن یہ تمنا تمنائے خام اس لیے ہے کہ بات وہ نہیں ہے جو فاضل مصنف نے اپنے اس مقدمہ میں

لکھی ہے۔ تصوف نہ صرف ان حقائق وغایات کے مجموعے کا نام ہے جنھیں انھوں نے اپنے مقدمہ میں پیش کیا ہے اور نہ اصل جھگڑا تصوف کے نام میں ہے بلکہ تصوف ان حقائق ومقاصد کے علاوہ بھی بہت کچھ ہے اور اصل جھگڑا اس نام میں نہیں بلکہ اس بہت کچھ میں ہے جو اس نام سے قابل صد احترام صوفیہ ومشائخ نے پیش کیا ہے۔ جس نے خود تصوف کی کتابیں پڑھی ہیں اور جس نے ابن قیم کی مدارج السالکین اور ابن جوزی کی تلبیس ابلیس کا مطالعہ کیا ہے وہ یہ کیسے باور کر سکتا ہے کہ جھگڑا صرف تصوف کے نام پر ہے۔ راقم الحروف کے علم میں کوئی ایک آدمی بھی ایسا نہیں آیا کہ ان حقائق کو جن کا اوپر ذکر گزرا الگ الگ اس کے سامنے پیش کیا جائے تو وہ انہیں دینی حقائق تسلیم کرے اور جب کہا جائے کہ انہیں حقائق کے مجموعے کا نام تصوف ہے تو وہ محض یہ نام سن کر بھڑک اٹھے اور ان حقائق کے انکار پر اتر آئے۔ مولانا نے اپنی اس کتاب میں بھی دوسری کتابوں کی طرح تصوف کے بیان کردہ ان حقائق کو پیش کرنے سے احتراز فرمایا ہے جن میں نزاع اور اختلاف ہے۔ لیکن اس کتاب میں دو ایک چیزیں آ ہی گئی ہیں۔ مثلاً صـ۴۲ پر لطائف ستہ کا ذکر ہے۔ حاشیہ پر مولانا نے خود لکھا ہے کہ اس کا اکتشاف ائمۂ تصوف نے کیا ہے اور سادات نقشبندیہ نے اس کی طرف خاص توجہ دی ہے۔ اس وقت بحث اس "حقیقت" کے وجود یا عدم وجود اور اس کے مطلوب یا غیر مطلوب ہونے سے نہیں۔ سوال صرف یہ ہے کہ اگر کوئی شخص اس میں نزاع شروع کر دے اور کتاب وسنت سے اس کا ثبوت مانگنے لگے تو کیا مولانا اس کو لفظ "تصوف" کی اصطلاح میں نزاع قرار دیں گے؟ ظاہر ہے کہ یہ نزاع ایک ایسی حقیقت میں ہوگی جو علم التصوف میں بیان کی گئی ہے۔ اور اگر اس کو تزکیہ یا احسان یا ربانیت کا نام لے کر بیان کیا جائے جب بھی نزاع ختم نہیں ہوگی اپنی جگہ باقی رہے گی۔ یہ ایک ضمنی بات تھی اس سے کتاب کی قدر وقیمت پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ مولانا کی یہ کوشش بہت قابل قدر ہے کہ وہ صوفیہ ومشائخ کی زندگی کے اس رخ کو اپنے موثر قلم سے اجاگر کر رہے ہیں جو مدھم پڑ گیا تھا۔ اس کتاب میں جس کا موضوع تصوف ہے انھوں نے علامہ ابن تیمیہؒ کو عارفین باللہ میں شمار کیا ہے اور ایک عارف باللہ کی حیثیت ہی سے ان کی زندگی کے واقعات پیش

کیے ہیں۔ خدا کرے اور دوسرے صوفیہ و مشائخ بھی مولانا کی یہ بات تسلیم کر لیں۔ اگر ایسا ہو جائے تو پھر کسی صاحب علم مسلمان کو منکر تصوف قرار دینے کی ضرورت باقی نہ رہے۔ اس کتاب میں بہت سے علمائے ربانیین اور مشائخ روحانیین کے نام اور اجمال کے ساتھ ان کے کارناموں کے تذکرے آئے ہیں۔ جن میں ہندوستان کا حصہ قدرتی طور پر سب سے زیادہ ہے۔ کچھ تفصیل سے جن کے واقعات درج کیے گئے ہیں وہ یہ ہیں :۔

شیخ عبدالقادر جیلانیؒ، شیخ عبدالقادر رائے پوریؒ۔ مولانا رومؒ۔ شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ۔ شیخ احمد سرہندیؒ۔ امیر عبدالقادر الجزائریؒ۔ سید احمد الشریف السنوسیؒ۔ شیخ حسن البناء السید احمد الشہیدؒ۔ شیخ فضل الرحمٰن گنج مراد آبادیؒ اور کتاب کے اخیر میں شیخ شرف الدین یحییٰ منیریؒ اور مولانا گنج مراد آبادیؒ کی وفات کے واقعات تفصیل سے پیش کیے گئے ہیں۔ اس کتاب میں دکھایا گیا ہے کہ صوفیہ و مشائخ کے بارے میں یہ جو مشہور کر دیا گیا ہے کہ وہ کارزارِ حیات سے خود فرار اختیار کرتے ہیں اور دوسروں کو راہ فرار اختیار کرنے کی تلقین کرتے ہیں۔ تاریخ اس الزام کی تردید کرتی ہے۔ چنانچہ فاضل مصنف نے میدان جہاد میں صوفیہ و مشائخ کے کارناموں کا تھوڑی تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ جیسا کہ اوپر کہا گیا۔ فاضل مصنف کی یہ عربی کتاب بھی بہ حیثیتِ مجموعی بہت قابلِ قدر ہے اگر فاضل مصنف اس کا بھی اُردو ترجمہ شائع کرا دیں تو صرف اُردو جاننے والے بھی اس سے مستفید ہو سکیں گے۔

نومبر ۱۹۶۵ء

تاریخ دعوت وعزیمت

حصہ چہارم

(مصنفہ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی)

ماہنامہ الفرقان کے مجدد نمبر کے بعد حضرت مجدد الف ثانی کے سوانح حیات پر یہ پہلی کتاب ہے جو تبصرہ نگار کے سامنے بڑی شان وشوکت کے ساتھ آئی ہے۔ یہ کتاب بڑے سائز کے ۴۳۶ صفحات پر پھیلی ہوئی ہے۔ مجلس تحقیقات ونشریات اسلام پوسٹ بکس ۱۱۹ لکھنؤ نے شائع کی ہے۔ مجلد ہے اور اس کی قیمت ۲۳/.. روپے ہے۔

"فہرست عناوین" سے پہلے فاضل مصنف نے سورۂ فاطر کی آیت ۳۲ ایک پورے صفحہ پر نقل کی ہے۔ پوری کتاب آٹھ ابواب پر مشتمل ہے۔ باب اول۔ عالم اسلام دسویں صدی میں۔ باب دوم اکبری عہد حکومت اور اس کے دو متضاد دَور۔ باب سوم حالات زندگی از ولادت تا خلافت۔ باب چہارم۔ اہم واقعات وحالات، ارشادات وتربیت کی سرگرمی، وفات۔ باب پنجم۔ حضرت مجدد کے دائرۂ "تجدید" کا مرکزی نقطہ نبوت محمدی پر ایمان واعتماد کی تجدید۔ باب ششم۔ وحدۃ الوجود یا وحدۃ الشہود باب ہفتم۔ اکبر سے جہانگیر تک، سلطنت کو راہ راست پر لانے کے لیے آپ کی خاموش جدوجہد۔ باب ہشتم۔ حضرت مجدد کے دو خلفائے کبار اور ان کے منتسبین کے ذریعے آپ کے تجدیدی کام کی توسیع وتکمیل ـــــ ان بڑے عناوین کے تحت بہت سے ذیلی عنوانات ہیں۔ اس سے یہ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ پوری کتاب میں کیا کچھ ہوگا۔

جہاں تک تبصرہ نگار کا تعلق ہے اس کتاب کے پہلے باب سے اس کی معلومات

میں اضافہ ہوا۔ نویں اور دسویں صدی ہجری کی بعض ایسی تحریکات کا علم حاصل ہوا جو اس سے پہلے اتنی تفصیل سے حاصل نہ تھا۔ مثال کے طور پر ذکری عقیدہ و فرقہ۔ فرقہ روشنائیہ اور تحریک نقطوی کا اس کتاب میں اچھا خاصا تعارف کرایا گیا ہے۔ دوسرے باب میں اکبر کے دور بے دینی کی بہت کچھ تفصیل فاضل مصنف نے ابوالفضل کی آئین اکبری سے نقل کی ہے چوتھے باب میں مجدد صاحب کی اسیری کے اسباب اور جہانگیر کے رویے پر انھوں نے اپنے علم و فہم کے مطابق روشنی ڈالی ہے — اسی باب میں حضرت مجدد کی وفات اور ان کی اولاد امجاد کا تذکرہ ہے۔ پانچویں باب میں فاضل مصنف نے مجدد صاحب کے متعدد مکتوبات سے اقتباسات دے کر ان کے کار تجدید کا مرکزی نقطہ متعین کرنے کی سعی کی ہے۔ چھٹے باب میں وحدۃ الوجود اور وحدۃ الشہود کے نظریہ کی مختصر تاریخ لکھ کر مجدد صاحب کے نقطۂ نظر کی تفصیل پیش کی ہے۔ ساتویں باب میں بتایا ہے کہ مجدد صاحب کے اصلاح سلطنت کے کام کا آغاز جہانگیر کی تخت نشینی کے بعد ہوا اور آٹھویں باب سے طریقۂ نقشبندیہ مجددیہ کی وسعت پذیری کا حال معلوم ہوتا ہے — یہ اس کتاب کا مختصر تعارف ہے۔

حضرت مجدد کی مفصل سوانح حیات اور وہ بھی مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے قلم سے — کوئی ایسی کتاب نہیں ہے جس کے مطالعہ کی سفارش کی جائے۔ ہزاروں افراد اس کا مطالعہ کریں گے اور اس سے فائدہ اٹھائیں گے۔ تبصرہ نگار نے تیس سال پہلے اپنی ایک کتاب میں لکھا تھا:

> "امام ربانی قدس سرہٗ کا مجاہدانہ کارنامہ اقامت سنت اور رد بدعت کے ساتھ ان کا بے انتہا شغف اسلام کے ساتھ ان کی پر جوش محبت، ان کی حق پرستی و حق دوستی اور ان کا تقویٰ و طہارت اپنی جگہ آفتاب کی طرح روشن اور ثابت ہے۔"

(تذکرہ شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ ص ۸۰)

اسی کتاب میں، میں نے یہ بھی لکھا ہے:۔

"راقم الحروف کے لیے حضرت مجددؒ کے مکتوبات اور حضرت شیخؒ کی تصنیفات دونوں ہی سرمایۂ سعادت ہیں۔" (ص ۸۹)

تیس سال کے بعد اب بھی اس خیال میں فرق نہیں آیا ہے لیکن مجھے بزرگوں سے اندھی عقیدت نہ اس وقت تھی اور نہ اب ہے۔ فاضل مصنف کا روحانی تعلق طریقۂ مجددیہ ہی سے ہے۔ اس لیے حضرت مجدد سے ان کی عقیدت ومحبت کو پر جوش ہونا ہی چاہیئے۔ یہ کتاب اس کا ایک ثبوت ہے۔

اس کتاب کی متعدد باتوں سے تبصرہ نگار کو اطمینان نہیں ہوا۔ اس لیے ان کی طرف اشارہ کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

۱۔ بدعت کی قسمیں

بدعت حسنہ کے انکار کو اس کتاب میں حضرت مجدد کا قابل فخر کارنامہ قرار دیا گیا ہے اور بڑے جوش کے ساتھ اس کا ذکر کیا گیا ہے۔ (ص ۲۵۶ ۔ ۲۵۷)

تبصرہ نگار برسہا برس سے اس مسئلے پر غور کرتا رہا ہے۔ آج تک یہ بات معلوم نہیں ہو سکی کہ علمائے حق میں وہ کون لوگ ہیں جنھوں نے بدعت شرعی اصطلاحی کی دو قسمیں، بدعتِ حسنہ اور بدعتِ سیئہ قرار دی ہیں۔ نہ تو مجدد صاحب نے ان میں سے کسی کا نام لیا ہے اور نہ فاضل مصنف نے۔ اس کتاب میں بدعت شرعی کی تشریح کی گئی ہے اور ص ۲۵۶ پر حاشیہ میں بدعت کی دو قسمیں بنانے والوں کی تردید کرتے ہوئے لکھا ہے:

"ان لوگوں کی سب سے بڑی دلیل حضرت عمرؓ کا قول ہے جو انھوں نے جماعت کے ساتھ تراویح پڑھنے والوں کو دیکھ کر فرمایا تھا۔ نعمت البدعۃ ھذہٖ (یہ بڑی اچھی بدعت ہے) حالانکہ اس پر اتفاق ہے کہ یہاں محض لغوی حیثیت سے اس کو بدعت کہا گیا ہے ورنہ تراویح کا پڑھنا احادیث صحیحہ سے ثابت اور متواتر ہے۔ بدعت کی تعریف کے لیے امام شاطبی کی کتاب "الاعتصام بالسنۃ" اور مولانا اسمٰعیل شہیدؒ

کی کتاب "ایضاح الحق الصریح فی احکام المیت والضریح" جو اس موضوع پر بہترین کتاب ہے، مطالعہ کرنی چاہیئے۔"

یہ حیرت کی بات ہوگی اگر فاضل مصنف کو اس کا علم نہ ہو کہ جن علمائے حق نے بدعت کی تقسیم کی ہے انھوں نے محض لغوی معنے ہی کے لحاظ سے کی ہے۔ کوئی صاحب علم مسلمان اس کی جرأت نہیں کر سکتا کہ بدعت شرعی کی دو قسمیں "حسنہ اور سیئہ" قرار دے۔ باقی رہی لغوی معنے کی حیثیت سے بدعت کی تقسیم تو اس کی سب سے بڑی دلیل حضرت عمرؓ کا قول نہیں خود ارشاد نبویؐ ہے۔ ایک حدیث مرفوع میں "بدعت ضلالۃ" کی ترکیب استعمال کی گئی ہے،

ومن ابتدع بدعة ضلالة لا یرضاها الله و رسوله کان علیه مثل آثام من عمل بها لا ینقص من اوزار الناس شیئا [1]	اور جس نے بدعت ضلالہ ایجاد کی جس کو اللہ اور اس کے رسولؐ پسند نہیں کرتے تو اس پر ان لوگوں کے مثل گناہ عائد ہوں گے جنھوں نے اس بدعت پر عمل کیا اور ان لوگوں کے گناہوں میں کوئی کمی نہیں کی جائے گی۔

مسلم شریف کی ایک حدیث میں "سنت" کی دو قسمیں "حسنہ اور سیئہ" قرار دی گئی ہیں ؛

من سن فی الاسلام سنة حسنة فعمل بها بعده کتب له مثل من عمل بها ولا ینقص من اجورهم شیئ ومن سن فی الاسلام سنة سیئة فعمل بها بعده کتب	اور جس نے دین اسلام میں کوئی اچھا طریقہ نکالا پھر اس پر عمل کیا گیا تو اس پر ان لوگوں کے مثل اجر لکھا جائے گا جنھوں نے اس پر عمل کیا اور ان لوگوں کے اجر میں کوئی کمی نہیں ہوگی اور جس نے دین اسلام میں کوئی برا طریقہ نکالا پھر اس پر عمل کیا گیا تو اس کے لیے ان لوگوں کے مثل

---

[1] ترمذی ج ۲ ابواب العلم، باب الاخذ بالسنۃ واجتناب البدعۃ

له مثل وزار من	وزن لکھا جائے گا جنھوں نے اس پر عمل
عمل بھا ولا ینقص	کیا اور ان لوگوں کے وزر میں کوئی کمی نہیں
من اوزارھم شیئی له	ہوگی۔

جس چیز کو اس حدیث میں سنت سیئہ کہا گیا ہے اسی چیز کو ترمذی کی حدیث میں بدعت ضلالۃ کہا گیا ہے۔ سوال یہ ہے کہ جب حدیث میں بدعۃ ضلالۃ کی ترکیب استعمال کی گئی ہے اور جب حدیث میں "سنت" کی دو قسمیں "حسنہ اور سیئہ" قرار دی گئی ہیں تو بدعت کی دو قسمیں حسنہ اور سیئہ کیوں نہیں ہو سکتیں۔ ظاہر ہے کہ بدعت ضلالت کی ترکیب لغوی ہی معنے کے لحاظ سے ہے اور سنت کی تقسیم حسنہ اور سیئہ میں لغوی ہی معنے کے لحاظ سے ہے۔ اسی طرح جن لوگوں نے بدعت کی دو قسمیں حسنہ اور سیئہ قرار دی ہیں وہ لغوی معنے ہی کی حیثیت سے قرار دی ہیں۔ بدعت حَسنہ تو کم درجے کا لفظ ہے۔ علمائے حق نے تو بعض بدعت کو واجب قرار دیا ہے جیسے فہم قرآن وحدیث کے لیے نحو و صرف کی تعلیم۔ شیخ الاسلام عزالدین بن عبدالسلام نے بدعت کی کئی قسمیں قرار دی ہیں۔ واجب، حرام، مندوب، مکروہ۔ یہ تقسیم بدعت کے لغوی معنے ہی کے لحاظ سے ہو سکتی ہے۔ شیخ الاسلام عزالدین بن عبدالسلام جس پائے کے عالم دین تھے اس سے فاضل مصنف خوب واقف ہیں۔ انھوں نے تاریخ دعوت وعزیمت حصہ اول میں ان کا تذکرہ کیا ہے۔ نامناسب نہیں ہے کہ میں فاضل مصنف کو مجدد صاحب کی ایک عبارت یاد دلاؤں انھوں نے ایک طرف بدعت کی تقسیم کا انکار کیا ہے اور دوسری طرف دین کو دو قسموں میں تقسیم کر دیا ہے۔ احکام شرعیہ۔ امور دینیہ۔ لکھا ہے کہ احکام شرعیہ کے چار دلائل ہیں۔ کتاب۔ سنت۔ اجماع۔ قیاس اور امور دینیہ کے پانچ دلائل ہیں۔ پانچویں دلیل الہام ہے بلکہ کتاب وسنت کے بعد تیسری دلیل الہام ہے وہ علمائے ظواہر پر تنقید کرتے ہوئے لکھتے ہیں :۔

له مسلم ج ۲ کتاب العلم باب من سن سنۃ حسنۃ الخ

علماء ظواہر در امور دین اخبار غیبیہ را مخصوص باخبار پیغمبراں می دانند علیہم الصلوات والتسلیمات و دیگراں را دراں اخبار شرکت نمی دہند۔ ایں معنے منافی وراثت است ونفی است مر بسیارے از علوم و معارف صحیحہ کہ بدین متین تعلق دارند۔ آری احکام شرعیہ مربوط بادلۃ اربعہ است کہ الہام را دراں گنجائش نیست ۔ اما امور دینیہ ماورائے احکام شرعیہ بسیار است کہ اصل خامس دراں جا الہام بلکہ تواں گفت کہ اصل ثالث الہام است بعد کتاب وسنت، ایں اصل تا انقراض عالم برپا است ۔

(مکتوب ۵۵ ج ۲ مطبوعہ نول کشور)

علمائِ ظواہر امور دین میں اخبار غیبیہ کو انبیاء علیہم السلام کی دی ہوئی خبروں کے ساتھ مخصوص جانتے ہیں اور اخبار غیبیہ میں دوسرے لوگوں کی شرکت تسلیم نہیں کرتے ۔ یہ بات منافی وراثت ہے اوران بہت سے علوم ومعارف صحیحہ کی نفی ہے جو دین حق سے تعلق رکھتے ہیں ۔ ہاں، احکام شرعیہ چار دلیلوں کے ساتھ مربوط ہیں وہاں الہام کی گنجائش نہیں ہے لیکن امور دینیہ جو احکام شرعیہ کے ماورا بہت ہیں ان میں الہام پانچویں اصل ہے بلکہ کہا جا سکتا ہے کہ کتاب وسنت کے بعد تیسری اصل الہام ہے ۔ یہ اصل تا قیامت باقی ہے ۔

مطلب یہ ہے کہ جن علماء کو انبیاء کا وارث قرار دیا گیا ہے اگر اخبار غیبیہ میں انبیاء کے ساتھ ان کی شرکت تسلیم نہ کی جائے تو یہ بات نہ صرف یہ کہ منافی وراثت انبیاء ہے بلکہ بہت سے ان علوم اور معارف صحیحہ کی نفی ہے جن کا دین متین سے تعلق ہے ۔ اس کے بعد مجدد صاحب نے احکام شرعیہ اور امور دینیہ کی تقسیم کر کے امور دینیہ میں الہام کو پانچویں اصل بلکہ تیسری اصل قرار دیا ہے ۔ اوپر جو عبارت نقل کی گئی ہے وہ ایک طویل مکتوب کا اقتباس ہے ۔ اس خط کے آخر میں مجدد صاحب نے اجتہاد پر الہام کی فضیلت بھی ثابت کی ہے ۔

مولانا علی میاں مدمجدہٗ خود غور فرمائیں کہ اس تقسیم کے بعد بدعت کی تقسیم کیا حیثیت رکھتی ہے اور اس کا انکار کس قدر عجیب وغریب معلوم ہوتا ہے ۔

اس تبصرے میں صرف اشارہ کرنے پر اکتفا کرتا ہوں اگر اس تقسیم اور اس عبارت

کے مضمرات و متضمنات کی تشریح کی جائے تو بات لمبی ہو جائے گی۔

ان باتوں کے علاوہ دیکھنے کی بات یہ بھی ہے کہ خود مجدد صاحب کو بدعت منکر و غیر منکر کی تقسیم کرنی پڑی ہے۔ ان سے ایک صاحب نے پوچھا تھا کہ آپ ذکر جہر سے اس لیے منع کرتے ہیں کہ وہ بدعت ہے باوجود اس کے کہ اس سے ذوق و شوق پیدا ہوتا ہے تو پھر آپ ان دوسری چیزوں سے کیوں منع نہیں کرتے جو آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں نہ تھیں۔ مثلاً لباس فرجی، شال اور سراویل ـــــ اس کے جواب میں مجدد صاحب نے لکھا ہے:

"آں سرور علیہ وعلیٰ آلہ الصلوٰۃ والسلام کا عمل دو نوعیت کا ہے۔ ایک بر سبیل عبادت ہے اور دوسرا بر سبیل عرف و عادت۔ آپؐ کا جو عمل بر سبیل عبادت تھا اس کے برخلاف عمل کو میں بدعت منکر جانتا ہوں اور اس سے منع کرنے میں مبالغہ کرتا ہوں۔ اس لیے کہ وہ دین میں ایک نئی بات ہے اور وہ مردود ہے۔ رہا وہ عمل جو بربنائے عرف و عادت تھا اس کے برخلاف عمل کو میں بدعت منکر نہیں سمجھتا اور اس سے منع کرنے میں مبالغہ نہیں کرتا کیوں کہ اس کا دین سے تعلق نہیں ہے۔"

(مکتوب ۲۳۱ ج اول مطبوعہ نول کشور)

اس سے قطع نظر کہ ذکر جہر بدعت منکر ہے یا نہیں، اس سے اتنا تو معلوم ہوا کہ بدعت منکر جس کو حدیث میں مردود قرار دیا گیا ہے، دین میں نئی بات پیدا کرنے کو کہتے ہیں۔ باقی رہیں وہ باتیں جن کا تعلق احداث فی الدین سے نہ ہو ان پر اس بدعت کا اطلاق نہیں ہوگا جس کو حدیث میں مردود اور ضلالت قرار دیا گیا ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا دوسرے علماء اس کے سوا کچھ اور کہتے ہیں؟ باقی رہے وہ لوگ جنھوں نے دین میں نئی باتیں پیدا کی ہیں اور ان کو وہ بدعت حسنہ کہتے ہیں ان کا جواب یہ نہیں ہے کہ لغوی معنی کی حیثیت سے بھی بدعت کی تقسیم کا انکار کر دیا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ خود مجددؒ صاحب کو عبادت اور عرف و عادت کے لحاظ سے بدعت کی تقسیم کرنی پڑی ہے۔

حاصل کلام یہ ہے کہ کسی عالم دین نے بدعت ضلالت کو حسنہ قرار نہیں دیا ہے اور

لغوی معنی کی حیثیت سے بدعت کی تقسیم کا انکار ہر بجا غلط ہے۔

۲۔ وحدۃ الوجود اور وحدۃ الشہود

وحدۃ الوجود اور وحدۃ الشہود، فلسفیانہ تصوف کے شاید سب سے نمایاں مباحث ہیں اور ان بحثوں نے اسلامی تصوف کا حلیہ بگاڑ کر رکھ دیا ہے۔ تبصرہ نگار نے تذکرہ شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ میں لکھا ہے:

"یہ فلسفیانہ نظریہ چاہے اپنے اصل مفہوم کے لحاظ سے صحیح ہی کیوں نہ ہو لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ دین اسلام کے اصول و فروع میں اس کا کوئی ذکر نہیں اور اس سے تذبذب، شک اور گمراہی حاصل کرنے والوں کی تعداد بے شمار ہے۔ محدث دہلوی کے عہد میں بھی اس نظریہ کا بڑا زور تھا اور فرقہ "وجودیہ" فتنہ انگیزی میں مشغول۔ اکبر کو احمق بنانے والوں میں ان لوگوں کا بھی ہاتھ تھا۔ حضرت شیخ نے اس فرقے پر سخت تنقید اور صحیح تصوف کی نشر و اشاعت کر کے اس فتنے کے سد باب کی سعی بلیغ کی۔" (ص ۱۱۵)

مجدد صاحب نے وحدۃ الوجود اور وحدۃ الشہود کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے اس کی دلیل خود ان کے "کشف و شہود" کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ فاضل مصنف نے اپنی کتاب کا باب ششم جو ۲۹ صفحات پر پھیلا ہوا ہے اسی بحث کے حوالہ کیا ہے۔

تبصرہ نگار عرض کرتا ہے کہ جب دلیل کشف و شہود ہے تو کسی ایک بزرگ کے کشف و شہود کو کسی دوسرے بزرگ کے کشف و شہود پر ترجیح کیوں ہو گی۔ جو لوگ جس بزرگ کے مرید و عقیدت مند ہوں گے وہ اسی بزرگ کے کشف و شہود کو ترجیح دیں گے۔ دوسری بات یہ کہ جو لوگ وحدۃ الوجود اور وحدۃ الشہود کے اختلاف کو نزاع لفظی قرار دیتے ہیں ان کے نزدیک وحدۃ الوجود کے انکار کی کیا وقعت ہو گی۔ تیسری بات یہ کہ جب وحدۃ الشہود کا قول مجدد صاحب کے زمانے سے پہلے سے موجود ہے

تو مجدد صاحب کا کام اس کے سوا اور کیا ہے کہ انھوں نے اپنے رنگ میں اس کی تشریح کی ہے۔ جو لوگ وحدۃ الوجود اور وحدۃ الشہود کو ایک قرار دیتے ہیں ان میں حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ بھی ہیں۔ تبصرہ نگار نے اپنی کتاب میں لکھا ہے:-

"حضرت مجدد الف ثانی رحمہ اللہ (م ۱۰۳۴ھ) نے وحدت وجود یعنی ہمہ اوست کی تردید کر کے وحدت شہود یعنی ہمہ از اوست کی تائید کی۔ ہمہ اوست اور ہمہ از اوست کے دونوں نظریے پہلو بہ پہلو حضرت مجدد کے عہد سے بہت پہلے سے چلے آرہے تھے یہی وجہ ہے کہ وحدت شہود کو پھیلا کر بیان کرنے اور اس کو مقامات سلوک کا اعلیٰ مقام ثابت کرنے سے بھی کوئی فائدہ نہ ہوا۔ یہاں تک کہ خود حضرت مجدد ہی کے سلسلے کے عالی شان محدث حضرت شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ (م ۱۱۷۶ھ) نے وحدت وجود اور وحدت شہود کو ایک اور متحد ثابت کرنے کے لیے مستقل ایک رسالہ تصنیف فرمایا اور مسئلہ جوں کا توں رہا۔" (تذکرہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی ص ۱۱۰)

فاضل مصنف نے اپنی کتاب میں ان کا نام درج کرنا پسند نہیں کیا اور محض اشارہ کر کے گزر گئے۔ ممکن ہے یہ سمجھا ہو کہ شاہ ولی اللہ صاحبؒ کا نام لکھنے سے حضرت مجدد رحمۃ اللہ کا موقف دب جائے گا۔ تبصرہ نگار کی رائے یہ ہے کہ تصوف کو اس بحث سے پاک کرنا ضروری ہے۔ کیوں کہ اس کا اسلامی تصوف یعنی تزکیہ نفس اور احسان سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

(۳) شیخ احمد سرہندیؒ کے بعض دعاوی سے شیخ عبدالحق محدثؒ دہلوی کا اختلاف

فاضل مصنف نے باب ہفتم میں ایک مستقل فصل درج ذیل عنوان سے لکھی ہے:

"حضرت مجدد کی مخالفت و تضلیل کی تحریک اور اس کے نمایاں افراد۔"

انھوں نے ۱۵ صفحات میں اس کی تفصیل دی ہے۔ مخالفت کو انھوں نے دو قسموں میں تقسیم کیا ہے۔

"ایک وہ مخالفت جو مخالفین کی غلط بیانی کی بنیاد پر، یا کسی غلط فہمی کے نتیجے میں پیدا ہوئی اور اس غلط بیانی اور سازش کا پردہ چاک ہونے یا

اس غلط فہمی کے دور ہو جانے کے بعد رفع ہو گئی، دوسری وہ مخالفت جو اختلاف عقیدہ و مسلک یا ذاتی عناد پر مبنی تھی۔ پہلی قسم میں ہم حضرت شیخ محدث دہلویؒ (م ۱۰۵۲) کے اختلاف کو لیتے ہیں، جن کا علمی و دینی پایہ، خلوص و للہیت اور دینی حمیت مسلّم ہے۔ (ص ۳۴۷)

شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے شیخ احمد سرہندی کو جو طویل خط لکھا تھا اس کے بارے میں مولانا علی میاں نے کئی باتیں لکھی ہیں۔ پہلی بات یہ لکھی ہے:

"حضرت شیخ عبدالحق کے اس طویل مکتوب میں حضرت مجددؒ کی جو باتیں نقل کی گئی ہیں ان کے بارے میں مجددی سلسلے کے بہت سے اہل علم واہل نظر کی تحقیق ہے کہ وہ محرف اور غلط ہیں۔"

شیخ عبدالحق کا وہ مکمل خط "حیات شیخ عبدالحق مصنفہ خلیق نظامی" میں شائع ہو گیا ہے اس کا ذکر فاضل مصنف نے بھی کیا ہے۔ تبصرہ نگار نے وہ خط بھی پڑھا ہے اور مجدد صاحب کے مکتوبات بھی پڑھے ہیں اس لیے یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ شیخ عبدالحق نے مجدد صاحب کی جو باتیں لکھی ہیں وہ سب کی سب محرف اور غلط ہیں ــــ وہ محرف اور غلط نہیں ہیں، بلکہ اصل باتیں آج بھی مکتوبات مجددی میں چھپی ہوئی موجود ہیں۔ شیخ عبدالحق نے اپنے طویل خط میں مجدد صاحب کے ایک مکتوب ہی پر تنقید کی ہے۔ اگر اس تبصرے کے بہت طویل ہو جانے کا اندیشہ نہ ہوتا تو میں شیخ عبدالحق کی عبارتیں یہاں پیش کرتا حضرت مجدد کے بعض اقوال جو حضرت شیخ تک پہنچائے گئے تھے وہ غلط ہو سکتے ہیں لیکن جو باتیں مکتوبات میں لکھی ہوئی ہیں وہی کیا کم ہیں ــــ

دوسری بات فاضل مصنف نے یہ لکھی ہے:

"یہ ایک نجی مکتوب تھا۔ حضرت شیخ نے اس کو اپنی کتاب "المکاتیب والرسائل" میں درج نہیں کیا۔ حضرت مرزا جانان جاناں کے ارشاد کے بموجب شیخ نے اس مکتوب کو ضائع کرنے کی وصیت کی۔"

دوسری طرف فاضل مصنف نے حاشیے میں سات افراد کے نام لکھے ہیں جنھوں نے

حضرت شیخ کے مکتوب کے مستقل جوابات لکھے ہیں اور اس کے رد میں ایک کتاب "ہدیۂ مجددیہ" ۳۳۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ سوال یہ ہے کہ اگر حضرت شیخ نے اس خط کو ضائع کر دینے کی وصیت کی تھی تو پھر اس کے رد میں اس کثرت سے کتابیں تیار کرنے کی کیا ضرورت تھی؟

پروفیسر خلیق نظامی صاحب نے اپنی کتاب "حیات شیخ عبدالحق" میں لکھا ہے:

"شیخ محدث نے مجدد صاحب کے جن جن خیالات پر اعتراض کیا ہے ان پر سنجیدگی سے غور کرنے کی ضرورت ہے۔ جس شخص نے مجدد صاحب پر اعتراض کیے ہیں اس کو ان سے جو محبت تھی اس کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے۔

"ایں مقدار کہ مرا بشما نسبت محبت و اتحاد است کم کسے را خواہد بود۔" (ص ۳۱۲)

حضرت مجدد کے عقیدت مند شاید یہ سمجھتے ہیں کہ کون یہ زحمت برداشت کرے گا کہ حضرت شیخ کے خط اور حضرت مجدد کے مکتوبات کو سامنے رکھ کر فیصلہ کرے۔ ان کا ایسا سمجھنا بڑی حد تک صحیح ہے لیکن کچھ لوگ ہیں خواہ ان کی تعداد کتنی ہی کم ہو جنھوں نے تحقیق کے لیے شیخ عبدالحق کے خط اور مجدد صاحب کے مکتوبات دونوں کو پڑھا ہے۔ مجدد صاحب کے جن دعاوی اور خیالات پر اعتراضات کیے گئے ہیں ان میں شیخ عبدالحق حق بجانب ہیں۔

فاضل مصنف نے تیسری بات یہ لکھی ہے:-

"اس مکتوب کا ایک بڑا محرک حضرت شیخ کی سید عبدالقادر جیلانی قدس سرہٗ کے ساتھ وہ یگانہ عقیدت بھی ہے جو عشق و فنائیت کے درجے تک پہنچی ہوئی تھی اور وہ ہر طرح سے قابل تحسین بلکہ قابل رشک ہے اور اس میں امت کا ایک بڑا طبقہ ہر عہد و ملک میں ان کا شریک ہے۔ حضرت شیخ کا خیال ہے کہ حضرت مجدد کے کلام سے ان پر اپنی فوقیت ثابت ہوتی ہے۔" (ص ۳۳۸)

افسوس ہے کہ فاضل مصنف کی یہ بات بھی غلط ہے۔ شیخ عبدالحق کے خط میں اس

کی واضح تردید موجود ہے۔ لیکن فاضل مصنف کو بھی شاید یہ اطمینان ہو گا کہ ان کے عقیدت مند شیخ عبدالحق کا خط پڑھنے کی زحمت کیوں گوارہ کریں گے۔ شیخ عبدالحق نے صاف الفاظ میں لکھا ہے کہ جب تک شیخ سرہندی بزرگانِ دین جنید بغدادیؒ، بایزید بسطامیؒ، شیخ عبدالقادر جیلانیؒ اور خود اپنے پیر باقی باللہ پر اپنی فوقیت کا دعویٰ کرتے رہے وہ صبر کرکے خاموش رہے لیکن جب انھوں نے سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے ہمسری کا دعویٰ کیا تو شیخ کا دامن صبر ان کے ہاتھ سے چھوٹ گیا اور انھوں نے مجدد صاحب کو متنبہ کرنا ضروری سمجھا۔ مجدد صاحب کے چند خیالات کا ذکر کرنے کے بعد جس میں شیخ عبدالقادر جیلانی پر اپنی فوقیت کا بھی ذکر ہے، حضرت شیخ نے لکھا ہے:

وامثال ایں کلمات در مکتوبات	اس قسم کے کلمات آپ کے مکتوبات میں
ایشاں مذکور است وایں ہمہ را	مذکور ہیں اور میں نے ان سب سے درگزر
گزرانیدم تا نوبتِ ایں مکتوب رسید۔	کیا تھا یہاں تک کہ اس مکتوب کی نوبت
(حیات شیخ عبدالحق ۳۱۵)	آگئی۔

اس کے بعد حضرت شیخ نے اس مکتوب کی بہت سی عبارتیں نقل کی ہیں ان پر مفصل اور مدلل تنقید کی ہے۔ جن لوگوں نے خود مکتوبات مجددی کا مطالعہ کیا ہے وہ جانتے ہیں کہ بات اس سے بھی آگے بڑھی اور مجدد صاحب نے اپنی "قیومیت" کا دعویٰ بھی کر ہی دیا۔ "نظریہ قیومیت" کے لیے مکتوب ۴، ج ۲ مطبوعہ نول کشور پریس کان پور، ایضاً مکتوب ۹، ج ۳، ایضاً مکتوب ۸۰ ج ۳، ایضاً مکتوب ۹۵ ج ۲، ایضاً مکتوب ۱۰۴ ج ۳ کا مطالعہ کرنا چاہیے۔

عقیدت کا غلو ان دعاوی کے بارے میں جو کچھ بھی کہے، ہم ان کو "شطحیات" میں شمار کرتے ہیں۔ آخر پہلے بھی تو بعض بزرگوں نے "سبحانی ما اعظم شانی" اور "لیس فی جبتی سوی اللہ" کہا ہے۔ تصوف کی دوسری کتابوں کی طرح مکتوبات مجددی بھی تضادات کا مجموعہ ہے۔

(۴) مکتوبات مجددی کے بہت بڑے حصے سے فاضل مصنف کی چشم پوشی

فاضل مصنف نے مکتوبات مجددی کا اپنی کتاب میں صرف وہ حصہ پیش کیا ہے جس میں طریقت و تصوف کو شریعت کا خادم کہا گیا ہے یا یہ کہ طریقت' شریعت سے الگ کوئی چیز نہیں ہے لیکن ان مکتوبات کی طرف کوئی اشارہ بھی نہیں کیا ہے جن سے معلوم ہوتا ہے کہ طریقت و تصوف شریعت سے ایک علیحدہ چیز ہے جو لوگ مکتوبات کا خود مطالعہ کرتے ہیں ان کے سامنے دونوں قسم کے مکتوبات آتے ہیں اور "علم الاسرار" کو علم الاحکام سے الگ ثابت کرنے والے مکتوبات کی تعداد کم نہیں ہے۔

اسی طرح کے ایک مکتوب کا اقتباس اس تبصرے کے شروع میں دیا جا چکا ہے اس میں مجدد صاحب نے دین کو دو قسموں میں تقسیم کیا ہے۔ احکامِ شرعیہ۔ امورِ دینیہ احکام شرعیہ کی چار اصلیں ہیں۔ کتابؔ۔ سنّتؔ۔ اجماعؔ۔ قیاسؔ۔ لیکن امور دینیہ کے لیے مجدد صاحب نے الہام کو پانچویں بلکہ تیسری اصل قرار دیا ہے۔ امور دینیہ سے مراد "علم الاسرار" ہے کیوں کہ احکام شرعیہ میں غیر نبی کا الہام سرے سے کوئی اصل و ماخذ ہے ہی نہیں اور خود مجدد صاحب نے اس کی صراحت کی ہے۔ اس طرح مجدد صاحب نے شریعت اور طریقت کو خود دو قسموں میں تقسیم کر کے ان دونوں کو الگ الگ کر دیا ہے۔

مجھے یہ پڑھ کر بڑی حیرت ہوئی کہ "علم الاسرار" کے اثبات کے لیے مجدد صاحب نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی وہ حدیث پیش کی ہے جس کو فرقہ باطنیہ نے اپنے باطل خیالات پھیلانے کے لیے بہانہ بنایا تھا۔ مجدد صاحب اپنے آپ کو جن اسرار و دقائق و حقائق کا حامل سمجھتے تھے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ایک مکتوب میں لکھتے ہیں:

ایں دولت کہ مادر استتار آں می کوشیم متقبس از مشکوٰۃ نبوت انبیاء است و ملائکہ ملاء اعلیٰ شریک آں دولت اند و از متابعان انبیاء ہر کرا بایں دولت مشرف	یہ دولت جسے چھپانے کی ہم کوشش کرتے ہیں نبوت انبیاء کے مشکوٰۃ (چراغ دان) سے مقتبس ہے اور ملاء اعلیٰ کے ملائکہ اس دولت میں شریک ہیں اور انبیاء کی پیروی

سازند ابوہریرہؓ گوید کہ من از رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم دو نوع علم اخذ نمودم یکے ازاں دو علم آنست کہ درمیان شما منتشر ساختم و علم دیگر را اگر منتشر سازم حلقوم مرا ببرند و آں علم دیگر علم اسرار است کہ فہم ہر کس بآں نرسد ذالک فضل اللہ یوتیہ من یشاء واللہ ذوالفضل العظیم

(مکتوب ۲۶۷ ج ۱)

کرنے والوں میں جسے اس دولت سے مشرف کریں۔ ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ میں نے رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم سے دو نوع کے علم حاصل کیے ہیں۔ ایک علم وہ ہے جو میں نے تمہارے درمیان پھیلا دیا ہے اور دوسرا علم اگر پھیلاؤں تو لوگ میرا گلا گھونٹ دیں اور وہ دوسرا علم۔ علم الاسرار ہے کہ ہر شخص کا فہم اس تک نہیں پہنچتا۔ یہ اللہ کا فضل ہے وہ جس کو چاہتا ہے دیتا ہے اور اللہ بڑے فضل والا ہے۔

علم اسرار کے لیے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کے اس قول سے استدلال کا مطلب یہ ہوا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ علم اسرار جس کے اظہار سے گلا کٹ جانے کا اندیشہ ہوتا ہے تمام صحابہ کو نہیں سکھایا بلکہ خاص خاص صحابہ کو سکھایا جن میں ایک حضرت ابوہریرہؓ بھی ہیں۔ یہ بات بھی سامنے رکھیے کہ علم اسرار ہی مجدد صاحب کے نزدیک وہ علم ہے کہ اگر کسی عالم دین کو حاصل نہ ہو تو نہ وہ "العلماء ورثۃ الانبیاء" کی صف میں داخل ہو سکتا ہے اور نہ وہ راسخین فی العلم میں شامل ہو سکتا ہے بلکہ اس کا شمار علمائے ظواہر میں ہوگا۔

مجدد صاحب کے اس استدلال سے تبلیغ رسالت و نبوت پر کیا ضرب پڑتی ہے، اس سے قطع نظر یہ بات بالکل صاف ہو گئی کہ علم اسرار بالکل علیحدہ چیز ہے جسے حاصل کرنے کے لیے کتاب و سنت کا علم کافی نہیں بلکہ اسے صوفیہ کے علم سینہ ہی سے حاصل کیا جا سکتا ہے کیوں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ علم سب کو نہیں سکھایا خاص خاص لوگوں کو سکھایا جو سینہ بہ سینہ صوفیائے کرام تک پہنچا ہے۔

حضرت ابوہریرہؓ کا وہ قول امام بخاریؒ نے کتاب العلم میں درج کیا ہے۔ اس کے الفاظ یہ ہیں:

حفظت من رسول اللہ صلی اللہ

میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے

علیہ وسلم وعائین فاما احدھما فبثثتہ فیکم واما الآخر فلو بثثتہ قطع ھذا البلعوم (باب حفظ العلم)

دو وعا یاد کیے ہیں۔ رہا ان میں سے ایک تو میں نے اس کو تمھارے درمیان پھیلایا ہے اور رہا دوسرا تو اگر میں اس کو پھیلاؤں تو میری گردن کاٹ دی جائے۔

حافظ ابن حجر نے فتح الباری ج ۱ میں لکھا ہے کہ حضرت ابوہریرہؓ نے جس دوسرے دعاءِ علم کا ذکر کیا ہے علماء کے نزدیک اس سے مراد امرائے سوء کے نام، ان کے احوال اور ان کے زمانے ہیں حضرت ابوہریرہؓ کو اندیشہ تھا کہ اگر ان کے نام، حالات اور ادوار لوگوں کو بتائے جائیں تو امرائے سوء ان کو قتل کر دیں گے۔ علامہ ابن حجر نے ابن المنیر کا یہ قول بھی نقل کیا ہے کہ فرقہ باطنیہ نے اپنے باطل کو صحیح ثابت کرنے کے لیے حضرت ابوہریرہؓ کے اس قول کو ذریعہ اور بہانہ بنایا ہے۔

فرقہ باطنیہ نے دین اسلام کا قلادہ اپنی گردنوں سے نکال پھینکنے کے لیے ابوہریرہؓ کے اس قول کو ذریعہ بنایا اور حضرت مجدد نے علم الاسرار کے لیے اس کو بطور دلیل استعمال کیا ہے جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا اس استدلال نے طریقت و تصوف کو شریعت سے بالکل الگ کر دیا ہے۔

مجدد صاحب نے قرآن حکیم کی آیات متشابہات کو علم حقائق و اسرار کا مخزن قرار دے کر لکھا ہے:

ید و وجہ و قدم و ساق و اصابع و انامل کہ در قرآن و حدیث آمدہ است ہمہ از متشابہات است و ہم چنیں حروف مقطعات کہ در اوائل قرآن وارد شدہ اند نیز از متشابہات اند کہ بر تاویل آنہا اطلاع نہ دادہ مگر علماء راسخین را خیال نہ کنند کہ تاویل،

ہاتھ، چہرا، قدم، ساق اور انگلیاں یہ الفاظ جو قرآن و حدیث میں آئے ہیں وہ سب متشابہات میں سے ہیں۔ اسی طرح حروف مقطعات جو قرآن کی سورتوں کی ابتدا میں ہیں یہ بھی متشابہات میں سے ہیں۔ اس کی تاویل (حقیقت و مفہوم) کی اطلاع کسی کو نہیں دی ہے۔

عبارت از قدرت است کہ بہ ید تعبیر آں
نمودہ اند و یا ذات است کہ بوجہ آں
را معبر ساختہ بلکہ آنہا از اسرار غامضہ
است کہ با خص خواص آنرا نمودہ اند
از حروف مقطعات قرآنی چہ نویسد
کہ ہر حرفے بحریست مواج از اسرار
خفیہ عاشق و معشوق و رمزیست
غامض از رموز دقیقہ محب و محبوب
و محکمات ہر چند امہات کتاب
اند اما نتائج و ثمرات آں کہ متشابہات
اند از مقاصد کتاب اند، امہات
از وسائل بیش نیستند از برائے
حصول نتائج پس لب کتاب
متشابہات اند و محکمات کتاب
قشر آں لب، متشابہات اند کہ
برمز و اشارہ بیان اصل می نمایند
و از حقیقت معاملہ آں مرتبہ
نشان می دہند بخلاف محکمات
متشابہات حقائق اند و محکمات
نسبت بمتشابہات صور آں حقائق،
عالم راسخ کسے بود کہ لب را
بقشر تواند جمع ساخت و حقیقت
را بصورت تواند فرود آورد، علماء

البتہ علماء راسخین کو اس کی اطلاع دی ہے
یہ خیال نہ کریں کہ ید کو قدرت کے معنے میں
لینا اس کی تاویل ہے یا وجہ کا لفظ ذات
کی تعبیر ہے بلکہ یہ سب گہرے اسرار ہیں جو
اخص خواص کو بتائے گئے ہیں۔ حروف
مقطعات کے بارے میں کیا لکھوں کہ
اس کا ہر حرف عاشق و معشوق کے درمیان
مخفی اسرار کا بحر مواج اور محب و محبوب
کے درمیان دقیق رموز کی گہری علامت ہے۔
محکمات اگرچہ امہات کتاب ہیں لیکن متشابہات
جو ان امہات کتاب کے نتائج و ثمرات ہیں
وہ مقاصد کتاب ہیں۔ امہات ان نتائج
کے حصول کے لیے وسائل سے زیادہ نہیں
ہیں پس کتاب اللہ کا مغز متشابہات ہیں
اور محکمات کتاب اس مغز کا چھلکا ہیں
یہ متشابہات ہی ہیں جو رمز و اشارے میں
اصل کو بیان کرتی اور اس مرتبہ کے حقیقت
معاملہ کی نشان دہی کرتی ہیں بخلاف محکمات
— متشابہات حقائق ہیں اور محکمات
ان حقائق کے لیے بمنزلہ صور و اشکال ہیں
عالم راسخ وہ ہوتا ہے جو مغز کو چھلکے کے ساتھ
جمع کر سکتا اور حقیقت کو صورت میں اتار
سکتا ہے۔ علماء قشر (چھلکے کے علماء) چھلکے

قشر بہ قشر خرسند اند و بمحکمات اکتفا نمودہ۔ (مکتوب ۲۶۷ ج ۱ ص ۳۵۷۔ مطبوعہ نول کشور)

پر خوش ہیں اور انھوں نے محکمات پر اکتفا کر لیا ہے۔

اس کے بعد مجدد صاحب نے یہ بھی بتایا ہے کہ جو شخص محکمات کا علم حاصل، اور اس کے مقتضیات پر عمل کیے بغیر متشابہات کی تاویل تلاش کرتا اور صورت کو چھوڑ کر حقیقت کی طرف دوڑتا ہے وہ جاہل ہے اور شریعت کا ابطال کرنے والوں کو زندیق قرار دیا ہے۔ علمائے راسخین کے بارے میں بھی تفصیل بیان کی ہے۔

تبصرہ نگار عرض کرتا ہے کہ علمارِ ظواہر اور علمارِ قشر نے محکمات کو چھلکا اور متشابہات کو مغز، محکمات کو وسائل اور متشابہات کو مقاصد، محکمات کو صور و اشکال اور متشابہات کو حقائق قرار دینے کی جرأت نہیں کی ہے۔ وہ متشابہات پر ایمان لائے ہیں لیکن اس کی حقیقت جاننے کے پیچھے نہیں پڑے ہیں۔ اس تبصرے میں مجدد صاحب کے خیالات پر بحث کی ضرورت نہیں ہے۔ یہاں تو ہم صرف یہ دیکھ رہے ہیں کہ انھوں نے ان ارشادات سے یہ بات واضح کر دی ہے کہ طریقت و تصوف شریعت سے الگ ہیں کیوں کہ شارع نے محکمات کو قشر اور متشابہات کو لُب قرار نہیں دیا ہے۔ یہ بات مجدد صاحب کو ان کے الہامات نے بتائی ہے اور اس کی طرف اسی مکتوب کے اخیر میں انھوں نے خود اشارہ کیا ہے۔

محکمات و متشابہات کے اسی مضمون کو مجدد صاحب نے مکتوب ۱۸ ج ۲ میں بھی دُہرایا ہے اور اس میں علم شرائع و احکام کو شریعت کی صورت اور علم حقائق و اسرار کو شریعت کی حقیقت قرار دیا ہے۔ انھوں نے اپنے ایک اور مکتوب میں ان لوگوں کو جنھوں نے اپنے نفس امارہ کو مسلمان نہیں بنایا ہے۔ اصحاب صورت اور جن لوگوں نے اپنے نفس امارہ کی سرکشی ختم کر کے اس کو مسلمان بنا لیا ہے، ان کو اصحاب حقیقت کہا ہے۔ اصحاب صورت کا ایمان صورت ایمان ان کی نماز صورت نماز اور ان کا روزہ صورت روزہ ہوتا ہے اور اسی قیاس پر ان کی تمام عبادتیں۔ ان لوگوں کا اسلام بھی مجازی

اسلام ہوتا ہے ـــــ حقیقی ایمان، حقیقی اسلام، حقیقی نماز اور حقیقی روزہ اصحاب حقیقت کے حصے میں ہے جنھوں نے اپنے نفس امارہ کو مسلمان بنالیا ہو۔ (مکتوب ۵۰ ج ۲)

بڑی خیریت یہ ہے کہ مجدد صاحب نے صورت ایمان اور اسلام مجازی کو نجات اخروی اور دخول جنت کے لیے کافی قرار دیا ہے لیکن اس کے ساتھ ہی انھوں نے جنت کے بھی دو حصے کر دیے ہیں۔ صورت جنت، حقیقت جنت۔ اصحاب صورت، صورت جنت سے فائدہ اٹھائیں گے اور حقیقت جنت، اصحاب حقیقت کو نصیب ہوگی۔ چنانچہ دونوں جنت کا ایک ہی پھل کھائیں گے مگر اصحاب صورت کے لیے مزہ کچھ اور ہوگا اور اصحاب حقیقت کے لیے مزہ کچھ اور ہوگا۔

بلے جنت را ہم صورت ست و ہم حقیقت اصحاب صورت از صورت جنت محظوظ خواہند شد و ارباب حقیقت از حقیقت جنت اصحاب صورت و ارباب حقیقت از یک فاکہہ جنت تناول نمایند صاحب صورت ازاں لذتے یابد و صاحبِ حقیقت لذتِ دیگر۔ (مکتوب ۵۰ ج ۲)

ہاں جنت کی بھی ایک صورت ہے اور ایک حقیقت۔ اصحاب صورت، صورتِ جنت سے محظوظ ہوں گے اور اربابِ حقیقت، حقیقت جنت سے۔ اصحاب صورت و اربابِ حقیقت، جنت کا ایک ہی پھل تناول کریں گے۔ صاحب صورت اس سے ایک لذت پائیں گے اور صاحب حقیقت دوسری لذت۔

مجدد صاحب کے نزدیک جو لوگ علماءِ راسخین یا بلند درجہ صوفیہ میں داخل ہیں ان کے مراتب و مقامات بھی بہت تفصیل سے انھوں نے لکھے ہیں۔ اصالۃً اور تبعاً بطور اصل اور بطور طفیلی کا فرق کر کے انبیاء کرام علیہم السّلام کے تمام کمالات و مقامات بلند درجہ عالی مقام صوفیہ کو بھی عطا فرمائے ہیں اور انھوں نے اسی پر بس نہیں کیا ہے ـــ بلکہ انبیاء کرام کو بھی اپنی طرف سے وہ مقام عطا کیا ہے جس کا کتاب و سنت میں کوئی ذکر نہیں ہے۔ پھر بطور طفیلی وہ مقام عالم راسخ یا عالی مقام صوفی کو بھی عطا کیا ہے وہ مقام ہے تمام اشیاء کی قیومیت کا ـــــ انسان کو اللہ تعالیٰ کی جو خلافت ملی اور اس نے جو بارِ امانت قبول کیا وہ مجدد صاحب کے نزدیک تمام اشیاء کی قیومیت ہے۔"

چنانچہ ان کے خیال میں سب سے پہلے حضرت آدم علیہ السلام مقام قیومیت پر فائز ہوئے تھے۔ قیومیت کا یہ مقام کیا ہے۔ خود مجدد صاحبؒ کے الفاظ میں پڑھیے۔

واں امانت بزعم ایں حقیر قیومیت جمیع اشیاء است بر سبیل نیابت کہ مخصوص بہ کمل افراد انسان است یعنی معاملہ انسان کامل تا بجائے می رسد کہ اورا قیوم جمیع اشیاء بحکم خلافت می سازند وہمہ را افاضہ، وجود وبقائے سائر کمالات ظاہری و باطنی بتوسط او می رسانند اگر ملک است باو متوسل است واگر انس وجن است باو متشبث و فی الحقیقت توجہ جمیع اشیاء بجانب او است وہمہ نگراں اویند

(مکتوب ۴، ج ۲)

اور وہ امانت اس حقیر کے خیال میں تمام اشیاء کی قیومیت ہے جو بر سبیل نیابت انسان کے کامل افراد کے ساتھ مخصوص ہے۔ یعنی انسان کامل کا معاملہ اس مقام تک پہنچ جاتا ہے کہ بحکم خلافت اس کو تمام اشیاء کا قیوم بنا دیتے ہیں اور سب کو وجود کا فیض اور تمام ظاہری و باطنی کمالات کی بقا اسی کے توسط سے پہنچاتے ہیں۔ اگر فرشتہ ہے تو اسی سے متوسل ہے اور اگر جن وانس ہے تو اسی کا دامن تھامے ہوئے ہے اور فی الحقیقت تمام اشیاء کی توجہ اسی کی طرف ہے اور سب اسی کو دیکھ رہے ہیں۔

اسی مکتوب میں انھوں نے لکھا ہے کہ مقام قیومیت پر فائز عارف بمنزلہ وزیر ہوتا ہے۔ انعامات تو بادشاہ کی طرف سے ہوتے ہیں لیکن اس وزیر کا توسط ضروری ہے۔ اسی مکتوب میں انھوں نے سب سے پہلا قیوم حضرت آدم علیہ السلام کو قرار دیا ہے۔ ایک دوسرے مکتوب سے معلوم ہوتا ہے کہ قیومیت جمیع اشیاء کا خلعت مجدد صاحب کو بھی پہنایا گیا تھا۔ پھر ان سے منتقل ہو کر ان کے صاحب زادے خواجہ محمد معصوم تک پہنچا۔

یہ ہے مجدد صاحب کا وہ تصوف جس سے مولانا سید ابو الحسن علی ندوی نے

اپنی کتاب میں چشم پوشی کی ہے۔ کیا تاریخ نویسی محض عقیدت نگاری کا نام ہے؟ تبصرہ نگار کے نزدیک اسی تصوف نے مسلم معاشرے میں خرابیاں پیدا کی ہیں اور یہی وہ تصوف ہے جس کو نہ ماننے والا منکر تصوف کہا جاتا اور عوام میں اس کو بدنام کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

دسمبر ۱۹۸۰ء جنوری ۱۹۸۱ء

افکارِ رومی

"افکار رومی" مولانا محمد عبد السّلام خاں سابق پرنسپل مدرسہ عالیہ رام پور کی تازہ تصنیف ہے۔ مولانا نہ صرف رام پور میں بلکہ آس پاس کے علاقوں میں ممتاز علمی مقام رکھتے ہیں فلسفہ اور ادب ان کے گلشن علوم کے سب سے نمایاں خوش رنگ خوش بو پھول ہیں۔ ان کی عنایت ہے کہ اپنی تصنیف کا ذاتی نسخہ مجھے مطالعہ اور اس پر تبصرہ کے لیے عطا کیا ــــ یہ کتاب ان کے علم فلسفہ پر ایک شاہد ہے۔ یہ کتاب (جیسا کہ مالک رام نے تعارف میں لکھا ہے) مولانا کے دو لکچر ہیں جو انھوں نے خدا بخش لائبریری پٹنہ کی دعوت پر دیے تھے اور لائبریری کی اجازت سے کتابی شکل میں مکتبہ جامعہ، جامعہ نگر دہلی ۱۱۰۰۲۵ نے شائع کیا ہے اور اس کی قیمت چالیس روپیہ رکھی ہے جو زیادہ معلوم ہوتی ہے۔

فاضل مصنف نے چند سطروں کے پیش لفظ میں لکھا ہے:۔

"میں نے مثنوی کو سمجھنے میں شروح وحواشی کا سہارا نہیں لیا ہے یہ جو کچھ ہے مثنوی کا براہ راست مطالعہ ہے۔ مولانا کے افکار کو ان کی مثنوی سے سمجھنے کی یہ کوشش ابتدائی سہی لیکن غالباً پہلی ہے۔ اس لیے ممکن ہے کہ پڑھنے والوں کو کچھ نئی اور چونکا دینے والی باتیں مل جائیں۔"

یہ واقعہ ہے کہ بہت سی شرحیں ایسی ہوتی ہیں جن پر قرآن کو پاژند اور پاژند کو قرآن بنا دینے کی بات صادق آتی ہے۔ دور از کار اور غیر معقول تاویلات سے آپ جس کلام کو جو کچھ بنانا چاہتے ہوں بنا سکتے اور اس سے جو مقصد حاصل کرنا چاہتے ہوں کر سکتے ہیں۔ شکر ہے کہ مصنف نے مثنوی رومی کو سمجھنے میں اس طرح کی شرحوں کا سہارا نہیں لیا ہے۔ ہمارے صوفی شارحین نے دیوان حافظ اور مثنوی رومی پر اپنے کمالِ فن کا خوب مظاہرہ

کیا ہے۔ کفر کو ایمان اور ایمان کو کفر ثابت کر دکھانا ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ افکارِ رومی کو پیش کرنے میں فاضل مصنف نے جو نقطۂ نظر اختیار کیا ہے وہ یہ نہیں ہے کہ جو باتیں قابلِ اعتراض ہوں اور غلط ہوں ان کو حذف کر کے صرف وہ خیالات پیش کر دیئے جائیں جن پر عقلاً یا نقلاً کوئی اعتراض نہ ہوتا ہو بلکہ یہ صحیح نقطۂ نظر اختیار کیا ہے کہ جو کچھ مولانائے روم نے کہا اسے پیش کر دیا جائے۔ اس کتاب کی ترتیب اس طرح ہے کہ پہلے مالک رام صاحب کا تعارف ہے۔ پھر مصنف کا مقدمہ، اس کے بعد مختصر سوانح حیات، پھر مثنوی کا ایک اجمالی تعارف اور اس کے بعد مختلف عنوانات کے تحت مولانا روم کے افکار و خیالات پیش کیے گئے ہیں۔ عنوانات یہ ہیں:

الٰہیات، افعالِ باری، قضاء و قدر، سمعیات، مشاہدات و معارف، عنوانات سلوک و اسرار۔

اشعار کے اردو ترجمے نہیں دیئے گئے ہیں، بلکہ جس شعر یا جن اشعار سے جو بات نکل رہی ہو اس کو لکھ کر اس کے بعد شعر یا اشعار نقل کر دیئے گئے ہیں جنھیں پڑھ کر معلوم ہو جاتا ہے کہ اس شعر یا اشعار سے وہی بات نکل رہی ہے جو پہلے لکھ دی گئی ہے۔

صحیح معنے میں اس کتاب پر وہی شخص تبصرہ کر سکتا ہے جس نے خود مثنوی روم کا بالاستیعاب مطالعہ کیا ہو اس کے علاوہ اس نے شیخ اکبر ابن عربی کی فتوحات مکیہ اور فصوص الحکم بھی پڑھی ہو۔ افسوس ہے کہ میں نے نہ مثنوی کا بالاستیعاب مطالعہ کیا ہے اور نہ اب تک ابن عربی کی تصنیفات پڑھی ہیں۔ مثال کے طور پر فاضل مصنف نے تفصیل سے یہ ثابت کیا ہے کہ مولانا روم ابن عربی کے نظریہ وحدۃ الوجود کے قائل نہ تھے۔ یہ بات کہاں تک تسلی بخش ہے اس کے بارے میں وہ شخص اظہارِ خیال نہیں کر سکتا جس نے فتوحات و فصوص اور مثنوی کا مطالعہ نہ کیا ہو۔ میرے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے کہ خود اس کتاب میں جو کچھ لکھا گیا ہے اس پر اظہارِ خیال کروں۔

سوانح حیات میں شمس تبریز سے مولانا روم کے تعلقات کی تفصیل بھی دی گئی ہے۔ شمس تبریز ایک ایسا معمہ ہے جو آج تک حل نہیں ہو سکا ہے۔ اسی حصہ میں مولانائے

روم کے کچھ خیالات "مولانا کے بعض خلافیات" کے عنوان سے دیے گئے ہیں۔ اس کو پڑھ کر احساس ہوتا ہے کہ وہ گمراہ کن فلسفیانہ تصوف میں پوری طرح غرق ہو چکے تھے۔ اللہ تعالیٰ انہیں معاف فرمائے۔ "افکار رومی" کے فاضل مصنف نے حوالوں کے ساتھ لکھا ہے :

(۱) مولانا مذاہب و ملل کے اختلاف کو محض رستوں کا اختلاف مانتے تھے۔" گویا وہ وحدت ادیان کے قائل تھے۔ (نعوذ باللہ من ذالک) آگے صفحہ ۲۷۶ پر مولانا کے وہ اشعار نقل کیے گئے ہیں جن میں انھوں نے اپنے اس خیال کا اظہار کیا ہے۔ مثلاً :

کز ازاں سو جملہ ملت یکے است   صد ہزاراں سال و یک ساعت یکے است

اس کے علاوہ ان کے ملفوظات "فیہ ما فیہ" کے حوالے سے فاضل مصنف نے لکھا ہے :

"ایمان و کفر کا تفرقہ بھی رستوں تک ہے، منزل پر نہیں۔ سب بحثیں، جھگڑے، یہ رستہ غلط وہ رستہ صحیح۔ یہ حق پر وہ باطل پر ــــ جب منزل پر پہنچے تو معلوم ہوا کہ سب اختلافات رستے کے تھے اور بس منزل مقصود سب کی ایک تھی۔"

"فیہ ما فیہ" میرے سامنے نہیں ہے۔ اگر واقعی مولانائے روم کا خیال یہی تھا تو اس میں کوئی شبہ نہیں کہ وہ "وحدۃ الوجود" کے قائل تھے۔ کیوں کہ اس باطل نظریہ کو تسلیم کیے بغیر "وحدت ادیان" کا خیال پیدا ہی نہیں ہو سکتا۔"

(۲) مولانا کو دف و رباب اور رقص و وجد کے ساتھ سماع اور قوالی کی ضرورت پر اصرار تھا اور انکار کو ناشکری جانتے تھے۔

(۳) جسم کی قید سے رہائی اور محبوب سے وصال کی خوشی منانے کے لیے جنازے کے جلوس میں تاشے باجے کے ساتھ گانے بجانے کو مولانا مستحسن کہتے تھے۔ یہ فعل مولانا کی اولیات میں تھا اور ان کا اور ان کے خلفاء کا طریقہ تھا۔ لیکن علماء اس کو بدعت شنیعہ قرار دیتے تھے۔"

(۴) مریدوں، معتقدوں اور مخلصین کا سجدہ کرنا مولانا نہ صرف جائز بلکہ واجب سمجھتے تھے۔ (ص ۳۶)

یہ چیزیں بھی کسی شخص کو خواہ وہ مسلم معاشرے میں کتنا ہی مقدس سمجھا جاتا ہو، شریعت کی نگاہ میں بے وقعت کر دینے کے لیے کافی ہیں۔

"افکار رومی" کے فلسفی مصنف نے مثنوی رومی پر جو عام نظر ڈالی ہے اس میں لکھا ہے:-

"میرا مقصد مثنوی پر نقد کرنا نہیں اور نہ اس پر نقد کرنے کی میں اپنے آپ میں اہلیت پاتا ہوں تاہم یہ کہے بغیر بھی نہیں گزرا جاتا کہ مثنوی کی کچھ حکایتیں، بعض بعض مثالیں اور کہیں کہیں اظہار خیال کے اسلوب وہ کیسے ہی سبق آموز، کتنے ہی متعلق اور کسی بھی قدر حقیقت نما ہوں، اگر نہ ہوتے تو بہتر تھا۔ مثنوی جیسی مقدس کتاب میں جس کو "ہست قرآں در زبانِ پہلوی" کہا جاتا ہے اور بجا کہا جاتا ہے۔ یہ ذوقِ سلیم پر گراں گزرتے ہیں لیکن ہر عہد اور ہر اقلیم کا اپنا خاص مذاق اور ایک خاص مزاج ہے اس کی رعایت کیے بغیر کسی تعلیم کو مقبول عام بنانا دشوار ہوتا ہے۔" (ص ۴۰)

جس مثنوی میں باطل خیالات و نظریات پر مبنی سیکڑوں اشعار موجود ہوں اس کو "مقدس"، وہی شخص قرار دے سکتا ہے جو فلسفیانہ تصوف میں خود غرق ہو یا اس کا غالی حامی ہو اور مثنوی رومی کے بارے میں "ہست قرآں در زبان پہلوی" کہنا تو درحقیقت قرآن کی توہین ہے۔

آیات قرآنی کی جو تاویلات مثنوی میں پیش کی گئی ہیں اس کی ایک مثال یہ ہے کہ سورۃ الزمر کی آیت ۵۳ قُلْ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓي اَنْفُسِهِمْ کی تاویل یہ کی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے آخری نبی کو یہ حکم دیا ہے کہ تم لوگوں کو "اے میرے بندو" کہہ کر مخاطب کرو۔ یعنی مخاطبین سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بندے ہیں۔ شعر یہ ہے:

بندۂ خود خواند احمد در رشاد　　جملہ عالم را بخواں قُل یا عِباد

اس شعر پر یہ حاشیہ دیا گیا ہے: "یہ مولانا کا تفرد ہے۔ جمہور مفسرین کے نزدیک یہ خطاب باری تعالیٰ کی طرف سے ہے۔"

تعجب ہے کہ صریحاً ایک بالکل غلط تاویل کو "مولانا کا تفرد" قرار دیا گیا ہے۔ اگر یہ تفرد ہے تو اس نے پورے قرآن پر پانی پھیر دیا ہے۔ قرآن تو نازل ہی اس لیے ہوا ہے کہ جن لوگوں نے اپنے آپ کو کسی مخلوق کا بندہ بنایا یا سمجھ لیا ہے وہ اپنے حقیقی مالک کو پہچان لیں کیوں کہ تمام انسان، جن اور فرشتے صرف اللہ تعالیٰ کے بندے ہیں۔ یہاں سورہ آلِ عمران کی آیت ۷۹، کا مطالعہ کر لینا چاہیے۔ جس کا ترجمہ یہ ہے:

"کسی انسان کا کام یہ نہیں ہے کہ اللہ تو اس کو کتاب اور حکم اور نبوت عطا فرمائے اور وہ لوگوں سے کہے کہ اللہ کے بجائے تم میرے بندے بن جاؤ۔ وہ تو یہی کہے گا کہ سچے ربانی بنو جیسا کہ اس کتاب کی تعلیم کا تقاضا ہے جسے تم پڑھتے اور پڑھاتے ہو۔"

مثنوی رومی میں جو احادیث ہیں ان کے بارے میں مصنّف نے لکھا ہے:-

"مثنوی میں جو احادیث کی کافی تعداد ہے ان میں صحیح بخاری، صحیح مسلم، اور دونوں کی متفق علیہ مرویات بھی ہیں لیکن بہت کم۔ زیادہ حدیثیں اسی قسم کی ہیں جن کو حضرات صوفیاء اپنی کتابوں میں عموماً ذکر کرتے ہیں یہ روایتیں بیشتر محدثین کے معیار روایت پر پوری نہیں اترتیں۔ چنانچہ مثنوی میں جو احادیث لائی گئی ہیں ان کا بڑا حصہ روایت کے لحاظ سے یا موضوع ہے یا سخت ضعیف۔ بعض ایسے اقوال آنحضرتؐ کی طرف منسوب ہو گئے ہیں جن کو میرے علم میں کسی نے مرفوع حیثیت میں بیان نہیں کیا ہے۔ الرضا بالکفر کفر فقہی مفہوم ہے۔ مولانا نے مرفوع حدیث کی صورت میں ذکر کیا ہے۔" (ص ۵۴)

چند سطروں کے بعد لکھا ہے:-

"مولانا نے سیرت نبویؐ سے متعلق جو روایات ذکر کی ہیں ان میں بھی رطب و یابس کی تمیز نہیں ہے اور ان میں اکثر موضوع ہیں یا نہایت

ضعیف ۔

یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے اس لیے کہ فلسفیانہ تصوف اور اس کے گھڑے ہوئے عقائد کے لیے ضروری تھا کہ وہ موضوع اور نہایت ضعیف احادیث کا سہارا لے صوفیہ کی اس حرکت نے دین کو عظیم نقصان پہنچایا ہے ۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی مدح وثنا میں جو روش مولانائے روم نے اختیار کی ہے اسے دیکھ کر یہ خیال آتا ہے کہ شاید درج ذیل شعر :

وہی جو مستوی عرش تھا خدا ہو کر　　　اتر پڑا ہے مدینے میں مصطفےٰ ہو کر

مثنوی رومی ہی کو سامنے رکھ کر کہا گیا ہوگا ۔ یہی حال "اولیاء" کی تعریف وتوصیف کا ہے ۔ انبیاءؑ و اولیاء کو جس تفصیل سے ماورائے بشریت مثنوی رومی میں قرار دیا گیا ہے اس سے پہلے اتنی تفصیل شاید ہی کسی اور جگہ پائی جاتی ہو ۔ مسلمانوں میں جو "مخلوق پرستی" پھیلی اس کا ایک عنصر مثنوی رومی بھی ہے ۔

تبصرہ نگار کا تاثر

مثنوی مولانا روم کے بارے میں جو کچھ سنا اور پڑھا اس کی بنا پر اس حقیر تبصرہ نگار کا یہ خیال پہلے سے تھا اور اب اس کی تصدیق فاضل مصنف کی اس کتاب کے مطالعہ سے ہو گئی کہ مثنوی اصلاً علم التصوف کی منظوم کتاب ہے اور دیگر کتب تصوف کی طرح رطب ویابس کا مجموعہ ہے ۔ اس کے سیکڑوں اشعار صحیح خیالات اور کتاب و سنت کی تعلیمات پر مشتمل ہیں جن سے باطل کی تردید اور حق کی تائید ہوتی ہے اور سیکڑوں اشعار ایمان ویقین میں اضافہ کرتے ہیں لیکن ساتھ ہی ان اشعار کی تعداد بھی کم نہیں ہے جن میں بے بنیاد اور غلط خیالات کی تبلیغ کی گئی ہے ۔ مثنوی نے اگر ایک طرف عقل کی بالادستی پر ضرب لگائی ہے تو دوسری طرف غیر شرعی الہام وکشف کے جراثیم بھی پھیلائے ہیں ۔ معتزلہ عقل کی بالادستی کے قائل ہیں اور صوفیہ کشف والہام کی بالادستی کے وہ قرآن وحدیث کے ظواہر کی عقلی تاویلیں کر کے عقل ونقل میں تطبیق دینے کی کوشش کرتے

ہیں اور یہ ظواہر کی من مانی تاویلیں کر کے ان کو اپنے کشف والہام سے تطبیق دینے کی سعی کرتے ہیں، عملاً کتاب وسنت کی بالادستی کے نہ وہ لوگ قائل ہیں اور نہ یہ لوگ۔ اس لیے ان دونوں گروہوں میں کوئی بنیادی وجوہری فرق سمجھ میں نہیں آتا۔ آخر یہ کہاں کا انصاف ہے کہ جو لوگ مذاہب وملل کی تفریق کو محض رستے کا فرق قرار دیتے ہوں تاشے باجے کے ساتھ قوالی کو ضروری قرار دیتے ہوں یہاں تک کہ جنازے کے آگے تاشے باجے اور قوالی کو عقیدۃً وعملاً جائز کہتے ہوں، پیروں کے سامنے مریدوں کے سجدوں کو نہ صرف جائز بلکہ واجب قرار دیتے ہوں۔ انبیاء واولیاء کو ماورائے بشریت سمجھتے ہوں اور اقطاب وابدال کو کائنات کا مدبر قرار دیتے ہوں، ان کو "اولیاء اللہ" قرار دیا جائے۔ ہم نہیں جانتے کہ اللہ تعالیٰ قیامت میں ان کے ساتھ کیا معاملہ کرے گا لیکن ہم یقین کے ساتھ جانتے ہیں کہ یہ خیالات اسلامی تعلیم کے لحاظ سے باطل اور مردود ہیں۔

وحدۃ الوجود

فاضل مصنف نے لکھا ہے:

"شیخ اکبر مسلم صوفیہ میں پہلے بزرگ ہیں جنھوں نے وحدۃ الوجود کو واقعیت کی صورت میں پیش کیا اور روحانی ومادی پوری کائنات کی اس خیال کے تحت توجیہ کی۔"

اس عبارت کے نیچے مکتوبات امام ربانی، مکتوب اول، دفتر دوم کا حوالہ دیا گیا ہے یہ مکتوب، حقیر تبصرہ نگار کے سامنے ہے اس میں ابن عربی کے وحدۃ الوجود کی مختصر تاریخ کے بعد جو کچھ لکھا گیا ہے، وہ یہ ہے:۔

بالجملہ پیش از شیخ ہیچ یکے ازیں طائفہ بایں علوم واسرار زبان نکشادہ است وایں حدیث رابدیں نہج بیان ننمودہ۔ ہرچند سخنان توحید واتحاد درفلتات

مختصر یہ کہ شیخ سے پہلے اس طائفہ کے کسی شخص نے ان علوم واسرار کے بارے میں زبان نہیں کھولی ہے اور یہ بات اس نہج سے کسی نے بیان نہیں کی ہے۔ ہرچند

سکر از ایشاں بظہور آمدہ اند و انا الحق وسبحانی گفتہ اند۔ اما وجہ اتحاد را معلوم نہ ساختہ اند و منشار توحید را در نیافتہ پس شیخ برہان متقدمان ایں طائفہ آمدہ و حجت متاخرین ایشاں گفتہ۔

(مکتوب اول، دفتر دوم)

پہلے کے لوگوں کی زبان سے اوقات سکر میں توحید و اتحاد کی باتیں نکلی ہیں اور انھوں نے انا الحق اور سبحانی کہا ہے لیکن اتحاد کی وجہ انھوں نے معلوم نہیں کی ہے اور توحید کا منشار انہیں دریافت نہیں ہو سکا ہے پس شیخ، اس طائفہ کے متقدمین کی برہان اور متاخرین کی حجت بن گئے ہیں۔

اس عبارت سے بصراحت معلوم ہوتا ہے کہ ابن عربی کے وحدۃ الوجود کی جو توضیح مکتوب میں کی گئی ہے اس کو صاحب مکتوب نے انا الحق اور سبحانی، جیسے کلمات کی برہان اور حجت قرار دیا ہے۔ پہلے صوفیہ کی زبانوں سے توحید و اتحاد کی باتیں تو نکلیں لیکن وہ اس کا منشار اور اس کی وجہ معلوم نہیں کر سکے۔ ابن عربی نے اس توحید و اتحاد کا منشار واضح کر دیا ہے اسی لیے وہ وجودی صوفیہ کی برہان و حجت بن گئے ہیں خواہ وہ شیخ سے پہلے گزرے ہوں یا بعد کو آئے ہوں۔ یہ بات بھی فاضل مصنف کے علم میں ہوگی کہ شیخ احمد سرہندی رحمۃ اللہ علیہ نے دوسرے مکتوبات میں وحدۃ الوجود کو ایک پست مقام قرار دیا ہے اور لکھا ہے کہ میں بھی کچھ دنوں اس مقام پر فائز رہا ہوں اور پھر اس سے آگے بڑھ گیا ہوں۔ اسی مکتوب میں جس کا حوالہ فاضل مصنف نے دیا ہے لکھا گیا ہے کہ ابن عربی کے نزدیک ممکنات کا خارجی وجود محض وہمی وجود ہے اور جو چیز محض وہمی ہو اس میں "واقعیت" کیا ہوگی اور کتنی ہوگی؟ خود مصنف نے ابن عربی کے وحدۃ الوجود کی مختصر تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ابن عربی کی توجیہ محض ذہنی کرشمہ ہے اور جو چیز محض ذہنی کرشمہ ہو اس کا واقعیت سے کیا تعلق۔

اس تبصرے میں وحدۃ الوجود پر اظہار خیال مقصود نہیں لیکن اتنی بات عرض کر دینے کو جی چاہتا ہے کہ اس حقیر کے علم میں وحدۃ الوجود فنا اور بقا ہی کی ترقی یافتہ شکل ہے۔ فنا اور بقا ایک بیج ہے جس کو ابن عربی نے تناور درخت بنا دیا ہے۔

اشعری علم کلام

"افکار رومی" میں لکھا گیا ہے:

مولانا کا عہد اشعری کلام کے شباب کا زمانہ تھا امام رازی کی علمی جلالت، دنیوی وجاہت اور علماء، امراء اور عوام میں ان کے یکساں غیر معمولی اثر نے اشعری عقائد کو عوام و خواص دونوں میں مقبول بنا دیا تھا...... اس ماحول میں مولانا کی نشو و نما ہوئی ان ہی سر چشموں سے انھوں نے اپنی علمی پیاس بجھائی اور کمال حاصل کیا۔ چنانچہ اشعری کلام ان کی مذہبی فکر کا جزو لاینفک بن گیا۔ (ص ۶۱)

مولانا ابوالحسن علی ندوی نے تاریخ دعوت و عزیمت حصہ اول میں لکھا ہے کہ مولانا جلال الدین رومی کے عہد میں خود اشاعرہ میں عقلیت پرستی کی روح سرایت کر گئی تھی۔ سارا عالم ایک کلامی بحران میں مبتلا تھا۔ مولانا کی مثنوی علم کلام کی بے اعتدالیوں اور عقل کی "ہوس پرستی" کے خلاف ایک صدائے احتجاج بلکہ اعلان جنگ ہے اور ایک ایسے نئے علم کلام کی بنیاد جس کی بدلتے ہوئے عالم اسلام کو سخت ضرورت تھی۔ اس صورتِ حال میں مولانائے روم کو اشعری علم کلام کے نمائندے کی شکل میں پیش کرنا کہاں تک صحیح ہوگا؟ امام رازی جنھوں نے اپنے وقت میں اشعری علم کلام کا صور پھونکا تھا ان کی وقعت مولانا کے نزدیک یہ تھی۔

اندریں بحث ار خرد رہ بیں بدے　　　فخر رازی راز دار دیں بدے

(اس بحث میں اگر عقل راہ بیں ہوتی تو فخر رازی دین کے راز دار ہوتے)

یہی وہ دین ہے، فخر رازی جس کے راز دار نہ تھے اور یہی وہ دین ہے کہ جب تک یہ غالب ہے دین اسلام غالب نہیں آسکتا۔

سلوک و اسرار

اس عنوان کے تحت فاضل مصنف نے مولانائے روم کے تصوف و سلوک کو

مرتب کرنے کی قابل تحسین کوشش کی ہے جب کہ انھوں نے لکھا ہے مولانا کا سلوک پوری مثنوی میں پھیلا ہوا ہے) کہ منطق الطیر میں بیان کردہ وادیوں کو سامنے رکھ کر انھوں نے مولانا کے سلوک و اسرار کو ۱۲ وادیوں میں ترتیب دیا ہے۔ بلاشبہ اس میں ان کو خاصی محنت کرنی پڑی ہوگی ___ اگر کوئی شخص اجمالی طور پر مولانا کے تصوف کی بنیاد اور اس کے مقصد کو بیان کرنا چاہے تو کہہ سکتا ہے کہ ان کے سلوک کی بنیاد بھی دوسرے سلسلہ ہائے تصوف کی طرح عشق الٰہی اور اس کا مقصد خدا کی ذات میں گم ہوجانا ہے۔ مصنف نے "وادیٔ عشق" میں اشعار پیش کرکے عشق کی کچھ تفصیل دی ہے۔ انھوں نے اشعار کا مفہوم بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ :

"عشق کا ایک درجہ یہ ہے کہ اپنے عکس کے بجائے معشوق کا عکس دکھے۔ حور سامنے ہو تو حور کے بجائے محبوب نظر آئے۔ پھر اس درجے سے بھی گزر جاتا ہے اور اب عشق ہی عشق رہتا ہے اپنے سوا ہر شے کو کھا لیتا ہے۔ پوری کائنات چہ دنیا وچہ دین اس کی چونچ کا ایک دانہ ہے۔ اس کے بعد صرف محبوب رہتا ہے اور ہر شے فنا ہوجاتی ہے۔ جن کے سوا ہر معبود بلکہ ہر موجود محو ہوتا ہے۔ عاشق کی زندگی پردہ ہے، واقع میں معشوق ہی معشوق ہے۔ عاشق کی زندگی تو معشوق کی زندگی میں محو ہوگئی، معشوق بول رہا ہے معشوق کے بال و پر گرم پرواز ہیں ورنہ عاشق تو مرغ بے بال و پر ہے۔" (۳۱۰ - ۳۱۱)

جو لوگ وحدۃ الوجود کے قائل ہیں ان کے مسلک کا حاصل بھی اس کے سوا اور کیا ہے؟ وادیٔ فنا میں مصنف نے جو کچھ لکھا ہے اسے پڑھ کر احساس ہوتا ہے کہ اگر اصطلاحات و الفاظ سے قطع نظر کرلیا جائے تو مولانا کے سلوک کا حاصل بھی وہی ہے جو ابن عربی کے سلوک کا ہے۔

آخر میں یہ عرض کر دینا بھی مناسب ہے کہ "افکار رومی" سے وہی لوگ پوری طرح استفادہ کرسکتے ہیں جنھوں نے فلسفہ و کلام اور تصوف کی کتابوں کا سمجھ کر مطالعہ کیا ہو۔ ان علوم سے واقفیت نہ ہونے کی صورت میں اس سے بہت کم استفادہ کیا جاسکتا ہے۔

نومبر ۱۹۸۲ء

تاریخ تصوف

(قبل از اسلام)

مصنف جناب بشیر احمد ڈار، کاغذ، کتابت، طباعت اوسط صفحات ۲۲۲ مجلد مع گرد پوش، قیمت چار روپے ۲۵ پیسے۔ ناشر: ادارہ ثقافت اسلامیہ کلب روڈ لاہور

ایک تصوف تو وہ ہے جس کی تعبیر "احسان" سے کی جاتی ہے۔ اس تصوف سے نہ کسی عالم دین نے اختلاف کیا ہے اور نہ اس میں اختلاف کی گنجائش ہے۔ کیوں کہ "احسان" نہ صرف یہ کہ کتاب وسنت میں منصوص ہے بلکہ وہ عبادت واطاعت کی روح اور اس کا جوہر ہے اور ایک تصوف وہ ہے جو فلسفہ یونان کی روشنی میں باضابطہ ایک "فن" بن گیا ہے اس میں ذات وصفات کے فلسفیانہ مباحث ہیں۔ بیسیوں دقیق اصطلاحیں ہیں، مقامات ہیں، تنزلات ستہ ہیں۔ ابن عربی کا وحدۃ الوجود ہے اور منصور کا نعرہ انا الحق ہے۔ یہ تصوف، سیکڑوں برس سے علماء کے درمیان "مختلف فیہ" بنا ہوا ہے۔ تصوف کی اس قسم کو سمجھنے کے لیے زیر تبصرہ کتاب، ایک اچھا مقدمہ، عمدہ دیباچہ اور بہتر تعارف ہے اس سے فلسفیانہ تصوف کے اصل مآخذ کا پتہ چلتا ہے۔ اس کتاب میں یونانی تصوف، یہودی تصوف، عیسائی تصوف اور چینی تصوف کو بڑی قابلیت کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ اگر اس کتاب میں ہندو تصوف یا ویدانت کا بھی ایک باب ہوتا تو کتاب جامع ہو جاتی۔ فاضل مصنف نے کتاب بڑی محنت سے مرتب کی ہے اور اس موضوع سے دل چسپی رکھنے والے اہل علم کے مطالعہ کے لائق ہے۔ عام لوگ جو فلسفہ اور فلسفیانہ تصوف سے واقفیت نہیں رکھتے ان کے لیے اس کتاب سے فائدہ اٹھانا دشوار ہے۔

فاضل مصنف نے یونانی، یہودی، عیسائی اور چینی تصوف کے تنقیدی اور تاریخی

جائزے سے پہلے پندرہ صفحات کا ایک پیش لفظ بھی لکھا ہے اور اس میں تصوف اور مذہب کے فرق کو واضح کیا ہے۔ نیز یہ بات بھی واضح کی ہے کہ چند چیزوں میں اشتراک کے باوجود مسلمانوں کا تصوف دوسرے تصوفوں سے الگ بھی پہچانا جاتا ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ فلسفیانہ تصوف کو پسند کرنے والے صوفیہ کے نزدیک مابہ الاشتراک کو اصل کی حیثیت حاصل ہے اور مذہبی مابہ الامتیاز کو وہ ثانوی درجہ دیتے ہیں اور یہیں سے علماء کے درمیان اختلاف و نزاع کی بنیاد قائم ہوتی ہے۔

ایک جگہ مذہب اور تصوف کے باہمی تعلق کی وضاحت کے لیے لکھا گیا ہے:

"سوال یہ ہے کہ وہ کون سے حالات ہیں جن کے زیر اثر کسی مذہب اور خاص کر توحیدی مذاہب میں تصوف نمودار ہوتا ہے؟ اکثر تصوف کے متعلق یہ نظریہ پیش کیا جاتا ہے کہ ہر مذہب حقیقی معنوں میں تصوف ہے یا تصوف پر مبنی ہے۔ اگر تصوف سے مراد خدا سے بلا واسطہ تعلق کا احساس ہے تو ہر مذہب کی بنیاد اس احساس پر قائم ہے۔

جہاں خدا اور انسان کے درمیان جذبۂ اتحاد اور محبت موجود نہیں مذہب محض چند بے جان رسوم کا مجموعہ بن کر رہ جاتا ہے لیکن اس کے باوجود یہ بھی حقیقت ہے کہ ہم مذہب اور تصوف میں تمیز کرتے اور کر سکتے ہیں۔ حضرت ابراہیمؑ اور حضرت موسیٰؑ کی زندگی کے حالات بائبل اور قرآن میں تفصیل سے مذکور ہیں اور ان کے تجربات اور خدا سے تعلق کی نوعیت اس تعریف کے مطابق تصوف کے دائرے میں آتی ہے لیکن کوئی بھی انہیں صوفی نہیں کہتا۔ وجہ یہ ہے کہ صحیح مذہب انسان کے تمام داعیات کی تسکین کا سامان مہیا کرتا ہے اس میں جہاں عقل و دانش کے سرچشموں کو کبھی خشک نہیں ہونے دیا جاتا وہاں جذبات و عمل کے داعیات کی تسکین کا سامان بھی موجود ہوتا۔ اگر حضرت موسیٰؑ (اور حضرت ابراہیمؑ) کی زندگی میں جذبۂ محبت والفت، اس مادی دنیا کے تمام پردوں

کو یک قلم ہٹا کر اس کے جمال حیات آفریں کا متمنی نظر آتا ہے تو وہیں یہ حقیقت بھی عیاں ہے کہ ان کا فہم ذات خداوندی بھی اتنا ہی گہرا، ہمہ گیر اور واضح ہے جس میں ریب و شک کی کوئی گنجائش نہیں۔ پھر اس جذبۂ الفت اور فہم مستقیم کے ساتھ ساتھ ان کی زندگی سرتاپا عمل و حرکت نظر آتی ہے، گویا وہ داخلیت اور خارجیت دونوں کے علمبردار ہیں۔ مذہب کے مقابلے پر تصوف... کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ انسان کی صرف جذباتی اور داخلی زندگی کے پہلو پر اپنی توجہ مرکوز کرتا ہے اور اسی کو اجاگر کرنے کو اپنا نصب العین قرار دیتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ بلند پایہ صوفیہ میں اس داخلیت کے ساتھ فہم و دانش اور عمل و حرکت کے آثار بھی پائے جاتے ہیں لیکن یہ صرف مذہب کے اثرات کے باعث یا انسان کی زندگی کے عام تقاضوں کا نتیجہ ہے۔ تصوف صرف جذباتیت اور داخلیت کا ہی نام ہے۔ عام طور پر جب کہا جاتا ہے کہ فلاں مذہب میں تصوف کا کم یا زیادہ عنصر ہے تو درحقیقت یہ سوال ہی صحیح نہیں... ہر مذہب میں چونکہ زندگی کے جذباتی داعیات کی تسکین کا سامان موجود ہے اس لیے بظاہر نظر یہی آتا ہے کہ اس میں تصوف کے عناصر کارفرما ہیں۔ حقیقت اس کے برعکس ہے۔ کوئی مذہب تصوف سے متاثر نہیں چونکہ تصوف تاریخی طور پر بعد کی پیداوار ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ تصوف مذاہب کے جذباتی عناصر کو ایک علیحدہ اور منفرد شکل دینے کی کوشش کا نام ہے۔" (صفحہ ۴۰۳)

یہ اقتباس مصنف کے گہرے مطالعہ کی دلیل ہے۔ ان کے خیال سے اختلاف کیا جاسکتا ہے لیکن آسانی سے اسے رد نہیں کیا جاسکتا۔

جنوری ۱۹۶۴ء

معرفتِ الٰہیہ اوّل۔ دوم (کامل)

صفحات ۶۲۵۔ کاغذ، کتابت، طباعت بہتر۔ قیمت ۶۵ روپیہ۔ ناشر: مکتبۃ الفلاح۔ دیوبند۔ یوپی
اس کتاب کے نیچے یہ عبارت درج ہے:۔

"حضرت مولانا شاہ عبد الغنی پھول پوری خلیفہ ارشد حضرت حکیم الامت
مجدد ملت مولانا اشرف علی تھانوی رحمتہ اللہ علیہ"

یہ اس کتاب کا پانچواں ایڈیشن ہے جو پاکستان میں چھپا تھا اور اب ہندوستان میں شائع کیا گیا ہے۔ یہ کتاب جناب شاہ صاحب کے مرید اور خلیفہ مولانا حکیم محمد اختر صاحب نے مرتب کی ہے۔ ۱۴ صفحات میں مفصل فہرست مضامین لگی ہوئی ہے تین صفحات میں مقدمہ یا پیش لفظ ہے۔ اس کی تحریر میں شاہ صاحب کے دوسرے خلیفہ حضرت مولانا شاہ ابرار الحق دامت برکاتہم بھی شریک ہیں۔ اس کتاب میں ص ۲۱ سے ص ۹۰ تک مولانا شاہ عبد الغنی پھول پوری کے حالات زندگی اور اس سے متعلق دوسری تفصیلات ہیں۔ ص ۹۱ سے اصل کتاب شروع ہوتی ہے۔ یہ کتاب جیسا کہ مرتب کتاب نے لکھا ہے۔ شاہ صاحب کے ۱۶ سال کے مواعظ و نصائح و تقاریر کا مجموعہ ہے۔ یہ ضخیم مجموعہ پانچویں بار چھپا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتاب عوام میں خاصی مقبول ہے۔ اس کتاب کی بنیاد مولانا روم کی مثنوی پر رکھی گئی ہے اور مثنوی مولانا روم کی بنیاد عشق الٰہی پر استوار ہے جس طرح فلسفیانہ تصوف کی کتابیں رطب و یابس کا مجموعہ ہوتی ہیں اسی طرح یہ کتاب بھی ہے۔ تبصرہ نگار نے ضلع اعظم گڑھ کے متعدد اہل علم سے جناب شاہ عبد الغنی پھول پوری کا تذکرہ سن رکھا ہے اس لیے یہ کتاب اس نے شوق سے پڑھی۔ اس کتاب میں جس تصوف کی نمائندگی ہے اس کو "طریق زہد اور طریق عشق" کے ذیلی عنوانات کے تحت یوں واضح کیا گیا ہے:۔

"طریقِ زہد اور طریقِ عشق۔ یہ دو طریق وصول الی اللہ کے ہیں۔ طریقِ زہد میں بہت دیر لگتی ہے اور طریقِ عشق بہت جلد مقصود تک پہنچا دیتا ہے۔ ہمارے حضرت مرشد مولانا تھانوی رحؒ اس کو یوں سمجھایا کرتے تھے کہ ایک زمین ہے جس میں کھیتی کرنا ہے اور یہ زمین یوں تو غیر مزروعہ ہے لیکن خار دار درختوں سے پُر ہے۔ اب اس زمین کو قابلِ کاشت بنانے کی دو صورتیں ہیں۔ ایک تو یہ کہ ایک ایک خار دار درخت کو کاٹ کاٹ کر باہر پھینک دیا اور اسی طرح کرتے کرتے عرصہ دراز کے بعد یہ زمین ایک نہ ایک دن صاف ہو کر قابلِ کاشت ہو جاوے گی۔ دوسری صورت یہ ہے کہ تمام درختوں پر مٹی کا تیل چھڑک کر آگ لگا دیں اور سب جل کر راکھ کا ڈھیر ہو جائیں۔

عشق آں شعلہ است کو چوں بر فروخت ہر چہ جز معشوق باقی جملہ سوخت

(یعنی عشق وہ شعلہ ہے کہ جب روشن ہو جاتا ہے تو معشوق کے علاوہ تمام غیر ضروری تعلقات کو سوختہ کر دیتا ہے۔) ـــــ بس یہی دوسرا طریقہ طریقِ عشق ہے اور پہلا طریقہ، طریقِ زہد ہے۔ قلب میں جس قدر اخلاقِ رذیلہ اور علائقِ فانیہ اپنی جڑ پکڑے ہوئے ہیں ان کو ایک ایک کر کے الگ کرنے میں ایک عمر چاہیے اور اس زمانے میں یونہی اوسطاً لوگوں کی عمر زیادہ سے زیادہ صرف ساٹھ یا ستر سال ہوتی ہے اور اللہ کی محبت کی آگ تمام غیر حق کے تعلقات کو سوختہ کر دیتی ہے۔ اسی کو ایک بزرگ فرماتے ہیں:

صنما رہِ قلندر سزادار بمن نمائی کہ دراز و دور دیدم رہ و رسمِ پارسائی

صنم سے مراد شیخِ کامل ہے۔ یعنی اے محبوب شیخ اگر میرے لیے آپ مناسب سمجھیں تو طریقِ عشق سے میرا راستہ قطع کرا دیجیے کیونکہ طریقِ زہد کا راستہ بہت لمبا ہے۔"

(ص ۱۶۳-۱۶۴)

یہ لمبی عبارت میں نے اس لیے نقل کی ہے کہ اس تصوف کی پوری نمائندگی ہوجائے جو اس کتاب میں پیش کیا گیا ہے۔ اس عبارت کا تجزیہ اور اس کی تحلیل مقصود نہیں ہے۔ البتہ اس کتاب سے یہ ضرور معلوم ہوا کہ مولانا اشرف علی تھانوی رحمتہ اللہ علیہ کا تصوف بھی طریقِ عشق ہی پر مبنی ہے۔ یہ حقیر اپنے مطالعۂ تصوف کے پیشِ نظر یہ خیال رکھتا ہے کہ صوفیہ نے قرآنی محبت کو فلسفیانہ عشق کا ہم معنے قرار دے کر اتنی بڑی غلطی کی ہے کہ اس نے اسلامی تصوف کو غیر اسلامی بنا کر رکھ دیا ہے۔ کیوں کہ تصورِ عشق نے ذاتِ الٰہی کو اپنی منزلِ مقصود قرار دے لیا جس میں جاکر گم ہوجانا ہی حاصلِ زندگی ہے۔ تبصرہ نگار کے نزدیک جن کتابوں نے مسلمانوں کو فلسفیانہ تصوف کے جال میں پھنسائے رکھا ان میں مثنوی رومی کو ایک اونچا مقام حاصل ہے۔ اس تصوف کے لیے تضاد بیانی لازم ہے جب شریعت یاد آجاتی ہے تو اس کے مطابق باتیں ہونے لگتی ہیں اور جب "حقیقت" کا زور ہوتا ہے تو شریعت گم ہوجاتی ہے۔ شریعت یاد آئی تو شاہ صاحب نے فرمایا:

"تفکر فی اللہ سے ممانعت اور تفکر فی المخلوقات کا حکم اسی سبب سے سیدنا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کی ذات میں غور و فکر سے منع فرمایا ہے۔ (کیوں کہ عقل محدود میں غیر محدود ذات کا ادراک محال ہے) اور فرمایا: تفکروا فی آلاء اللہ۔ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں میں فکر کیا کرو۔ اللہ تعالیٰ کو پہچاننے کے لیے تمام نشانیاں زمین میں موجود ہیں۔ انہیں نشانیوں سے اللہ تعالیٰ کو پہچاننا چاہیے۔" (ص ۱۱۰)

اور جب حقیقت کا غلبہ ہوا تو فارسی اشعار کی تشریح کرتے ہوئے لکھا:

"حضرت سعدیؒ فرماتے ہیں کہ اللہ کے مقربین بندے محبوب حقیقی کے عشق میں اپنی جان سے بھی بے پروا ہیں اور محبوب حقیقی کی یاد میں سارے جہاں سے بے خبر ہیں۔ یادِ حق میں خلق سے بھاگے ہوئے ہیں اور اس منعم حقیقی پر ایسے متوالے ہوگئے ہیں کہ نعمتوں کی طرف سے التفات جاتا رہا۔ صرف ذاتِ منعم پر ٹکٹکی باندھے ہوئے ہیں یعنی ان کی

وہ محبت جو پہلے بواسطہ امید و حرص سے تھی اب وفور طلب وشوق سے
یہ حجاب واسطہ بھی اٹھ گیا۔ اب غلبۂ محبت میں بجز ذات ساقی کے کچھ
مطلوب نہ رہا اور قرب کے اس رفیع مقام پر بواسطہ مے میں بوئے شرک
محسوس کر کے جام مے کو زمین پر لڑھکا دیا۔" (ص ۱۳۸)

یہاں صرف یہ دیکھیے کہ حسب ارشاد نبویؐ ذاتِ الٰہی میں تفکر اس لیے ممنوع تھا کہ اس کی ذات انسانی عقل وادراک سے بھی ماورا ہے اور اب اس عبارت میں ذاتِ الٰہی مطلوب ہے اور اس کے متوالے صرف ذاتِ منعم پر ٹکٹکی باندھے ہوئے ہیں۔ ذاتِ الٰہی پر پڑے ہوئے تمام حجابات اٹھ گئے ہیں۔ اس عبارت کو پوری طرح وہی سمجھ سکتا ہے جس نے فلسفیانہ تصوف کا مطالعہ کیا ہو۔ سنت نبوی کی پیروی کی تلقین اور اچھی اچھی باتیں اس کتاب میں بھی ہیں۔ یہ دیکھ کر افسوس ہوا کہ اس کتاب میں بھی موضوع احادیث سے احتراز نہیں کیا گیا ہے۔ مثلاً حضور صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں:

لِی مع اللّٰہِ وقت لا یسعنی فیہ ملک مقرب ولا نبی مرسل۔ (ص ۴۳)	میرے لیے اللہ کے ساتھ ایک ایسا وقت بھی ہے جس میں نہ کسی مقرب فرشتے کا گزر ہے نہ کسی نبی مرسل کا۔

یہ ایک موضوع حدیث ہے جو درایۃً بھی نادرست ہے۔ اس میں غلط انتسابات بھی ہیں۔ اس طرح بسم اللہ ہی غلط ہو گئی ہے۔ اصل کتاب کے پہلے صفحہ پر وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنَ ۝ کے بارے میں لکھا ہے:

"حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے لیعبدون کی تفسیر لیعرفون سے فرمائی ہے اور صاحب جلالین نے اپنی تفسیر میں اسی کو لیا ہے۔ (ص ۹۱)

صاحب جلالین کی طرف یہ انتساب غلط ہے۔ میرے پاس تفسیر جلالین مطبوعہ ہند بھی ہے اور مطبوعہ عرب بھی حضرت ابن عباسؓ کی طرف بھی یہ انتساب صحیح نہیں ہے تاریخی واقعہ کو حدیث قرار دیا گیا ہے۔

"حدیث شریف میں آیا ہے کہ ہر صحابی اپنی پیاس پر اپنے بھائی کی پیاس کو

ترجیح دینا رہا حتیٰ کہ سب کے سب شہید ہو گئے اور پانی پیالہ میں باقی رہ گیا۔ یہ موقع جنگ کا واقعہ ہے۔" (ص ۱۸۸) ایسی کوئی حدیث شریف نہیں ہے۔

مولانا تھانوی کی طرف ایک انتساب۔

"حضرت مرشدی نے فرمایا تھا کہ اُمتا معنے میں عشقنا کے ہے۔ (ص ۲۴۵)

اگر مولانا تھانوی کی طرف یہ انتساب صحیح ہے تو یہ تاویل نہیں بلکہ تحریف ہے۔ مثنوی مولانا روم میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملا کر آپ کو ماورائے بشریت قرار دیا گیا ہے۔ قرآن میں یہ جو کہا گیا ہے۔ قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ (کہہ دیجئے کہ میں تمہاری طرح بشر ہوں) مثلیت کی تشریح اس کتاب میں پڑھیئے۔

"یہ مثلیت ایسی ہے کہ ایک گلاس سڑی مٹی کا بنا ہوا اور ایک گلاس چاندی کا بنا ہوا اور اسی سانچہ کا ایک گلاس تمام انمول جواہرات کو گلا کر ڈھال دیا گیا ہو تو وہ سڑی مٹی کا گلاس اگر یہ کہے کہ یہ جواہرات سے ڈھلا ہوا گلاس بھی ہماری طرح ایک گلاس ہے تو انتہائی بے وقوفی کی بات ہوگی۔ سڑی مٹی والا گلاس ذرا اپنے دام بازار میں لگوالے اور پھر انمول جواہرات والے گلاس کے دام لگوالے۔ اس کو تو دو پیسے ملیں گے اور اس گلاس کی قیمت سلطان وقت بھی نہیں دے سکتا۔

گر بصورت آدمی انسان بدے ؛ احمد و بوجہل ہم یکساں بدے (ص ۳۰۸-۳۰۹)

یہ ہے دیوبندی تصوف جو بریلوی تصوف کو آنکھیں دکھاتا ہے۔ بہر حال یہ کتاب فلسفیانہ تصوف کا ذوق رکھنے والوں کے لیے قابل مطالعہ ہے۔

ترجمہ انفاس العارفین

مصنف: حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ۔ مترجم: سید محمد فاروق القادری ایم اے۔ صفحات ۴۲۵ کتابت، طباعت، کاغذ بہتر۔ قیمت: ۴۸/- روپیہ۔ ناشر: مکتبہ الفلاح۔ دیوبند۔ یوپی

دیوبند جو دینی کتابوں کے کتب خانوں کا مرکز ہے وہاں ایک نیا مکتبہ "الفلاح" اچھے خاصے سرمایہ سے قائم ہوا ہے اور اس نے متعدد ضخیم کتابیں شائع کی ہیں۔ زیر تبصرہ کتاب ان کتابوں میں سے ایک ہے۔ انفاس العارفین فارسی زبان میں لکھی گئی ہے اور میں نے یہ کتاب اس وقت پڑھی تھی جب میں مدرسہ شمس الہدیٰ پٹنہ کے درجۂ فاضل میں تعلیم حاصل کر رہا تھا۔ یہ حقیر چونکہ ایک عالم اور صوفی خاندان میں پیدا ہوا ہے اس لیے نوجوانی ہی سے کتب تصوف کے مطالعہ کا شوق رکھتا ہے۔ اب دوسری بار بڑھاپے میں اس کا ترجمہ پڑھنے کا موقع ملا ہے۔ اس کتاب کے شروع میں چھ صفحات کی فہرست مضامین ہے اور کتاب کے اخیر میں ۸ صفحات کا اشاریہ ہے۔ جناب مترجم نے تقریباً ۳۲ صفحات پر مشتمل ایک مقدمہ بھی تحریر کیا ہے، اس میں انفاس العارفین کا مفصل تعارف ہے۔ اس مقدمہ کی خاص بات یہ ہے کہ اس میں بہت زور دے کر یہ لکھا گیا ہے کہ شاہ ولی اللہؒ کے مسلک تصوف کو جان بوجھ کر لوگوں نے چھپانے کی کوشش کی ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کا اور ان کے خاندان کا مسلک تصوف، دوسرے مسالک تصوف سے مختلف نہیں ہے۔ مترجم کی اس بات کو ہر وہ شخص صحیح قرار دے گا جس نے انفاس العارفین اور تصوف پر شاہ صاحب کی دوسری کتابیں پڑھی ہیں اور جس نے سنی سنائی باتوں اور ایک طرفہ سوانح نگاری پر اعتماد نہیں کر لیا ہے۔

مترجم نے مقدمہ میں لکھا ہے کہ انفاس العارفین سات مختلف رسائل کا مجموعہ ہے پہلا رسالہ بوارق الولایۃ شاہ صاحب کے والد گرامی قدر شاہ عبدالرحیمؒ کے حالات

میں ہے۔ دوسرا شوارق المعرفۃ ان کے عم بزرگوار شیخ ابوالرضا محمد کے حالات میں تیسرا الامداد فی مآثر الاجداد خاندانی بزرگوں کے حالات میں، چوتھا علیۃ الصمدیۃ فی انفاس المحمدیۃ شیخ محمد پھلتی کے حالات میں۔ پانچواں النبذۃ الابریزیۃ، جداعلیٰ مولانا شاہ عبدالعزیز دہلوی کے بارے میں، چھٹا مشائخ حرمین کے بارے میں اور ساتواں اپنے بارے میں۔ جناب مترجم نے لکھا ہے:

"بظاہر تو اس کتاب کی حیثیت ایک تذکرے کی ہے لیکن درحقیقت یہ کتاب علم شریعت و معرفت کا خزینہ اور حکمت و دانش کا ایسا گنجینہ ہے کہ جس میں تاریخ، فقہ، تصوف، کلام، اور عقائد کے سیکڑوں مسائل باتوں ہی باتوں میں حل کر دیئے گئے ہیں۔ ہمارے نزدیک اس کتاب کو بجا طور پر خاندان ولی اللہی کے فکر تصوف کا صحیح ترجمان کہا جا سکتا ہے اور یہ کتاب بقول مولانا عبیداللہ سندھی شاہ ولی اللہ کے فلسفہ اور تصوف کی روح ہے۔" (ص ۶)

اس کتاب کے بارے میں مترجم نے جو رائے دی ہے اس میں مبالغہ تو ہے لیکن غلط نہیں ہے۔ "حیات ولی" مصنفہ مولوی رحیم بخش دہلوی سے شاہ عبدالرحیم رح کے بارے میں یہ عبارت نقل کی گئی ہے۔

"ہندوستان میں جس معزز اور بزرگوار نے سب سے پیشتر حدیث کے درس و تدریس کی بنیاد ڈالی اور جس مشہور محدث نے اس غریب علم کے شائع کرنے اور پھیلانے میں کوشش بلیغ کی وہ شیخ عبدالرحیم صاحب رح تھے۔" (حیات ولی ۱۶۱)

مولوی رحیم بخش دہلی کے تھے اور پڑھے لکھے آدمی تھے۔ اس لیے توقع نہیں کی جا سکتی کہ وہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی اور ان کے خاندان سے ناواقف ہوں۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی ۱۰۰۰ھ میں حجاز سے واپس آئے اور آخر دم تک حدیث کے درس و تدریس اور تصنیف و تالیف میں مشغول رہے۔ ان کا انتقال ۱۰۵۲ھ میں ہوا ہے اور

شاہ عبدالرحیم صاحب کی وفات ۱۱۳۱ھ میں ہوئی ہے۔ کسی پڑھے لکھے آدمی کی طرف سے اتنے بڑے تاریخی جھوٹ کی توقع مشکل ہی سے کی جاسکتی تھی لیکن "تعصب" وہ بلائے بد ہے جو انسان کی بصیرت کو اندھا کر دیتا ہے۔ مترجم نے لکھا ہے:

"شاہ عبدالرحیم سلسلۂ نقشبندیہ سے تعلق خاطر کے باوجود صوفیاء کے مشہور اجماعی مسئلے وحدۃ الوجود کے قائل تھے، اس کے مبلغ اور شیخ ابن عربی کے بے حد معتقد تھے۔" (ص ۹)

خود خواجہ باقی باللہ وحدۃ الوجود کے قائل تھے۔ مترجم نے لکھا ہے:

"واضح رہے کہ حضرت خواجہ باقی باللہ نظریہ وحدۃ الوجود کے بہت بڑے امام تھے۔ شاہ عبدالرحیم فرمایا کرتے تھے کہ "اگر میں چاہوں تو منبر پر بیٹھ کر "فصوص" کے ایک ایک مسئلہ کو قرآن مجید اور احادیث نبوی سے دلائل کے ساتھ بیان کر سکتا ہوں۔ (ص ۱۰)

بعض بزرگوں نے تو یہ بھی دعویٰ کیا تھا کہ اگر وہ چاہیں تو ہدایہ کو جو فقہ کی کتاب ہے تصوف کی کتاب کے طور پر بیان کر سکتے ہیں اور جہاں تک قرآن کریم کا تعلق ہے تو صوفیاء نے اس کو فصوص الحکم اور فتوحات مکیہ بنا کر چھوڑا ہے۔

اصل کتاب کی جن چیزوں پر اس حقیر نے نشان لگائے ہیں اگر ان سب کو عبارتوں کے ساتھ پیش کرے تو تبصرہ بہت طویل ہو جائے گا۔ اجمالی طور پر کچھ عرض کروں گا، اور چند چیزیں عبارتوں کے ساتھ پیش کروں گا۔ جس تصوف کی بنیاد وحدۃ الوجود اور عشق الٰہی کے فلسفیانہ نظریے پر ہو وہ اپنی اصل کے لحاظ سے یکساں ہوگا خواہ سلسلوں اور خانوادوں کی تعداد کتنی ہی کیوں نہ ہو، ان میں اختلافات محض جزوی ہوں گے۔ غیر اسلامی نظریات کو ثابت کرنے کے لیے آیات قرآن کی من مانی تاویل، بے حد ضعیف، اور موضوع احادیث سے استدلال الہام اور کشف و کرامات، عجیب و غریب واقعات تصوف کی کتابوں میں مشترک ہیں۔ اسی طرح تضاد بیانی بھی مشترک ہے۔ خواہ لکھنے والے کسی سلسلے سے تعلق رکھتے ہوں۔ یہ تمام باتیں اس کتاب میں بھی موجود ہیں اور جہاں

تک کشف وکرامات اور عجیب واقعات کا تعلق ہے۔ یہ کتاب اس کا خزانہ ہے۔ غیر اللہ کو سجدے، اللہ کا مشاہدہ بلکہ اس سے جسمانی اتصال، قبولیت، عرس، قوالی، ختم خواجگان، جنت کی بشارت، اپنی بات منوانے کے لیے خدا کے سامنے مچل جانا اور اپنی بات منوالینا، بلکہ خدا کے فیصلے کو بدلوا ڈالنا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا مجلسوں میں تشریف لانا، خدا تک پہنچ جانے کے بعد عبادات کی ضرورت باقی نہ رہنا اور اسی طرح کی تمام چیزیں اس کتاب میں بھی موجود ہیں۔ بات یہ ہے کہ انسان جب خدا بن جائے تو کیا چیز ممکن نہیں۔ اس کتاب میں یہ بھی موجود ہے کہ بزرگوں کی قبروں سے سب کچھ حاصل ہو جاتا ہے۔ جو لوگ اس تصوف کے قائل ہیں اور بزرگوں کی قبروں پر جو کچھ ہو رہا ہے اس کا رونا روتے ہیں۔ ان کے آنسو مگر مچھ کے آنسو ہیں۔ اب میں چند عبارتیں پیش کرتا ہوں۔

"صوفیا اور رویت باری" کے ذیلی عنوان کے تحت لکھا گیا ہے :۔

"والد ماجد فرمایا کرتے تھے کہ بعض درویشوں کے بارے میں مجھے تردد تھا کہ حضرت حق تعالیٰ کی بارگاہ میں وہ کیا مرتبہ رکھتے ہیں۔ چنانچہ میں نے چشم مشاہدے سے ایک تجلی دیکھی۔ گویا حضرت حق حسین صورت میں متمثل ہو کر برقع پوش ہیں۔ میرے اور حق کے درمیان کچھ فاصلہ ہے۔ جب اس کا جمال پاک مجھ پر ظاہر ہوا تو دل ہاتھ سے چلا اور مجھے اس سے بھی زیادہ قرب کی خواہش پیدا ہوئی۔ وہ میری اس تمنا پر مطلع ہو کر قدرے اور نزدیک ہوا۔ اس پر آتش شوق بھڑک اٹھی اور خواہش قرب میں اور اضافہ ہوا اس پر مطلع ہو کر وہ اور نزدیک ہو گیا۔ اس مرحلے پر میں برقع کی موجودگی سے تنگ آگیا اور اس کو ہٹانے کی آرزو کی۔ فرمایا برقع تو بہت باریک ہے جو حسن مستور کو اور نمایاں کر رہا ہے۔ عرض کی پھر بھی حجاب تو ہے۔ بالآخر نقاب اٹھا دی اور پھر فرمایا کہ بعض سالکوں کو پہلا مرتبہ حاصل ہے۔ خاص سالکین کو دوسرا مرتبہ اور اخص الخواص کو مرتبہ ثالث میسر ہے اور فلاں فلاں ان تینوں میں سے کوئی مرتبہ نہیں رکھتے۔" (ص ۹۴)

مرتبہ ثالث پر بھی وہ نہیں ٹھیرے۔ اب جسمانی اتصال کا حال پڑھیے۔ "بے صورت اندر صورت آمد" کے ذیلی عنوان کے تحت لکھا گیا ہے:۔

"والد ماجد فرمایا کرتے تھے کہ ایک مرتبہ میں انتہائی گھٹن محسوس کر رہا تھا کہ دفعتہً مجھ پر ایک تجلی وارد ہوئی۔ میں نے دیکھا کہ ایک حسین و جمیل عورت زیورات اور جاذب نظر لباس سے مزین ہے۔ وہ آہستہ آہستہ میرے قریب آنے لگی اور اس کے قرب سے میرا شعلۂ شوق بھڑکنے لگا۔ بالآخر وہ مجھ سے بغل گیر ہو کر یک تن ہو گئی۔ میرا وجود اسی کی شکل میں متمثل ہو گیا اور وہ تمام زیورات اور لباس میں نے اپنے وجود میں موجود پائے۔ یہ دیکھ کر مجھے انتہائی انبساط و سرور حاصل ہوا اور گھٹن جاتی رہی۔

راقم الحروف کہتا ہے کہ یہ واقعہ بھی مقام توحید کے حصول پر دلالت کرتا ہے اور گزشتہ واقعہ کی ہی ایک شاخ ہے۔" (ص ۹۴-۹۵)

اللہ میاں پہلے مرد کی شکل میں متمثل ہوئے تھے اور اتصال جسمانی کے وقت عورت کی شکل میں۔ سُبْحَانَ اللّٰهِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ٥ میں نے ایک ایسے صوفی کی کتاب میں جو زیادہ سند کا درجہ نہیں رکھتے، یہ پڑھا تھا کہ فلاسفۂ یونان تصوف میں ان کے استاذ ہیں لیکن اب سکہ بند صوفیہ کے کلام سے اس کی تصدیق و تائید مل گئی۔ اس کتاب میں "علام صوفیاء" کے ذیلی عنوان سے لکھا گیا ہے:۔

"فرمایا صاحب تحقیق متکلمین (فلاسفہ) حقیقت ممکن اور حقیقت واجب کے درمیان تباین سے ایک ایسا معنے مراد لیتے ہیں جسے قبول کر لینے سے صوفیہ کی تحقیقات پر کوئی زد نہیں پڑتی اور اگر اس پر خوب غور کیا جائے تو صوفیائے کرام اور فلاسفہ کے درمیان بہت ہی معمولی اختلاف ہے۔ فلاسفہ قدیم کے کلام کو حقائق پر محمول کرنا ممکن العمل ہے ——

کاتب الحروف (شاہ ولی اللہ) کے نزدیک صوفیاء کے علوم جمع و فرق کی باریکیوں پر مشتمل ہیں اور متکلمین فلاسفہ کے علوم کا موضوع محض فرق پر

اکتفا کرتا ہے اور اس باریک فرق کو ہم اختلاف کا نام نہیں دے سکتے بلکہ یوں کہہ سکتے ہیں کہ ایک طبقہ نے صرف چند چیزوں پر اکتفا کر لیا ہے اور بعض سے صرف نظر کیا۔" (ص ۲۱۱)

صرف ایک اور عبارت پیش کر کے اس تبصرے کو ختم کرتا ہوں :-

"فرمایا کہ اصحاب شہود کو عبادت کی تکلیف و ریاضت کی ضرورت نہیں ہوتی لیکن اللہ تعالیٰ ان پر عبودیت قائم رکھتا ہے۔" (ص ۲۹۴)

اس تصوف کے قائل اور اس پر عامل لوگوں کے لیے یہ کتاب لائق مطالعہ و استفادہ ہے۔

نومبر ۱۹۸۵ء

مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ

محمد ایوب قادری ایم اے۔ صفحات ۳۰۴۔ کتابت و طباعت و کاغذ اوسط، مجلد مع گرد پوش۔ قیمت: سات روپے
غیر مجلد قیمت چھ روپے۔ ناشر: ادارہ تحقیق و تصنیف ۱۴۱؍ حیدرآباد۔ کراچی

جناب محمد ایوب قادری ایم اے متعدد کتابوں کے مصنف اور اہل علم کے درمیان معروف شخصیت ہیں۔ ادارہ تحقیق و تصنیف کے نام سے ایک نیا ادارہ قائم ہوا ہے۔ ایوب صاحب اس کے معتمد ہیں اور ادارہ نے یہ پہلی کتاب شائع کی ہے۔ ادھر ایک عرصہ سے، پاک و ہند ہر جگہ جدید تعلیم یافتہ اصحاب علم کی توجہ، صوفیہ کرام کی تاریخ مرتب کرنے کی طرف مبذول ہوگئی ہے۔ یہ بڑی خوشی کی بات ہے اور اس کی بہت ضرورت تھی۔ صوفیہ حق نے تعمیر سیرت و کردار اور اشاعت اسلام کی جو خدمات انجام دی ہیں وہ فراموش کرنے کے لائق نہیں ہیں، بلکہ ضرورت ہے کہ تحقیق و تنقید کے ساتھ ان کے سوانح حیات اور ان کی تعلیمات شائع کی جائیں۔ حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشت رحمتہ اللہ علیہ ایک مشہور و معروف صاحب سلسلہ بزرگ ہیں۔ فاضل مؤلف نے تحقیق و تنقید کے ساتھ ان پر یہ کتاب مرتب کر کے مفید خدمت انجام دی ہے۔ اس کی قدر کرنی چاہیئے۔ کتاب آٹھ ابواب پر منقسم ہے اور جدید انداز میں مرتب کی گئی ہے آخر میں اشخاص، مقامات اور کتابوں کے مفصل اشاریے بھی دیے گئے ہیں۔

پہلے باب میں برِ پاکستان میں اسلام کے داخلے سے لے کر حضرت مخدوم کے عہد تک ایک اجمالی تاریخی تبصرے کی وجہ سے کتاب کی افادیت میں اضافہ ہوگیا ہے۔ اس کتاب کی تیاری میں فاضل مصنف نے جو محنت برداشت کی ہے اس کا اندازہ اس سے کیجیے کہ انھوں نے اس کے لیے تقریباً پونے دو سو کتابیں اور رسالے پڑھے ہیں اور

کتابوں کے مطالعہ کے لیے لمبے سفر بھی اختیار کیے ہیں۔ حضرت مخدوم کے نام سے جو سفر نامہ منسوب ہے اسے جعلی قرار دیا ہے اور "قدم شریف" کے نام سے جو پتھر رام پور یوپی اور دیگر مقامات پر پائے جاتے ہیں انہیں بھی وضعی قرار دیا ہے۔ غالی اور نادان عقیدت مندوں کو یہ بات بری لگے گی لیکن کسی کی ناگواری کی وجہ سے سچی بات کو چھپانا صحیح نہیں ہے۔ فاضل مؤلف نے جرأت کے ساتھ سچی بات لکھ دی ہے۔

صوفیہ کرام کی تعلیمات، ملفوظات و افعال اور ان کے معمولات میں جو چیزیں کتاب و سنت سے متصادم نہیں ہیں وہ بہت ہی مؤثر اور پُرسوز ہیں اور انہیں پڑھ کر دل متاثر ہوتا ہے۔ اس کتاب میں بھی ایسی بہت سی چیزیں موجود ہیں ـــــ لیکن کتاب میں ایسی چیزیں بھی موجود ہیں جن سے طبیعت میں کھٹک پیدا ہوتی ہے ان کی طرف اگر اشارہ نہ کیا جائے تو یہ بات دیانت تنقید و تبصرہ کے خلاف ہوگی۔ حضرت مخدوم کے ملفوظات میں سب سے زیادہ جو چیز کھٹکتی ہے وہ احادیث رسولؐ کا حصہ ہے۔ ایک طرف حدیث میں ان کی وسعت نظر اور مہارت کا حال ہم پڑھتے ہیں اور دوسری طرف ان کے ملفوظات میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب اقوال پڑھتے ہیں تو دونوں میں تطبیق مشکل ہو جاتی ہے۔ میں یہاں چند کی طرف اشارہ کر رہا ہوں۔

صفحہ ۱۸۵ میں لکھا ہے: "اسی لیے حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں اور ابوبکر دو گھوڑوں کے مشابہ ہیں کہ وہ دوڑیں۔ اگر وہ آگے بڑھ جاتے تو میں ان پر ایمان لاتا لیکن میں آگے بڑھ گیا۔ پس وہ مجھ پر ایمان لائے۔" نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب یہ قول پڑھ کر میں لرز اٹھا۔ اس قول سے جو بات نکلتی ہے، مجھ میں ہمت نہیں ہے کہ میں اس کا ذکر کروں لیکن یہ یقین کے ساتھ جانتا ہوں کہ یہ قول ہرگز نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا قول نہیں ہو سکتا۔ ص۱۵۹ پر من لبس لہ شیخ فشیخہ الشیطان کے بارے میں حضرت مخدوم کا یہ فرمانا کہ یہ حدیث صحاح کی ہے۔ ان کے علم حدیث کے بارے میں بڑا خراب تاثر پیدا کرتا ہے۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ شاید حضرت مخدوم نے یہ بات نہیں کہی ہوگی۔

ص۱۶۸ پر "کما قال النبی من خالف سنتی فھو کافر" معلوم نہیں یہ حدیث،

کس کتاب حدیث میں ہے۔ ص ۱۱۴ و جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ شریعت میرے اقوال ہیں، طریقت میرے افعال ہیں اور حقیقت میرے احوال ہیں"۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف اس قول کا انتساب قطعاً غلط ہے۔ ص ۹۸ پر تحصیل صرف و نحو کے بارے میں جس حدیث کو صحاح کی حدیث کہا گیا ہے وہ صحیح نہیں ہے۔ ص ۱۰۰ پر تو قرآن کی ایک آیت کا حوالہ بھی غلط ہے۔ ولا یلعن بعضکم علیٰ بعض قرآن کا کوئی ٹکڑا نہیں ہے۔

بعض فقہی مسائل سے بھی کھٹک پیدا ہوئی۔ مثال کے طور پر" نماز عید کے بعد مصلی میں حضرت مخدوم کا چار رکعت مزید ادا کرنا"۔ (ص ۱۵۱) سنت کے خلاف ہے۔ صحیح احادیث سے ثابت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نماز عیدین کے بعد عیدگاہ میں نفل ادا نہیں فرماتے تھے۔ حضرت مخدوم کے ملفوظات میں ایک ملفوظ یہ ہے" اولیائے کامل کے عذرہ میں خوشبو آتی ہے اور اگر کامل نہیں ہے تو بھی بدبو نہیں آتی ہے۔ فاضل مؤلف اگر یہ ملفوظ نقل نہ کرتے تو بہت اچھا ہوتا۔ اسی طرح کی چیزیں لوگوں کو غلوئے عقیدت میں مبتلا کرتی ہیں۔ اس ارشاد کے انتخاب پر حیرت ہوئی۔ بزرگوں کے کلام میں اخلاص عبادت کے لیے آخرت اور جنت سے صرف نظر کرنے کی جو تعلیم ملتی ہے وہ کتاب و سنت سے بالکل ہٹی ہوئی ہے۔ افسوس ہے کہ حضرت مخدوم کے یہاں بھی یہ تعلیم ملتی ہے۔ ص ۱۲۷ پر ہے" جب تک سالک کا دل دنیا و عقبیٰ کی آلودگی بلکہ ماسوی اللہ سے پاک نہ ہوگا اس وقت تک اللہ کی قربت حاصل نہ ہوگی"۔ عقبیٰ کے لیے آلودگی کا لفظ کس قدر کھٹکتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ اگر تصوف کی تعلیمات، کتاب و سنت سے الگ نہیں ہیں تو پھر یہ تعلیم کس آیت یا کس حدیث سے ثابت ہے؟

بعض جملے فاضل مؤلف سے بھی نامناسب نکل گئے ہیں۔ ص ۶۶ پر لکھتے ہیں:" جب شیخ الاسلام نجم الدین صغریٰ نے بدباطنی کا مظاہرہ کیا"۔ بدباطنی کا لفظ یہاں بہت ہی نامناسب استعمال ہوا ہے۔ بہرحال جہاں تک فاضل مؤلف کی تحقیق اور محنت کا سوال ہے۔ کتاب بہت کامیاب ہے اور امید ہے کہ آئندہ ایڈیشن اور کامیاب ہوگا۔

مارچ ۱۹۶۴ء

وحدۃ الوجود اور توحیدِ اسلامی

مرتبہ: منشی خطیب عبدالرحمٰن عمری منشی فاضل، صفحات ۸۴۔ قیمت: ایک روپیہ۔ مؤلف سے اس پتہ پر مل سکتی ہے: ۱۶ محمد پورہ تیسری گلی۔ آمبور، تمل ناڈو۔

مؤلف نے لکھا ہے کہ اس کتاب کا پہلا حصہ تمہید میں ہے۔ موضوع پر اصل بحث دوسرے حصے میں آئے گی اس لیے کتاب کے بارے میں صحیح رائے اسی وقت دی جاسکتی ہے جب اس کا دوسرا حصہ بھی سامنے آجائے۔ اس تمہیدی حصہ میں انھوں نے تصوف کی اصل حقیقت اور تصوف کے رواج کے اسباب، ابتدا میں اکابر صوفیہ کے نزدیک اس کی غرض وغایت کیا تھی؟ پھر اس میں کس طرح کے مسائل داخل ہوتے لگے اور وحدۃ الوجود کے مسئلہ پر کس نے شرح وبسط کے ساتھ لکھا؛ اور اسی طرح کی چند دوسری باتیں تحریر کی ہیں۔

اس کتاب کی وجہ تالیف میں جو واقعہ انھوں نے نقل کیا ہے وہ واقعی ہر اس شخص کے لیے باعث تشویش ہوسکتا ہے جو اللہ ورسول کی بتائی ہوئی توحید پر یقین رکھتا ہے۔ مؤلف کا بیان ہے کہ ان کے ایک قابل احترام بزرگ نے اسلامی توحید میں عقیدۂ وحدۃ الوجود کی شدومد کے ساتھ تائید کی اور اجعل الآلهة الها واحدا کی تفسیر کرتے ہوئے بیان فرمایا کہ مشرکین عرب کا شرک یہ تھا کہ وہ کل موجودات عالم کو ذاتِ باری تعالیٰ سے خارج تصور کرتے تھے، چنانچہ آنحضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے مشرکین عرب سے کہا، تمھارے یہ اصنام جنھیں تم خدا کہتے ہو ان کا کوئی جداگانہ وجود نہیں ہے یہ سب خدائے واحد ہی میں داخل ہیں تو تعجب سے انھوں نے کہا اجعل الآلهة الها واحدا "کیا اس نے تمام آلہہ کو الٰہ واحد بنا دیا۔ اس تفسیر کے بعد ان بزرگ نے بعثتِ انبیاء کی اصلی غرض وغایت اسی نظریہ وحدۃ الوجود کی تبلیغ واشاعت

قرار دی۔

رسول کی طرف ایسی بات منسوب کرنی جو اس نے کہی نہ ہو اور قرآن کی تفسیر بالرائے جس درجے کا گناہ ہے وہ اہل علم سے پوشیدہ نہیں، عقیدۂ وحدۃ الوجود میں اگر کسی کو اس درجہ غلو ہو تو اس کی شناعت کچھ اور بڑھ جاتی ہے۔ اس نظریہ کی قباحتوں کو واضح کرنے میں مؤلف کی کوشش سراہنے کے لائق ہے۔ مؤلف نے ابتدا میں خود اپنی کتاب کے لیے یہ الفاظ لکھے ہیں: "تصوف میں صالح انقلاب برپا کرنے والی کتاب" یہ عبارت انھیں نکال دینی چاہیے۔ اس میں خود ستائی پائی جاتی ہے۔ لاالہٰ کا ترجمہ انھوں نے "ماسوا اللہ ہرگز الٰہ کے قابل نہیں" کیا ہے یہ صحیح نہیں۔ اس کی اصلاح کر لینی چاہیے۔

اپریل ۱۹۵۶ء

مسئلۂ وحدۃ الوجود کی تحقیق

مرتبہ: مولانا صفوۃ الرحمٰن صاحب صابر مدیر رسالہ "الحق" صفحات ۹۶۔ کاغذ، طباعت، کتابت اوسط۔ قیمت ایک روپیہ۔ ملنے کا پتہ: ادارہ اہل سنت وجماعت، سلطان شاہی حیدر آباد (آندھرا پردیش)

جناب مولانا صفوۃ الرحمٰن صاحب کو اللہ تعالیٰ جزائے خیر دے کہ وہ صحیح عقائد و خیالات کی نشر و اشاعت اور غلط خیالات و عقائد کی تردید و ابطال میں عرصۂ دراز سے مصروف و مشغول ہیں۔ زیر تبصرہ رسالہ میں بھی انھوں نے مسئلہ وحدت الوجود کی تحقیق کر کے یہی خدمت انجام دی ہے۔ اس مسئلے سے متعلق آج سے دس بارہ سال پہلے تذکرہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی ؒ میں راقم الحروف نے اپنا خیال اس طرح ظاہر کیا تھا۔

"تصوف کا وہ نظریہ جس میں سیکڑوں کے قدم ڈگمگائے اور ہزاروں کے پھسلے، جس نے مسلمانوں میں ایک نئے گمراہ فرقے "وجودیہ" کا اضافہ کیا۔ باطنیہ اور وجودیہ نے مل کر اس نظریے کے پردے میں دین کے اندر نت نئے فتنے پیدا کیے اور ہتک شریعت میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ جن صوفیہ کرام نے اس مسئلہ پر گفتگو کی ان کے کلام کا صحیح مفہوم نہ سمجھ کر بہتیرے سیدھی راہ سے بھٹکے اور بہتوں نے اس کو اپنی فتنہ انگیزی کے لیے بطور آلہ استعمال کیا۔ یہ فلسفیانہ نظریہ چاہے اپنے اصل مفہوم کے لحاظ سے صحیح ہی کیوں نہ ہو اس میں کوئی شبہ نہیں کہ دین اسلام کے اصول و فروع میں اس نظریہ کا کوئی ذکر نہیں اور اس سے تذبذب، شک اور گمراہی حاصل کرنے والوں کی تعداد بے شمار ہے۔"

ایک ایسے خطرناک نظریے کی تردید ضروری ہے اور زیر تبصرہ رسالہ میں مدلل طور پر اس کی

تردید کی گئی ہے اور ثابت کیا گیا ہے کہ یہ نظریہ باہر سے لے کر اسلامی عقائد میں داخل کیا گیا ہے۔

رسالہ تین ابواب میں تقسیم ہے۔ باب اول، وحدت الوجود کا مروجہ مفہوم اور اس کی قرآنی تردید۔ باب دوم، وحدۃ الوجود کا ماخذ۔ باب سوم، اکابر اہل تحقیق کی آراء۔

تبصرہ نگار کے نزدیک اس رسالے کا پہلا باب قابل قدر اور عام فہم ہے۔ باب دوم سے عام لوگ شاید فائدہ نہ اٹھا سکیں، اس لیے کہ فاضل مرتب نے زیادہ تر دوسروں کی عبارتیں بغیر کسی تشریح کے نقل کی ہیں۔ ان عبارتوں سے مطالب اخذ کرنا اور پھر مسئلہ زیر بحث سے اس کا تعلق جوڑنا ہر شخص کا کام نہیں ہے۔ باب اول کی بعض عبارتیں بڑی دلکش اور ایمان افزا ہیں جیسے :-

"اہل ایمان کو اپنی معیت کا علم عطا کرنے سے مراد الٰہی یہ بھی ہے کہ اہل ایمان ہمیشہ اللہ جل شانہ کی معیت کا یقین رکھ کر اپنے دل کو مضبوط رکھیں، باطل کی قوت، طاقت اور کثرت و شوکت سے مرعوب نہ ہوں اور نہ اہل باطل کے مکر وفن سے حزن و تردد میں مبتلا ہوں، حقیقت یہ ہے کہ حق تعالیٰ کے ساتھ ہونے کا یقین جوہری توانائی سے کہیں زیادہ توانائی عطا کرتا ہے۔ تاریخ کے اوراق شاہد ہیں کہ اہل حق نے اسی قوتِ یقین کی بدولت باطل کے سیلاب کا مقابلہ کوہِ آہن کی طرح کیا۔"

قرآن مجید کی بعض آیتوں پر بہت غلط اعراب چھپ گیا ہے۔ مثال کے طور پر صفحہ ۱۷ "مَا أَظُنُّ السَّاعَةَ" والی آیت بہت غلط چھپی ہے۔ صفحہ ۱۵ "وَيَعْلَمُونَ أَنَّ اللهَ هُوَ الْحَقُّ الْمُبِينُ" کا جو مطلب فاضل مرتب نے بیان کیا ہے وہ الفاظ قرآن سے مطابق نہیں ہے۔ صفحہ ۶۸ پر ارسطو کو اقدمی یعنی اشراقی لکھ دیا گیا، حالانکہ وہ مشائین کا امام ہے اور صفحہ ۶۳ پر مرتب نے خود اسے مشائین میں شمار کیا ہے۔

رسالہ اہل علم کے مطالعہ کے لائق ہے۔

حیاتِ ولی

مصنفہ مولانا حافظ محمد رحیم بخش مرحوم دہلوی صفحات ۶۵۶، کاغذ کتابت، طباعت اوسط۔
قیمت مجلد مع گرد پوش: ؍ سے شائع کردہ: المکتبۃ السلفیہ شیش محل روڈ لاہور

یہ ضخیم کتاب حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ اور ان کے آبا ر و اجداد نیز اولاد و اساتذہ کا تذکرہ ہے۔ نصف صدی پہلے لکھی گئی تھی اب دوبارہ اسے مکتبہ سلفیہ لاہور نے شائع کیا ہے۔ کتاب چار حصوں میں تقسیم ہے۔ تین حصے ابار و اجداد کے تذکرہ سے گھرے ہوئے ہیں چوتھا حصہ حضرت شاہ ولی اللہ ان کے اساتذہ اور اولاد کے ذکر میں ہے۔ یہ حصہ ص ۳۷۸ سے شروع ہوتا ہے۔ جس شخص نے بھی حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کی تصنیفات تعصبات سے خالی الذہن ہو کر پڑھی ہیں وہ آپ کی جلالت قدر سے ناواقف نہیں ہو سکتا۔ آپ کی محدثانہ جلالت، فقہی بصیرت اور مجددانہ کارناموں سے وہی انکار کر سکتا ہے جس نے اپنی آنکھوں پر کسی خاص تعصب کی پٹی باندھ لی ہو۔ یہ واقعہ ہے کہ حضرت شاہ صاحب کی تصنیفات اور آپ کے کارناموں پر آج تک کوئی ایسی جامع کتاب مرتب نہیں کی گئی جسے معیاری اور اعلیٰ درجے کی تصنیف کہا جا سکے۔ الفرقان لکھنؤ کا شاہ ولی اللہ نمبر مقالات کے مجموعے کے لحاظ سے ایک اونچے درجے کی چیز ضرور ہے۔ لیکن بہرحال وہ کوئی تصنیف اور جامع کتاب نہیں ہے۔ زیر تبصرہ کتاب تقریباً پچاس سال پہلے لکھی گئی تھی اور اس وقت تک اُردو زبان میں تذکرہ نگاری کا فن اپنی ابتدائی شکل میں تھا۔ یہی وجہ ہے کہ یہ کتاب علمی و تحقیقی تذکرہ کے بجائے "قصیدۂ منثور" معلوم ہوتی ہے۔

اگر مکتبۂ سلفیہ اس ضخیم کتاب کا کوئی جامع اختصار شائع کرتا تو کم خرچ میں زیادہ فائدہ حاصل ہو سکتا تھا، غیر ضروری عبارتیں نکال دی جائیں تو اس کا حجم موجودہ حجم سے ایک تہائی

باقی رہ جائے گا۔ پہلے زمانہ میں بزرگوں کے تذکروں کی ایک بڑی خصوصیت مبالغہ آرائی رہی ہے اور یہ خصوصیت اس کتاب میں بھی بدرجۂ کمال موجود ہے۔ بزرگوں کے واقعات وکلمات بھی غالیانہ عقیدت مندی کے ساتھ درج کر لیے گئے ہیں۔ کتاب و سنت سے ان کی مطابقت پر توجہ نہیں دی گئی ہے، یہاں صرف ایک مثال پیش کی جاتی ہے۔

شیخ احمد شناوی کے ذکر میں مؤلف کتاب لکھتے ہیں: "یہ بھی آپ ہی کا پر مغز فقرہ ہے کہ "لایدخل النار من رآنی ورای من رآنی الی یوم القیامۃ" یعنی جس شخص نے مجھے دیکھا یا میرے دیکھنے والے کو دیکھا وہ کبھی دوزخ میں داخل نہ ہوگا۔ صـ ۲۴۳ اگر مؤلف کتاب ذراسی توجہ دیتے تو پتہ چل جاتا کہ شیخ احمد شناوی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ فقرہ شاید عالم جذب میں کہا ہوگا لیکن مؤلف کتاب اسے پُر مغز فقرہ قرار دیتے ہیں، معلوم نہیں وہ "مغز" کیا ہے۔ تعجب ہوتا ہے کہ اس طرح کے خیالات کی اشاعت "المکتبۃ السلفیہ" سے ہو رہی ہے۔ ایک خاص حلقہ کی طرف سے جب ہندوستان میں اشاعتِ حدیث کا ذکر چھیڑا جاتا ہے تو شیخ عبدالحق محدث دہلوی کو اس سلسلے میں شاہ ولی اللہ محدث دہلوی سے کم مرتبہ ثابت کرنے کی ضرور کوشش کی جاتی ہے چنانچہ یہ کوشش اس کتاب میں بھی موجود ہے ایک جگہ شیخ عبدالحق کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"لیکن انصاف یہ ہے کہ علم حدیث میں جس اولیت کا تمغہ اس زمانے کے مورخوں نے شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ کے لیے تجویز کیا ہے اس کے مستحق جناب شاہ ولی اللہ صاحبؒ ہیں کیوں کہ علم حدیث کی عمارت کے بانی اگرچہ جناب شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ تھے لیکن جنھوں نے اس عمارت کا نقشہ تیار کیا اور پھر اشاعت ورواج کے مرقعوں سے اس کی درودیوار کو سجایا' وہ شاہ ولی اللہ صاحب ہیں۔" صـ ۳۸۴

دوسری جگہ لکھتے ہیں:

"حدیث وتفسیر اور دیگر مذہبی علوم کی ترقی دینے میں اگرچہ بعض مورخوں نے جناب شاہ صاحب کا نمبر حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ کے نیچے رکھا ہے لیکن ہم سابق میں

لکھ آئے ہیں کہ شاہ صاحب اس قابل ہیں کہ اس فہرست میں آپ کا نام شیخ عبدالحق محدث دہلوی سے پہلے لکھا جائے۔ ص۴۰۰

یہ عجیب منطق ہے کہ شیخ عبدالحق کو علم حدیث کا بانی بھی کہا جا رہا ہے اور پھر اولیت کا تمغہ ان سے چھین کر شاہ ولی اللہ صاحبؒ کو عنایت فرمایا جا رہا ہے۔ مؤلف کے نزدیک ہندوستان میں حدیث و تفسیر کی اشاعت کرنے والوں کی فہرست میں شیخ عبدالحق کے نام سے پہلے شاہ ولی اللہ صاحب کا نام لکھنا چاہیئے۔

مؤلف کا استدلال بالکل ایسا ہے جیسے کوئی کہے کہ اگرچہ مورخین نے لکھا ہے کہ شیخ عبدالحق شاہ ولی اللہ سے بہت پہلے پیدا ہوئے تھے لیکن شاہ ولی اللہ اس قابل ہیں کہ ان کو شیخ عبدالحق سے بھی پہلے موجود فرض کیا جائے، سمجھ میں نہیں آتا کہ اس طرح کی کوشش سے حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی جلالت قدر میں کیا اضافہ ہوتا ہے اور واقف کار اہل علم حضرت شیخ عبدالحق کی اولیت اور ان کی خدمات کو کس طرح بھول جائیں گے۔

فروری ۱۹۵۶ء

معرکۂ سنّت وبدعت

محمد اشفاق حسین ۔ سائز بڑا کاغذ کتابت، طباعت بہتر گردپوش کے ساتھ صفحات حصہ اول ۳۲۵ وحصہ دوم ۲۰۰ ۔ قیمت حصہ اول ۔/۱۵ روپیہ، حصہ دوم ۔/۱۰ روپیہ۔ ناشر: مجلس احیائے توحید وسنت، حیدرآباد (اے پی)

اس ضخیم کتاب کے بڑے حصہ کا مطالعہ میں نے کیا ہے۔ مولانا اشفاق حسین صاحب صدر مجلس احیائے توحید وسنت، متعدد کتابوں کے مصنف ہیں۔ ان کی بعض کتابوں پر پہلے بھی زندگی میں تبصرہ کیا گیا ہے۔ اس کتاب کے نام سے پہلے یہ عبارت درج ہے:

"سنت کے اثبات، بدعت کی باطل تقسیم اور تحریف دین کے خلاف مدلل اور مفصل اور فیصلہ کن کتاب۔"

پہلے حصہ کی فہرست مضامین ساڑھے نو صفحات میں اور دوسرے حصے کی پانچ صفحات میں آئی ہے۔ کتابیات کے عنوان سے ابتدا ہی میں ان کتابوں اور جن علمار کے اقوال سے استفادہ کیا گیا ہے ان کے ناموں کی فہرست بھی دی گئی ہے۔ ان کی تعداد ۱۹۱ ہے۔ اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اس کتاب کی تیاری میں فاضل مصنف نے بہت محنت کی ہے۔ پہلا حصہ ۱۵ ابواب پر اور دوسرا حصہ دو ابواب اور ایک ضمیمہ پر مشتمل ہے۔ پوری کتاب میں ۱۷ ابواب ہیں۔ اس موضوع پر بڑی حد تک یہ ایک جامع کتاب ہے۔ پہلے حصہ میں جو ضخیم ہے، قرآن احادیث، آثارِ صحابہؓ لغت اور اقوال علمار پیش کر کے "بدعت" کی پوری وضاحت کی گئی ہے اور دوسرے حصے میں بقول مصنف "حاملین شریعت قبوری" کے دلائل کی تردید کی گئی ہے۔ "مجلس احیائے توحید وسنت" کے ذریعہ مولانا محمد اشفاق حسین صاحب بدعت و خرافات اور مشرکانہ عقائد واعمال کی تردید اور امت کی اصلاح کی جدوجہد میں لگے ہوئے

ہیں اور اس لحاظ سے قابل مبارک باد ہیں۔ دوسرے حصے میں فاضل مصنف نے مفتی احمدیار خاں کی کتاب جاء الحق میں جو دلائل بدعت کی تقسیم کے صحیح ہونے پر دیئے گئے ہیں ان کا تفصیل سے جائزہ لیا ہے اور ان کا کھوکھلا پن واضح کیا ہے۔ اس پہلو سے یہ کتاب لائق مطالعہ اور قابلِ استفادہ ہے۔

کتاب کے دوسرے حصے میں بدعت کے لغوی اور اصطلاحی و شرعی معانی بیان کیے گئے ہیں اور فاضل مصنف نے اس کا ایک نقشہ بھی بنا دیا ہے۔ بدعت شرعی، بدعت لغوی اور پھر بدعت لغوی کی دو قسمیں لکھی ہیں۔ بدعت حسنہ، بدعت سیئہ۔ پھر بدعت حسنہ کی تین قسمیں لکھی ہیں۔ واجب، مندوب، مباح۔ بدعت سیئہ کی دو قسمیں لکھی ہیں۔ حرام۔ مکروہ۔ علمائے امت نے بدعت لغوی کی جو تقسیم کی ہے، یہ نقشہ اسی کے مطابق بنایا گیا ہے۔ مصنف کی توجہ کے لیے چند باتیں عرض کرنا بھی مناسب معلوم ہوتا ہے۔

(۱) جو لوگ بدعت کی تقسیم حسنہ اور سیئہ کے قائل نہیں ہیں اور جو لوگ اس تقسیم کے قائل ہیں ان دونوں جماعتوں کے جتنے مباحث حقیر تبصرہ نگار کی نظر سے گزرے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ دونوں جماعتوں کے درمیان نزاع لفظی ہے۔ منکرین بدعت جب "بدعت" بولتے ہیں تو اس سے بدعت شرعی مراد لیتے ہیں اور جب قائلین تقسیم "بدعت" بولتے ہیں تو اس سے بدعت لغوی مراد لیتے ہیں۔ مفتی احمد یار خاں کی بھی کوئی ایسی عبارت پیش نہیں کی گئی ہے جس میں صراحت کے ساتھ انھوں نے یہ کہا ہو کہ بدعت شرعی اصطلاحی کی دو قسمیں ہیں۔ حسنہ اور سیئہ۔ جہاں تک مجھے علم ہے وہ لوگ بھی جن کو مصنف "قبور شریعت" کا حامل" کہتے ہیں کسی چیز کو بدعت شرعی تسلیم کر کے اس کو حسنہ قرار نہیں دیتے بلکہ ان کی غلطی یہ ہے کہ جو چیزیں بدعت شرعی کے دائرے میں داخل ہیں ان کو وہ بدعت شرعی نہیں سمجھتے بلکہ بدعت لغوی سمجھ کر اس کو حسنہ قرار دیتے ہیں۔ تبصرہ نگار کے نزدیک زیادہ مفید بات یہ ہے کہ اس سوراخ کا منھ بند کیا جائے جہاں سے بدعات و خرافات کے دھارے نکل رہے ہیں۔

(۲) حصہ اول کے ص ۹۰ پر یہ ذیلی عنوان ہے: "علم ظاہر و علم باطن کی باطل تفریق" اس

کے تحت علامہ برکلی رومیؒ کی کتاب طریقہ محمدیہ سے یہ عبارت لکھی ہے :۔

"ہمارے زمانے کے بعض مدعیان تصوف کا جو یہ وطیرہ ہے کہ جب ان کے خلافِ شریعت کاموں کو بُرا کہا جاتا ہے تو وہ کہہ دیتے ہیں کہ اس کی حرمت صرف علم ظاہر میں ہے اور ہم اصحاب علم باطن میں سے ہیں اور یہ چیزیں اس میں حلال ہیں اور تم ظاہر پرست لوگ تو احکام شریعت کو کتاب سے نکالتے ہو اور ہم براہ راست صاحب کتاب صلی اللہ علیہ وسلم سے معلوم کر لیتے ہیں۔ سو یہ محض بددینی اور خالص گمراہی ہے کیونکہ اس میں شریعت محمدیؐ کا استخفاف ہے۔ پس جو شخص کسی سے یہ بات سنے اس پر ضروری ہے کہ اس کا رد کرے اور بلا شک و تردد اس کے باطل ہونے کا یقین رکھے ورنہ وہ بھی ان کے زمرے میں داخل ہوگا۔"

اس کے نیچے مصنف نے مولانا محمد منظور نعمانی کی یہ عبارت نقل کی ہے :

"واضح رہے کہ شریعت و طریقت کی یہ تفریق اور علم ظاہر و باطن کی یہ اصطلاح صرف بعد کے گمراہ صوفیوں کی ایجاد ہے ورنہ اکابر صوفیہ کا دامن تقدس اس سے پاک ہے۔ ان حضرات نے صاف صاف تصریحیں فرمائی ہیں کہ شریعت محمدی اور کتاب و سنت کے سوا سلوک کا کوئی راستہ نہیں۔ جن خوش نصیبوں کو ان حضرات کی کتابیں دیکھنے کی توفیق ہوئی ہے، ان پر یہ تصریحات مخفی نہ ہوں گی۔"

(الفرقان، اپریل ۱۹۶۲ء)

اس عبارت میں اس کی کوئی نشان دہی نہیں ہے کہ گمراہ صوفیوں میں کون لوگ ہیں اور اکابر صوفیہ کون ہیں۔ تبصرہ نگار نے اللہ تبارک و تعالیٰ کی توفیق سے شیخ اکبر ابن عربی سے لے کر شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ تک صوفیائے کرام کی بہت سی کتابیں پڑھی ہیں، ان میں سے کوئی ایک کتاب بھی ایسی نہیں ہے جس میں علم ظاہر اور علم باطن کی تقسیم موجود نہ ہو۔ جن کتابوں میں یہ تصریحات موجود ہیں کہ شریعت محمدیؐ اور کتاب و سنت کے سوا سلوک کا کوئی

راستہ نہیں۔ انہیں کتابوں میں پوری صراحت کے ساتھ علم ظاہر و باطن کی تقسیم بھی موجود ہے۔ یہ حقیر فاضل مصنف کو مشورہ دیتا ہے کہ جن لوگوں کو "اکابر صوفیہ" کہا جاتا ہے ان کی تصوف میں لکھی ہوئی کتابوں کا خود مطالعہ کریں۔ غالی عقیدت مندوں کی تحریروں پر اعتماد نہ کریں۔

(۳) حصہ دوم ص ۴۳، ۴۴، پر منیٰ میں قصر یا پوری نماز کا ذکر کرتے ہوئے لکھا گیا ہے:-

"چونکہ اس اضافے کا کوئی معقول سبب موجود نہ تھا اس لیے اس بدعت کی صحابہ کرامؓ نے مخالفت کی جو بدعت لغوی حسنہ نہ بن سکی بلکہ بدعت شرعی اور گمراہی قرار پائی۔"

اس عبارت پر نظر ثانی کی ضرورت ہے۔ منیٰ میں پوری نماز ادا کرنے کو مطلقاً بدعت شرعی اور گمراہی قرار دینا بالکل غلط بات ہے۔ یہاں اتنا اشارہ کافی ہے کہ نماز قصر مسافر کے لیے ہے مقیم کے لیے نہیں۔ امام ثوری، امام ابوحنیفہ، شافعی، ابوثور، داؤد رحمہم اللہ کے نزدیک اہل مکہ کے لیے منیٰ میں نماز قصر جائز نہیں ہے۔

(۴) ص ۶۶ حصہ دوم پر "ترویح الجنان والجنۃ" کے حوالے سے لکھا گیا ہے:-

"لغوی بدعت ہر اس نو ایجاد کا نام ہے جو آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد پیدا ہوئی ہو عام اس سے کہ عبادت ہو یا عادت۔ اور شرعی بدعت وہ ہے جو قرون ثلاثہ کے بعد پیدا ہوئی ہے۔"

لغوی و شرعی بدعت کی یہ تعریف غلط ہے۔ ان دونوں کی تعریف میں "زمانہ" کا دخل نہیں ہے۔ لغۃً ہر نئی چیز بدعت ہے اور شرعاً ہر وہ چیز بدعت ہے جس کی کوئی دلیل شریعت میں موجود نہ ہو اور اس کا تعلق دینی امور سے ہو۔

من احدث فی امرنا ھذا ما لیس منہ فھو ردٌّ	جس نے ہمارے اس امر (دین) میں ایسی نئی بات پیدا کی جو اس سے نہیں ہے تو وہ مردود ہے۔

یہ شرعی و اصطلاحی بدعت کی ایک جامع تعریف ہے۔

جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا کہ یہ کتاب مجموعی اعتبار سے قابلِ مطالعہ اور استفادہ ہے۔ (دسمبر ۸۵ء)

روضات

صفحات ۱۳۶۔ کاغذ، کتابت وطباعت بہتر۔ قیمت ڈھائی روپیہ صرف۔ ملنے کا پتہ: پاک اکیڈمی ۱۴۱/۱ حیدرآباد۔ کراچی ۱۸۔ ہندوستان میں ملنے کا پتہ:۔ کتب خانہ انجمن ترقی اردو۔ اردو بازار جامع مسجد دہلی ۶

یہ کتاب ادارۂ تحقیق وتصنیف کراچی ۱۸ نے شیخ عبدالحق محدث دہلوی کی تصنیف سمجھ کر شائع کی ہے اور اس کا ترجمہ مولوی ثناء اللہ صاحب ندوی نے کیا ہے اس کا مقدمہ جناب مفتی انتظام اللہ صاحب شہابی اکبرآبادی نے لکھا ہے۔ اس میں وہ لکھتے ہیں:۔

"اس رسالے کو حضرت شیخ کی تصانیف میں شمار کرنے کے لیے داخلی شہادتیں موجود ہیں۔ اس کا انداز نگارش اور مضمون کا رنگ ڈھنگ ہی بتا رہا ہے کہ اسی ولیِ کامل اور عالم باعمل کے قلم کی تراوش ہے۔" صہ ۱۵

چونکہ راقم الحروف کو شیخ عبدالحق محدث دہلوی کی ذات، ان کی تصنیفات اور ان کے کارناموں سے دلچسپی ہے اس لیے میں نے بڑے شوق سے اس کتاب کا مطالعہ کیا مگر افسوس کہ مطالعہ کے بعد معلوم ہوا کہ اس کتاب کو حضرت شیخ کی طرف منسوب کرنا صحیح نہیں ہے۔ محترم مفتی انتظام اللہ صاحب نے بات بالکل الٹی کہی ہے۔ جس شخص نے بھی حضرت شیخ کی تصانیف کا مطالعہ کیا ہے، ان کے مزاج سے واقفیت حاصل کی ہے اور علم الحدیث میں ان کے مقام کو جانتا ہے وہ اول نظر میں کہہ دے گا کہ یہ کتاب ہرگز شیخ عبدالحق محدث دہلوی کی نہیں ہو سکتی۔ اس رسالے کے اخیر میں جو عبارت درج ہے اور جس کی بنیاد پر اس کو حضرت شیخ کی تصنیف قرار دیا گیا ہے اس کے بارے میں انتہائی حسن ظن کے ساتھ کہا جائے گا کہ منسوب کرنے والے کو غلط فہمی ہوئی ہے ورنہ شبہ اس کا بھی ہے کہ کتاب کو مقبول اور مستند بنانے کے لیے ان کی طرف اس کو منسوب کر دیا گیا ہے۔ اس تبصرے

میں کتاب کا مکمل تجزیہ نہیں کیا جا سکتا۔ میں ادارہ تحقیق و تصنیف کی توجہ کے لیے چند اشارات کر دوں گا۔

صفحہ ۳۶ پر یہ عبارت ہے :۔

"حضرت سرور صلعم فرمودہ کہ الشریعۃ اقوالے والطریقۃ افعالے والحقیقۃ احوالے۔" یہی بات صہ۳۸ میں یوں ہے۔ "حضرت نبوت مآب فرمود کہ الطریقۃ افعالے والحقیقۃ احوالے۔"

جس شخص نے سمجھ کر مشکوٰۃ بھی پڑھ لی ہے وہ بھی اس موضوع عبارت کو حدیث قرار نہیں دے سکتا۔ چہ جائیکہ اس کا انتساب شیخ عبدالحق محدث دہلوی کی طرف کیا جائے۔ حدیث تو الگ رہی اس میں تو "حضرت سرور صلعم فرمودہ" اور "حضرت نبوت مآب فرمود" کے ٹکڑے بھی پکار رہے ہیں کہ یہ محدث دہلویؒ کے قلم سے نہیں نکلا۔

صہ۴۵ پر ہے :۔ "و دلالت حدیث نبوی صلعم کہ رایتؐ ربی فی لیلۃ المعراج امرد شاب۔" اس عبارت کو بھی حدیث قرار دینا حضرت شیخ کا کام نہیں ہو سکتا۔ علم حقیقت کے ثبوت میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی اس حدیث کو پیش کرنا بھی محدث دہلویؒ کا کام نہیں ہو سکتا۔ جس میں حضرت ابوہریرہؓ نے حضورؐ سے دو علم حاصل کرنے کا ذکر کیا ہے لیکن اس کتاب کے صہ۴۷ پر یہ حدیث اسی ثبوت میں پیش کی گئی ہے۔

صہ۵۰ پر یہ عبارت ہے :۔

"چوں طالبے را می بنید کہ مانعے از موانع ایں راہ در ذات او مستقر است و حبِ دلش بداں متعلق و مستمر لاجرم بجہت دفع آں اور ا بکسب گناہے می گمارند اما پیوستہ دراں نمی دارند۔"

یہ عبارت بھی حضرت شیخ کے قلم سے نہیں نکل سکتی اور نہ وہ اس علاج کے قائل ہو سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ یہ کتاب وحدت الوجود کے اثبات میں ہے اور یہ وہ موضوع ہے جس کے بارے میں حضرت شیخ نے تصریح کی ہے کہ اس پر گفتگو کرنے

سے انہیں روک دیا گیا ہے۔ اس کتاب میں جو مضامین پھیلے ہوئے ہیں اور جن فلسفیانہ انداز میں پھیلے ہوئے ہیں حضرت شیخ اپنے مزاج اور ذوق کے لحاظ سے کبھی ہمیشہ اس کے مخالف رہے ہیں اور اس پر ان کی تصنیفات شاہد ہیں۔

میں ادارۂ تحقیق و تصنیف سے باادب عرض کرتا ہوں کہ بلا تحقیق اس کتاب کو حضرت شیخ کی طرف منسوب کر کے شائع کرنا کوئی مناسب بات نہ تھی۔

(اگست ۱۹۶۵ء)

مدارجِ سلوک

ڈاکٹر میر ولی الدین۔ صفحات ۲۰۰ مجلد گردپوش کے ساتھ قیمت : پانچ روپے
ناشر:۔ مجلس معارف القرآن دارالعلوم۔ دیوبند

فلسفی ڈاکٹر میر ولی الدین صاحب نے تصوف کے موضوع پر متعدد کتابیں تصنیف کی ہیں ان کی یہ کتاب بھی اسی موضوع پر ہے۔ ان کی یہ کتاب ایک دیباچہ اور آٹھ ابواب پر مشتمل ہے۔
(۱) تزکیہ نفس (۲) تصفیہ قلب (۳) تصفیہ قلب اور ذکر وصلوٰۃ (۴) اذکار و اوراد و سلسلہ نقش بندیہ قادریہ (۵) اذکار و اوراد سلسلہ چشتیہ (۶) تخلیہ سر (۷) مراقبات نقشبندیہ (۸) تجلیہ روح

جن لوگوں کو خانقاہی تصوف اور اس کے اوراد و مراقبات وغیرہ سے دل چسپی ہو، ان کے لیے یہ کتاب لائق مطالعہ ہے اور جو لوگ تزکیہ نفس، تصفیہ قلب اور تجلیۂ روح کے لیے قرآن اور صحیح احادیث کی تعلیمات و ہدایات اور اذکار و تسبیحات کو کافی سمجھتے ہوں اور جن کے نزدیک آیات و احادیث کے وہی معانی و مفاہیم صحیح ہوں جو صحابہ و تابعین اور علمائے شریعت نے بیان کیے ہیں ان کے لیے یہ کتاب کچھ زیادہ مفید نہیں ہے بلکہ اس کے متعدد مباحث سے الجھن پیدا ہوتی ہے۔ میں طوالت کے خوف سے کوئی تنقید نہیں کر رہا ہوں لیکن ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں اتنا ضرور عرض کرنا چاہتا ہوں کہ وہ اپنی کتاب کو موضوع احادیث سے پاک رکھتے تو اچھا تھا۔ انھوں نے صرف یہی نہیں کہ موضوع احادیث بھی اپنی کتاب میں نقل کی ہیں بلکہ کسی حدیث کو صحیح قرار دینے کے لیے ایک نرالا اصول بھی بیان کیا ہے۔ ص ۲۵ پر انھوں نے کنت کنزا مخفیا فاحببت ان اعرف ایک وضع کردہ حدیث نقل کی ہے اور اس پر یہ حاشیہ لکھا ہے:

"صوفیہ کے نزدیک یہ حدیث قدسی سمجھی جاتی ہے۔ حجۃ الاسلام امام غزالیؒ اور حضرت شیخ اکبر محی الدین ابن عربیؒ نے بھی اس کو اسی حیثیت سے پیش کیا ہے اور تمام مکاشفین صوفیہ اس کی صحت کے قائل ہیں۔"

اس کے معنے یہ ہوئے کہ جس عربی عبارت کو حدیث کی حیثیت سے پیش کر دیا جائے اور جس کے بارے میں بذریعہ کشف اس کے صحیح حدیث ہونے کا فیصلہ کر دیا جائے وہ عبارت حدیث صحیح کا درجہ حاصل کرے گی۔ شاید اسی طرح کے اصولوں اور فیصلوں کا انکار کرنے والوں کو ڈاکٹر صاحب جیسے لوگ منکر تصوف قرار دیتے ہیں۔ بہر حال جو لوگ ڈاکٹر صاحب کی اس طرح کی کتابوں سے دل چسپی رکھتے ہیں ان کے لیے یہ کتاب بھی دل چسپ ہے۔

اکتوبر ۶۹ء

ماہنامہ نظام کا تصوف نمبر

ماہنامہ نظام، کان پور، جناب مولانا مفتی محمود حسن گنگوہی اور جناب قمر الدین مظاہری کی ادارت میں نکل رہا ہے۔ اس نے اگست، ستمبر، اکتوبر کا مشترک شمارہ "تصوف نمبر" کے نام سے شائع کیا ہے۔ اس میں مولانا گنگوہی، مجدد الف ثانیؒ، مولانا تھانویؒ، مولانا مدنی، مولانا ابو الکلام، حضرت پھول پوری اور خواجہ محمد معصوم سرہندی رحمہم اللہ کے افادات بھی پیش کیے گئے ہیں اور وقت کے مشاہیر میں شیخ الحدیث مولانا زکریا، مولانا ابو الحسن علی ندوی اور مولانا محمد اسحاق سندیلوی وغیرہم کے مقالات بھی دیئے گئے ہیں۔ مولانا گنگوہی اور مولانا عاشق الٰہی میرٹھی کے چند مکاتیب بھی اس کی زینت ہیں اور شریعت وطریقت کے موضوع سے متعلق شعراء نے بھی طبع آزمائی کی ہے۔ بہ حیثیت مجموعی تصوف سے متعلق ایک اچھا مجموعہ مرتب کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس نمبر کی تمام نگارشات پر تنقید و تبصرہ کی نہ گنجائش ہے اور نہ اس کی کوئی خاص ضرورت ہے۔ جس تصوف سے ابن تیمیہ، ابن قیم، ابوالاعلیٰ مودودی اور دوسرے علماء نے اتفاق کیا ہے اس پر کچھ لکھنا تحصیل حاصل ہے۔ اس لیے کہ وہ تمام مسلمانوں کے نزدیک مسلم ہے اور جس تصوف سے ابن تیمیہؒ وغیرہ نے اختلاف کیا ہے اس کی نشان دہی کرنا اور اس پر اظہار خیال کوئی ایسا کام نہیں جو اس مختصر تبصرے میں کیا جا سکے۔ اس نمبر کی جن باتوں نے تبصرہ نگار کے ذہن میں الجھن پیدا کی ہے ان میں سے چند کا ذکر اس لیے کیا جا رہا ہے کہ اس نمبر کے مرتبین ان پر غور کریں۔

پہلی بات یہ کہ تصوف کیا ہے؟ کا جواب اس نمبر میں متضاد نہ ہونا چاہیے تھا کم سے کم اتنی بات تو مرتبین کو ضرور ملحوظ رکھنی چاہیے تھی اس لیے کہ اسی سوال پر تمام مباحث کا دار و مدار ہے۔ اس سوال کا جواب حضرت مولانا گنگوہی نے دیا ہے جو اسی سوال کے تحت اس نمبر میں درج ہے اور پھر اس سوال کا جواب مولانا تھانوی نے

بھی دیا ہے۔ اور وہ بھی اس نمبر میں موجود ہے اور پھر اسی سوال کا جواب مولانا اسحاق سندیلوی نے بھی دیا ہے اور وہ بھی ان کے طویل وعریض مقالے میں موجود ہے جو اس نمبر کی زینت ہے حضرت گنگوہی وتھانوی اور جناب سندیلوی کے جوابات میں کھلا ہوا تضاد پایا جا رہا ہے ان دونوں حضرات کے نزدیک تصوف ان اعمال باطنہ کا نام ہے جو خود بذاتہا مقصود ہیں"۔ اور مولانا سندیلوی کے نزدیک تصوف ان تدابیر کا نام ہے جو مقصود نہیں بلکہ مقصود کا ذریعہ ہیں"۔ اب پڑھنے والے کو الجھن ہوتی ہے کہ ان دو جوابوں میں کس جواب کو صحیح مانے۔ مقصود اور وسیلہ مقصود کا فرق ہر صاحب علم جانتا ہے۔ اس کے علاوہ مولانا سندیلوی نے یہ بات بھی محسوس نہیں فرمائی ہے کہ وہ پہلے کیا لکھ آئے ہیں اور بعد کو کیا لکھ رہے ہیں، مقالے کی ابتدا میں انھوں نے لکھا ہے کہ "خیر القرون میں اگرچہ اصطلاح تصوف موجود نہ تھی مگر خود تصوف موجود تھا" اور اس کے بعد آگے تحقیق فرمائی ہے کہ "یہ تدابیر جن کو وہ 'تصوف' کہتے ہیں خیر القرون میں موجود نہ تھیں، کیوں کہ ان قرون میں ان تدابیر کی ضرورت ہی نہ تھی، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت تو بڑی چیز ہے آپ کی صرف ایک نظر معجز اثر سارے مرحلے طے کرا دیتی تھی اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی صحبتیں بھی اس قدر قوی التاثیر تھیں کہ تزکیۂ نفس کے لیے کسی مصنوعی تدبیر کی ضرورت نہ تھی"۔ اب قاری حیران ہوتا ہے کہ مولانا کی کس بات کو تسلیم کرے۔ ظاہر ہے کہ خیر القرون میں جو چیز موجود تھی وہ کچھ اور ہوگی اور جو چیز موجود نہ تھی وہ کچھ اور ہوگی۔ موجود اور ناموجود دونوں ہی کو تصوف کہنا کس طرح صحیح ہوگا۔ تبصرہ نگار کے نزدیک اس تضاد بیانی نے تصوف نمبر کی افادیت کو بہت مجروح کیا ہے کیوں کہ یہ بات ہی الجھ کر رہ گئی کہ تصوف کیا ہے؟

دوسری بات جس نے ذہن میں الجھن پیدا کی وہ یہ ہے کہ بعض وہ باتیں جو اکابر وائمہ صوفیہ کی کتابوں میں بکثرت ملتی ہیں اس نمبر میں ان باتوں کی تردید کی گئی ہے۔ مثال کے طور پر ذاتِ الٰہی کو منزلِ مقصود اور حاصلِ سیر وسلوک، اِن لوگوں نے بھی قرار دیا ہے جن کی ولایت اور اس فن میں ان کی امامت مسلم ہے۔ یہاں تک کہ یہ بات حضرت مجددؒ اور خواجہ محمد معصومؒ کے مکتوبات میں بھی پورے زور اور تاکید کے ساتھ موجود ہے۔ حضرت مجددؒ کے

یہاں تو یہ چیز نظریۂ قیومیت تک ترقی کر گئی ہے لیکن مولانا سندیلوی فرماتے ہیں کہ "ذاتِ الٰہی کو منزل مقصود بنانا ہندو یوگ کی چیز ہے۔ اسلامی تصوف کی چیز نہیں ہے" اگر یہی بات ہم جیسے لوگ لکھ دیتے تو معلوم نہیں کن الزامات کے ہدف بنتے۔ اس تبصرے میں عبارتیں نقل کرنے کی گنجائش نہیں ہے ورنہ میں مکتوبات مجددی اور معصومی سے متعدد عبارتیں یہاں پیش کرتا۔ اسی طرح مولانا سندیلوی کا یہ لکھنا کہ ارباب شریعت کو اہل ظاہر، صرف شیعۂ باطنیہ کہتے ہیں، عجیب بات ہے کیوں کہ صوفیہ حق کی کتابوں میں ارباب شریعت کے لیے یہ لقب بلکہ اس سے بھی ادنیٰ درجے کا لقب موجود ہے۔ ہم میں سے اگر کوئی شخص ان عبارتوں کو نقل کر کے صوفیۂ حق کی ان باتوں کی تردید کر دے تو اسے گستاخ اور منکر تصوف کہہ دیا جائے گا ــــ اس نمبر میں تصوف سے متعلق چند استفسارات کے جوابات جناب مولانا مفتی محمود حسن گنگوہی نگراں رسالہ نے دیئے ہیں۔ ان کے جوابات میں سے بعض کے بارے میں بھی یہ الجھن پیش آتی ہے کہ ان کا جواب کچھ ہے اور بعض مستند کتابوں میں اس کے خلاف ہے۔ مثال کے طور پر ایک سوال میں پوچھا گیا ہے، کیا اولیاء اللہ انبیاء علیہم السلام کی طرح معصوم ہوتے ہیں؟ اس کا وہی مشہور جواب عصمت و حفاظت کے فرق سے دیا گیا ہے لیکن صراط مستقیم میں ہے کہ غیر انبیاء کو بھی عصمت کا مقام حاصل ہوتا ہے۔ حضرت مولانا شاہ اسمٰعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ نے صدیقین کے مقامات و مراتب کی توضیح کرتے ہوئے لکھا ہے:

"پس لابد او را بہ محافظے مثل محافظت انبیاء کہ مسمی بعصمت است فائز کنند۔"

اسی طرح اولیاء کے تصرف فی العالم کے بارے میں جو جواب مفتی صاحب نے دیا ہے وہ صراطِ مستقیم سے مختلف ہے، اس سے تو معلوم ہوتا ہے کہ اولیاء کو صرف عالم شہادت ہی میں نہیں بلکہ عالم مثال میں بھی تصرف کا اختیار دے دیا جاتا ہے۔ اصل میں ضرورت اس بات کی ہے کہ ہمارے اکابر کی کتابوں میں اس طرح کی جو باتیں موجود ہیں ان کے بارے میں اظہار خیال کیا جائے اور ذہنوں کو مطمئن کیا جائے

لیکن اس کام کو گستاخی شمار کر لیا گیا ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ذہن کی الجھن دور نہیں ہوتی، اور بات وہیں رہتی ہے جہاں پہلے تھی ___ آخر میں تاسف کے ساتھ یہ اظہار کرنا پڑتا ہے کہ اس نمبر میں مولانا مودودیؒ کو بدنام کرنے کی جو سعی کی گئی ہے وہ کوئی مفید کام نہیں ہے۔ مولانا مودودی کو اسلامی تصوف کا مخالف قرار دینا بہتان ہے۔ اس بہتان کو دہرائے چلے جانے کا آخر کیا فائدہ ہے۔ مولانا سندیلوی نے تو مودودی صاحب پر یہ الزام لگانے کے لیے ایک نئی تدبیر اختیار کی ہے اور وہ ہے روایت بالمعنیٰ۔ یہ ایک ایسی تدبیر ہے کہ عبارت میں کتر بیونت کی بھی ضرورت نہیں ہے بلکہ لوگ اس کے پردے میں جو الزام چاہیں لگا سکتے ہیں۔

دسمبر ۶۳ء

مخزنُ الولایۃ

(اُردو ترجمہ)

صفحات ۲۰۸ کتابت، طباعت، کاغذ بہتر، قیمت مجلد تین روپے۔ ناشر: پاک اکیڈمی ۱۳۱/۱ حیدرآباد گولی مار۔ کراچی ۱۸

پاک اکیڈمی جناب محمد ایوب قادری ایم، اے کی رہنمائی میں صوفیہ کرام کے سوانح حیات اور ان کی تصنیفات شائع کر کے مفید خدمت انجام دے رہی ہے۔ زیرِ تبصرہ کتاب شاہ خادم صفی، محمدی صفی پوری، المتوفی ۱۲۸۰ھ کے فارسی ملفوظات کا اُردو ترجمہ ہے۔ یہ ملفوظات جناب منشی ولایت علی عزیز صفی پوری نے مرتب کیے تھے اور اس کا ترجمہ جناب محمد خصلت حسین صابر ڈپٹی انسپکٹر مدارس پنشنر نے کیا ہے۔ جناب مترجم نے ابتدا میں ایک مقدمہ بھی لکھا ہے جس میں خواجہ معین الدین چشتی اجمیری رحمۃ اللہ علیہ، ان کے خلفاء نیز بزرگانِ سلسلہ صفویہ مینائیہ کے مختصر حالات لکھے ہیں۔ اس سے صاحب کتاب حضرت شاہ خادم صفیؒ کے حالات بھی معلوم ہو جاتے ہیں۔ مخزنُ الولایت کی تقریظ اور مقدمہ جو عربی زبان میں لکھا گیا تھا اس کے بارے میں مترجم نے لکھا ہے کہ اس کو علیحدہ ایک کتابی صورت میں شائع کیا جائے گا۔

صوفیہ اپنے ملفوظات میں جو کچھ فرماتے ہیں ان سب سے اتفاق ضروری نہیں ہے اصل معیار تو کتاب و سنت ہے جو کچھ اس کے مطابق ہو لائق اخذ ہے۔ راقم الحروف کو پوری کتاب پڑھنے کی فرصت نہیں ملی اس لیے یہ مختصر تعارف لکھنا پڑا ورنہ تبصرے میں بہت دیر لگتی۔

حجۃ السالکین

دفتر بین الاقوامی روحانی کانفرنس۔ نزد پولیس پوسٹ راج باغ۔ سری نگر، کشمیر سے ۳۲۰ صفحے کی ایک عجیب وغریب کتاب تبصرے کے لیے آئی تھی۔ قیمت درج نہیں ہے۔ کتاب بھیجنے والوں کا اصرار ہے کہ تبصرہ ضرور شائع کیا جائے۔ متعدد لمبے لمبے خطوط آچکے ہیں ان خطوط کی آمد اور اس مصیبت کو ختم کرنے کے لیے یہ چند سطریں لکھی جارہی ہیں۔ اس کتاب اور اس کے مصنف کا پورا نام بلفظہ نقل کر رہا ہوں اسی سے کتاب اور مصنف دونوں کا اندازہ ہو جائے گا۔ " حجۃ السالکین (مجموعہ کشوف والہامات مع پس منظر) مع زینۃ الکشوف جلد اول از سید الاقطاب، خاتم المعراج علامہ ڈاکٹر عزیز احمد قریشی قادری امام الزماں صد چہار دہم۔"

یہ ہے اس کتاب کا نام اور یہ ہیں اس کے مصنف۔ یہ حضرت مرزا غلام احمد قادیانی کو مجدد وقت اور امام الزماں تسلیم کرتے ہیں۔ امام الزماں یہ خود بھی ہیں لیکن ان کا درجہ مرزا صاحب سے اونچا ہے۔ اس کتاب کا کوئی خواب یا کشف، یا الہام یہاں نقل کرنا قلم اور کاغذ کا صحیح مصرف نہ ہوگا۔ راقم الحروف کی رائے یہ ہے کہ اس کتاب کو پڑھنے سے پہلے پوری توجہ کے ساتھ کسی مستند طبی کتاب میں مالیخولیا کا باب ضرور پڑھ لینا چاہیئے اس لیے کہ اس کتاب کے مصنف ڈاکٹر بھی ہیں تب اس کتاب کو سمجھنا شاید کچھ آسان ہو جائے۔

فروری ۱۹۷۵ء

مولانا سید احمد عروج قادری (۱۹۱۱ء - ۱۹۸۶ء) تحریک اسلامی ہند کے ممتاز عالم دین، فقیہ اور صاحب طرز اہل قلم تھے۔ صوبہ بہار کے ضلع اورنگ آباد (بستی اجھر شریف) میں پیدا ہوئے۔

مولانا کا تعلق صوفیاء کے ایک خانوادہ سے تھا اور وہ خاندان ہی کے ایک بزرگ سے بیعت بھی تھے۔ اس لیے وہ اس کوچہ کے نشیب و فراز سے اچھی طرح واقف تھے۔ تصوف پر مولانا مرحوم کی دو کتابیں ان کی حیات ہی میں شائع ہو چکی تھیں۔ ان میں 'اسلامی تصوف' کو بڑی مقبولیت حاصل ہوئی اور اس کے متعدد ایڈیشن اب تک نکل چکے ہیں۔ دوسری کتاب کا عنوان ہے 'تصوف کی تین اہم کتابیں'۔ اس میں سید علی ہجویریؒ کی کشف المحجوب، حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے ملفوظات کے مجموعہ فوائد الفواد اور حضرت مجدد الف ثانیؒ کے شہرۂ آفاق مکتوبات یعنی مکتوبات ربانی کا تعارف اور ان پر نقد و تبصرہ ہے۔ ان دونوں کتابوں کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ تصوف کے غالی عقیدت مندوں میں تھے اور نہ اس کے خلاف ان کے اندر کوئی تعصب پایا جاتا تھا۔ انہوں نے آنکھ بند کر کے نہ تو اس کی حمایت کی ہے اور نہ مخالفت۔ ان کی کوشش تھی کہ تصوف کو کتاب و سنت کی روشنی میں پرکھا جائے اور اس کا جو حصہ صحیح ہے اسے صحیح کہا جائے اور جو حصہ غلط ہے اسے غلط کہا جائے۔ وہ اسلامی اور غیر اسلامی تصوف کے فرق کو اچھی طرح سمجھتے تھے۔

ان دو کتابوں کے علاوہ بھی مولانا مرحوم نے تصوف سے متعلق مختلف اوقات میں مختلف مناسبتوں سے بہت کچھ لکھا ہے۔ **تصوف اور اہل تصوف** کے مضامین ماہنامہ زندگی اور بعض دوسرے رسائل میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ مولانا نے اپنے ایک مقالہ میں اولیاء اللہ کا تفصیلی تعارف کرایا ہے۔ ان کے بارے میں پائے جانے والے غلط تصورات کی تردید کی ہے۔ چند اکابر صوفیاء کے حالات بھی انہوں نے لکھے ہیں۔ صوفیاء کرام کے مکاتیب سے بھی انہیں دلچسپی رہی ہے۔ چنانچہ بعض نامور صوفیاء کے مکاتیب کو انہوں نے اپنے مطالعہ کا موضوع بنایا ہے اور ان سے بہت سی مفید باتیں نکالی ہیں۔ ایک طویل مقالہ میں غیر اسلامی تصوف پر بحث ہے۔ بعض اوقات لوگوں نے اپنے مزعومہ خیالات کی تائید میں تصوف اور صوفیا کو پیش کیا ہے۔ مولانا نے اپنی تحریروں میں اس کا بھی جائزہ لیا ہے۔ موجودہ دور میں تصوف سے متعلق لکھی جانے والی کتابوں پر نقد و تبصرہ بھی وہ مسلسل کرتے رہے ہیں۔ ان کے ہاں اس موضوع پر اور بھی مواد ملتا ہے۔

جو حضرات تعصب اور تحزب سے بلند ہو کر تصوف کے حسن و قبح اور اس کے مضبوط اور کمزور پہلوؤں کو جاننا چاہیں گے، ان شاء اللہ وہ اس مجموعہ کو بہت مفید پائیں گے۔

ISBN 81-7292-091-3